جدید جاپانی افسانے
ترجمہ: شاہد حمید
مشعل

جدید جاپانی افسانے

ترجمہ: شاہد حمید

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

فہرست

MashalBooks.org

پیش لفظ

شووا عہد اور اس کی کہانیاں

شہنشاہ ہیروہیٹو (1901ء تا 1989ء) تریسٹھ سال جاپان کے تخت پر متمکن رہے۔ ایک تو اپنے ''الوہی مرتبے'' (ویسے وہ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر اس مرتبے سے دستبردار ہو گئے تھے) کے پیش نظر وہ عام لوگوں سے گھلتے ملتے نہیں تھے۔ دوسرے وہ فطرتاً بھی کم گو اور کم آمیز انسان تھے۔ تاہم ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ بہت عالم فاضل آدمی تھے۔ (وہ بحری حیات کے ماہر تھے یعنی Marinebiologist تھے اور اپنی پوری زندگی وہ بحری حیات کا مطالعہ کرتے رہے)۔

شہنشاہ ہیروہیٹو نے اپنے طویل عہد حکومت میں اپنی رعایا کی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھیں، وہ معمولی نہیں تھیں۔ آدمی ان پر غوروفکر کرے تو بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ جب انہوں نے دسمبر 1926ء میں اپنے تخت نشین (اس سے پہلے وہ پانچ سال ریجنٹ یا قائم مقام شہنشاہ رہے تھے) ہونے پر اپنی حکومت کو ''شووا'' (روشن خیالی اور امن) کا نام دیا تھا تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آیا ہو گا کہ یہ نام کس قدر

اذیت ناک حد تک ستم ظریفی (IRONY) کا پہلو اپنے دامن میں چھپایا ہوگا۔''بادلوں میں'' بیٹھ کر انہیں ایسی چودہ سالہ جنگ کا مشاہدہ کرنا پڑا جس کے دوران میں آتشیں بموں نے ان کے ملک کے زمینی منظر (Landcape) کو تہس نہس کر دیا۔ دو ایٹم بموں نے دو شہروں کو خاک و خون میں نہلا دیا اور انہیں تقریباً ملیا میٹ کر دیا۔ ان کے آزاد اور علیحدگی پسند وطن پر پہلی بار غیر ملکی فوجوں نے قبضہ کیا اور عہد حاضر میں اسے ایک ایسی شہرت بخشی جو جاپان کے سابق غلط کاموں اور مجرمانہ کارروائیوں اور اس کی موجودہ تکنیکی مہارتوں کے پیش نظر ابھی تک دنیا کے بعض خطوں کے لوگوں کی نگاہوں میں داغدار ہے۔

گزشتہ ساٹھ ستر سال کے دوران میں جاپانیوں کی زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اور ان تبدیلیوں نے جو مختلف سمتیں اختیار کی ہیں ''شوواعہد'' کے ادب میں ان کی تقریباً اتنی ہی صحیح، بھرپور اور رنگ برنگی عکاسی ملتی ہے جس کی ہم توقع کر سکتے ہیں۔ جس امریکی مجموعے سے اس کتاب میں شامل کہانیاں لی گئی ہیں، اس کے ایڈیٹر کی یہ کوشش تھی کہ اس میں بہترین لکھنے والوں کی منتخب کہانیاں یکجا کر دی جائیں۔ (اصل امریکی مجموعہ بہت ضخیم ہے۔ اس میں اکیس کہانی نویسوں کی نگارشات شامل ہیں۔''مشعل'' اتنے بڑے انتخاب کی اشاعت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اردو ترجمے کے لیے فی الحال صرف بارہ کہانیوں پر اکتفا کرنا پڑا) جب امریکی مجموعہ تیار کیا جا رہا تھا تو صاف ظاہر ہوا کہ منتخب شدہ کہانیاں جن حالات اور تجربوں کو بیان کرتی ہیں اور جن تکنیکوں کو استعمال کرتی ہیں، وہ بے حد متنوع ہیں۔ چنانچہ امریکی ایڈیٹر کے ذہن میں خیال آیا کہ اس میں ایسے مصنفین کو بھی جگہ ملنا چاہیے جو مغرب میں ابھی تک غیر معروف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسے متعدد اشخاص کی کہانیاں شامل کیں۔ (طوالت کے خوف سے اس اُردو مجموعے میں زیادہ تر جانے پہچانے لوگوں کی کہانیاں ہی شامل کی جا چکی ہیں)

اردو انتخاب تو ہے ہی بہت مختصر، امریکی ایڈیٹر کے بقول وہ بھی اپنے (ضخیم) مجموعے میں اتنی کہانیاں جمع نہیں کر سکا جن سے پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا کہ جاپانی زندگی کتنی بوقلمونی اور رنگا رنگی کی حامل ہے۔ پھر جاپانی فنکاروں کی کچھ اپنی بھی مجبوری ہے۔ وہ لینڈ سکیپ کو وسیع و عریض دیواری تصویر (Mural) میں یا تو پیش کر ہی نہیں سکتے یا پھر کرنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ اس کی بجائے کوچک تصویریں بنانے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن

اگر ہم ان کو چک تصویروں کو ایک دوسرے کے برابر رکھ دیں اور یوں ہماری نظروں کے سامنے بہت بڑا طومار (Scroll) آ جائے تو ہمیں فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں انسانی زندگی کی جس پیچ در پیچ اور باریک بیں انداز سے عکاسی کی گئی ہے، وہ صحیح معنوں میں بہت متاثر کن ہے۔

بعض نقاد یہ رائے دیتے نہیں تھکتے کہ جدید عہد نے بالآخر جاپان کا اپنی روایتی جڑوں سے رشتہ منقطع کر دیا ہے اور اپنے بین الاقوامی معاصرین کی طرح جاپانی ادیب بھی فنی طور پر اپنی ان جڑوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن جب وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ روایات جو صدیوں سے چلی آ رہی ہوں اور ہڈیوں میں رچ بس چکی ہوں، انہیں آسانی سے ختم نہیں کیا جا سکتا اور امریکی مجموعے کے ایڈیٹر بھی ان نقادوں کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا دعوے کی تائید میں ایبے کوبو اور بعض دوسرے قلمکاروں کی تحریریں تو ضرور پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان کے مجموعے میں شامل اکثر کہانیوں سے یہی تاثر ملتا ہے کہ ہیئت اور مواد دونوں کے اعتبار سے روایت کا تسلسل ابھی تک برقرار ہے۔ جاپان کی مخصوص ادبی صنف ''میں ناول'' (Watakhushi-Shosetsu) جس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے ادب میں نہیں ملتی، بڑی اڑیل قسم کی چیز ہے اور منظر سے اوجھل ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ادبی روایت بہت مضبوط ہے اور ختم نہیں ہوئی۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ادبی روایت بہت مضبوط اور ختم نہیں ہوئی۔ کہنے کو یہ انا یا خود مرکز (Egocentric) ناول نما (Quasi-Novel) اندازِ تحریر ایک واضح صنف کے طور پر بیسویں صدی کے آغاز میں وجود میں آیا لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کے ڈانڈے اندر ہی اندر دسویں صدی کے جاپانی ادب سے جا ملتے ہیں۔ ''میں ناول'' کو زیادہ تر اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ مصنوعی طور پر ضرورت سے زیادہ مرصع ہے، یا یہ کہ یہ سب کچھ بھول بھال کر مصنف کے اپنے کرب و آلام پر زیادہ توجہ دیتا ہے، اپنے گرد و پیش کے افراد کے احساسات اور خیالات سے بہت کم آگہی کا اظہار کرتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کے اعتراضات کو کسی حد تک حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جاپانی قلم کار اسے بالکل ہی طاقِ نسیاں پر رکھنے سے اس لیے متامل ہیں کیونکہ انہیں اس کے ذریعے خود اپنا

اور اپنے ماحول کا جائزہ لینے اور حدود متعین کرنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ ''شوواعہد'' بالخصوص جنگ کے بعد کے زمانے کے مصنفین نے ''میں ناول'' کی حدود کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ آیا اس کے ذریعے انسانی تعلقات کو زیادہ معروضی انداز سے بیان کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور آیا اسے طنز اور مذہبی گیان دھیان کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اپنی ان کوششوں کے ذریعے انہوں نے اپنے پیش رووٴں کی چھوڑی ہوئی بوتلوں میں نئی شراب بھر دی ہے۔ ''ستارے'' اور ''ایک روز پہلے'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

جب ہم اس مجموعے کی پہلی کہانی ''کوچی سوکے کی وادی'' کا موازنہ (مجموعے کی) آخری کہانی ''غیر فانی'' (خواہش کے باوجود ناکا گامی کینجی کی یہ کہانی اردو مجموعے میں شامل نہیں کی جا سکی کیونکہ جنس کے معاملے میں اس میں کچھ زیادہ ہی بے باکی کا مظاہرہ کیا گیا ہے) سے کرتے ہیں تو ''کوچی سوکے کی وادی'' سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جدید تکنیکی ترقی روایتی فطری فضا نیست و نابود کر دے گی اور روایت کی ہر اس نشانی کو مٹا دے گی جس کا تعلق ماضی سے بنتا ہے لیکن ''غیر فانی'' میں فطرت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ عندیہ بھی ملتا ہے کہ جاپان کا نیا قلمکار اپنے کلاسیکی پیش رووٴں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر سکتا ہے۔ لیکن اس تسلسل کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئی ہیں اور یہ تبدیلیاں بڑی متنوع ہیں۔

اگر ''ماہتابی جواہر'' کا انداز Discursive (اس اندازِ تحریر یا تقریر میں ادھر ادھر کی باتیں بہت ہوتی ہیں اور ان کا اصل موضوع سے تعلق محض ڈھیلا ڈھالا سا ہوتا ہے) تو ''ایک بازو'' کو تجرباتی اور ''طلسمی چاک'' کو سائنسی سریلزم قرار دیا جا سکتا ہے۔ بعض کہانیاں خوب صورت شاعری ہیں اور بعض نری فن تازیہ۔ ''شووا عہد'' کے ادب نے کتنے ہی نئے رجحانات پیدا ہوتے اور پھر انہیں معدوم ہوتے دیکھا ہے۔ پرولتاری فکشن اس میں لکھی گئی، جنگی پراپیگنڈے کے ہتھیار کے طور پر اسے استعمال کیا گیا، (امر) قابض فوجوں کا سنسر شپ اسے برداشت کرنا پڑا اور جدیدیت کے دعویدار بے شمار اثرات میں اسے گزرنا پڑا، لیکن یہ سب کچھ سہہ گیا اور آج بھی زندہ و تابندہ ہے، شاید پہلے سے بھی زیادہ۔

''شووا عہد'' کا شاید بہترین اور صحت مند ترین کارنامہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں

باصلاحیت خواتین نے بھی ادب کے میدان میں قدم رکھ دیا ہے حالانکہ اس سے پہلے انہیں اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ویسے اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو خواتین قلم کاروں کو نشانہ تضحیک بنانے سے باز نہیں آتے۔ ایک خاتون کی کہانی اس اردو مجموعے میں بھی شامل ہے۔

قصہ مختصر، اس کتاب میں بیسویں صدی کے جاپان کی جو کہانیاں پیش کی گئی ہیں، تقریباً ہر ذوق کے شخص کو اس میں اپنی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز مل سکتی ہے۔ یہ کہانیاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جاپانی ادب کوئی مردہ چیز نہیں بلکہ زندہ و توانا ہے۔ معاشرے کو جن اچھی یا بری تبدیلیوں میں سے گزرنا پڑا ہے، اس نے ان سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ دیانت داری سے انہیں بیان بھی کیا ہے اور ان کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ توقع یہی کرنا چاہیے کہ تسلسل اور تنوع کے مابین یہ تعامل جاری رہے گا۔ گزشتہ ساٹھ ستر سال کے دوران میں جاپانی قوم کو جن جنگوں، شکستوں اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا ہے، جاپانی افسانہ ان سب سے بچ نکلا ہے اور ''شووا دور'' میں وہ بتدریج ادبی اظہار کی پائیدار اور آفاقی صورت اختیار کر گیا ہے۔

جاپانی ناول کے سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے، مغرب میں پہلے انسان کا اپنا پہلا نام لکھا جاتا ہے، پھر خاندانی نام لیکن جاپان میں پہلے خاندانی نام آتا ہے، پھر اصل نام۔ اس کتاب میں جاپانی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

(اس ابتدائیہ کا بیشتر مواد امریکی مجموعے کے ایڈیٹر وان سی گیسل (Gessel) کے دیباچے سے اخذ کیا گیا ہے۔)

شاہد حمید، لاہور

ابو سے ماسوجی

کوچی سوکے کی وادی

ابو سے ماسوجی (Ibuse Masuji) کی ادبی زندگی تقریباً اتنی ہی طویل ہے جتنی کی بیسویں صدی۔ انہوں نے جاپانی ادب کی بیشتر اصناف اور موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی پہلی کتاب ''کارپ مچھلی'' کہانیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد وہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ 1932ء میں ان کے طویل افسانے نے بہ عنوان ''دریا'' 1937ء میں جدید شاعری کا مجموعہ ''ماسی نظمیں'' 1938ء میں تاریخی کہانیوں کا مجموعہ ''ہلکورے'' 1943ء میں جنگی ڈائریاں بہ عنوان ''مغرب کا بحری سفر'' اور 1956ء میں تباہ شدہ بحری ملاحوں کی داستانیں ''راندہ اسا بورو'' کے نام سے شائع ہوئیں اور انہیں شہرتِ دوام عطا کر گئیں۔ تاہم صحیح معنوں میں جس کتاب نے جاپان میں تہلکہ مچایا اور انہیں مغرب سے بھی روشناس کرایا، وہ ان کا ناول ''سیاہ بارش (1966ء) ہے۔ دنیا کا پہلا ایٹم بم گرائے جانے پر ہیروشیما اور اس کے باشندوں پر جو قیامت گزری تھی اس ناول میں اس کا بیان بڑے دل فگار انداز سے کیا گیا ہے۔ (مشعل کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے)۔

1982ء میں ان کی کتاب ''ادگی تو بو تاریخ'' اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ دراصل ان کی پچاس سالہ یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ٹوکیہ کے عام لوگوں، مصنفین اور ادبی زندگی کا

تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

ابوسے ماسوجی 1886ء میں ہیروشیما کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پرورش اپنے بڑے بھائی اور بہن، والدین اور نانا نانی کی صحبت میں بڑے آرام دہ ماحول میں ہوئی تھی۔ 1917ء میں وہ ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ٹوکیو کی واسیدا یونیورسٹی میں داخل ہوئے لیکن ان کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ ہمہ وقتی تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے۔ ان کی ابتدائی کتابوں میں اپنے زمانے کے ادبی رجحانات کی اتنی عکاسی نہیں ہوتی جتنی اس بات کی کہ وہ ایک ایسے نوجوان ہیں جو انسان اور ادیب کی حیثیت سے اپنا تشخص منوانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ شہر اور گاؤں، دوست اور اجنبی، اپنی ذات اور دوسروں کے مابین جو غیر اطمینان بخش تعلق موجود ہوتا ہے، 1920ء کی دہائی کے ابو سے ماسوجی، دل کش پیرایہ بیان، ظرافت اور حساس لہجے سے کام لے کر اس کا خوبصورت لفظی نقشہ کھینچتے نظر آتے ہیں۔

1929ء کے آتے آتے، جب ان کی کہانی ''کوچی سوکے کی وادی'' ٹوکیو کے ایک ادبی رسالے میں شائع ہوئی، ابوسے ماسوجی جان چکے تھے کہ انہیں کیا اور کیسے کہنا ہے چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی یہ کہانی ان کے ابتدائی دور کی غالباً بہترین کہانی ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سیکھ چکے ہیں کہ زبان کو صحیح انداز سے کیسے پیش کیا جاتا ہے اور اپنا نقطہ نظر کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے آپس میں گھل مل جانے سے داستان طراز، کہانی سنانے والے ایک ایسے شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے جس کی اپنی واضح شخصیت ہے اور جو کسی طور بھی دوسروں کا دست نگر نہیں۔ پھر اس میں مرکزی کردار کو اتنی مہارت، پرکاری اور خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ وہ ہمیں واقعی جیتا جاگتا انسان نظر آنے لگتا ہے اور ہم فوراً ایمان لے آتے ہیں کہ ایسا شخص لازماً کہیں نہ کہیں موجود ہو گا۔ اس قسم کے بے غرض، بے تعصب اور غیر جانبدار کہانی سنانے والے اور اپنی بات پر اڑے رہنے والے بوڑھے، ابوسے ماسوجی کے بعد کے ناولوں اور کہانیوں میں کثرت سے آتے ہیں۔ ایک طرف کوچی سوکے دقیانوسی طور طریقے ہیں اور دوسری طرف اس کے نوجوان دوست کا ان کے متعلق اپنا تناظر، دونوں نے کہانی کی ظرافت، شرمیلی جنسی محبت بلکہ اس کے ڈھکے چھپے متشددانہ رجحانات کے ساتھ مل کر ''کوچی سوکے کی وادی'' کو ان چیزوں کا موقع بنا دیا ہے جنھوں نے ماسوجی کو جاپان کے جدید جانے مانے ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

ستتر سالہ کوچی سو کے مجھ سے خاص طور پر انس رکھتا ہے۔ ہر سال جب خزاں کا موسم آتا ہے اور فضا میں آدمی کی سانس سپید ہونے لگتی ہے، میں گھر سے خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، وہ مجھے چیڑ کے درختوں کے بیچ اگنے والی کھمبیوں کا تحفہ ضرور بھیجتا ہے۔ وہ سویوں کے استعمال شدہ ڈبے میں کائی رکھتا ہے، اسے خشک کھمبیوں کے ٹکڑوں سے بھرتا ہے اور ڈبے کے اوپر ''خزاں مبارک'' کے الفاظ تحریر کر دیتا ہے۔

کوچی سو کے اس پہاڑی پر محافظ کے فرائض سرانجام دیتا ہے جہاں یہ کھمبیاں اگتی ہیں، اگرچہ ہم نے یہ پہاڑی اپنے دادا کے وقتوں میں کسی اور خاندان کے ہاتھ بیچ دی تھی، کوچی سو کے بڑی ہٹ دھرمی سے وہی کام کئے جا رہا ہے جو وہ پرانے وقتوں میں کیا کرتا تھا۔

پیشتر اس کے کہ میں بھول جاؤں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ کوچی سو کے اور میں دوست کیسے بنے۔

میرا بھائی، میں اور میری چھوٹی بہن ایک ہی بچہ گاڑی میں پلے بڑھے تھے۔ کوچی سو کے معاش کے سلسلے میں ہوائی جزائر چلا گیا تھا۔ واپسی پر وہ اس بچہ گاڑی کو اپنے ساتھ لایا تھا اور اس نے اسے میرے گھر والوں کو بطور تحفہ پیش کر دیا تھا۔ وہ ہمارے گھر میں ملازم تھا اور دوسرے فرائض کے علاوہ اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جب کبھی ہم بچہ گاڑی میں بٹھائے جائیں، وہ ہماری نگرانی کرتا رہے۔

گاڑی کی چھت پر کسی غیر ملکی زبان میں چار مصرعوں پر مشتمل ایک نظم سوئی دھاگے سے منقوش تھی۔ ''سو جاؤ، سو جاؤ، ننھے منے سو جاؤ۔ شام کا سورج، چھپ رہا ہے کہیں دور مغرب میں۔'' چونکہ مجھے گاڑی میں اونگھ تک نہیں آتی تھی، مجھے اس نظم کی رتی برابر پروا نہیں ہوتی تھی۔

کوچی سو کے مجھے بچہ گاڑی میں بٹھاتا اور سارا دن باغ کے اندر درختوں کے جھنڈ میں ادھر ادھر گھماتے ہوئے گزار دیتا۔ اس گھماؤ پھراؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوزمین تھس (Osmanthus) کے خوشبودار درختوں کے نیچے تالاب کے ارد گرد اتنی گہری پگڈنڈی بن

گئی کہ بارش بھی اس کے آثار مٹانے میں ناکام رہتی۔ ایک تو اس کی آنکھ میں گوہانجنی تھی جس کے سبب وہ چیونٹی کی رفتار سے چلنے پر مائل رہتا تھا۔ پھر اس میں ایک اور بدعادت تھی جس پر مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ ہوتا یہ کہ وہ چلتے چلتے بالکل ہی رک جاتا اور ازسرنو اپنا پٹکا باندھنے لگتا۔ ادھر میرا جی یہ چاہتا رہتا کہ بچہ گاڑی مسلسل گردش میں رہے اور کبھی رکنے نہ پائے۔ چنانچہ جب کبھی وہ چلتے چلتے ٹھہر جاتا، میں اس سے شکایتی انداز سے کہتا:

''کوچی سوکے! جلدی کرو اور گاڑی دھکیلو!''

''ابھی تو میں اپنا پٹکا ٹھیک کر رہا ہوں۔ مجھ سے اس طرح بات مت کرو۔''

''بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ تمہارے پٹکے کی پروا کسے ہے؟''

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن سچ یہی ہے۔ چونکہ میں اس سے جلدی کرانا چاہتا تھا، اس لیے وہ اپنی ضد پر آجاتا۔ وہ اور بھی سستی دکھانے اور اپنا پٹکار بار بار درست کرنے لگتا حالانکہ وہ اسے عام طور پر ڈھیلا ڈھالا پہنتا تھا۔

بچہ گاڑی میں چادر کے نیچے گدی رکھی ہوتی تھی۔ اس پر سیاہ چمگادڑوں کے نقوش بنے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اندھیرے میں یہ چمگادڑیں گدی سے بھاگ نکلتی ہوں گی اور آسمان کی جانب پرواز کر جاتی ہوں گی۔

''کوچی سوکے! چمگادڑیں پھر اڑانا چاہتی ہیں۔ جلدی کرو اور انہیں قابو کر لو!''

''اگر تم چپ رہو تو وہ صبح کو واپس آجائیں گی۔ فکر مت کرو۔''

''وہ واپس آجائیں گی؟ واقعی؟''

''بالکل، چلو چھوڑو اس بات کو، ہم ایک اور چکر لگا لیتے ہیں۔''

''جب میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم آگے نہیں، پیچھے جا رہے ہیں۔ تم میرے ساتھ بیٹھ کر خود کیوں نہیں دیکھ لیتے؟''

''بالکل نہیں۔ میں بعد میں اکیلا ہی بیٹھ کر دیکھوں گا۔''

بعض اوقات گاڑی دھکیلتے دھکیلتے کوچی سوکے مجھے غیر ملکی الفاظ سکھانے کی کوشش کرتا۔

''اوز مین تھس اور چیٹر جیسی چیزوں کو ''Tree'' کہتے ہیں۔''

میں لفظ ''Tree'' ہمیشہ بہت جلد بھول جاتا اور ہر مرتبہ کوچی سوکے مجھے خوب

ڈانٹتا۔

''جس بچے کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی، وہ ''aizuru'' ہوتا ہے۔''

انگریزی زبان کا اصل لفظ ''Idle'' تھا لیکن وہ اس تلفظ ''aizuru'' کرتا تھا۔
پھر ایک دن آیا جب میں نے بچہ گاڑی اپنی چھوٹی بہن کے حوالے کر دی۔ اس وقت میں پہلی جماعت میں داخل ہو چکا تھا اور یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ میں اتوار کے اتوار کوچی سو کے گھر جایا کروں اور اس سے انگریزی پڑھا کروں۔ اس کا گھر وادی میں اکیلا کھڑا تھا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس نے ہوائی جزائر میں کھیتی باڑی کرنا نہیں سیکھا تھا اور چونکہ اسے کوئی اور کام بھی کرنا نہیں آتا تھا، وہ پہاڑی کے نگران کا فریضہ سر انجام دینے لگا۔ تاہم بحیثیت استاد وہ میرے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ وہ ہمیشہ رسمی جاپانی لہنگے میں ملبوس رہتا تھا جو میرے دادا نے اسے دیا تھا لیکن یہ اتنا لمبا تھا کہ جب وہ ڈیسک سے اٹھتا تو یہ فرش پر اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا رہتا۔ وہ اپنا جسم اکڑا کر بیٹھتا تھا اور مجھے کسی انگریزی قاعدے کا حصہ سوم پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی بلکہ ایک مرتبہ بھی، اس کے متن کو سرسری نگاہوں سے دیکھنے کی اجازت نہ دی۔ اس کے برعکس میں اپنے روایتی کیمونو میں ملبوس اپنی گود پر ہاتھ باندھے بیٹھا رہتا تھا اور جو جملے وہ پڑھتا، انہیں زبانی یاد رکھنے کی کوشش کرتا رہتا۔

"The night was very dark. The general, leading the desperate men, boarded the boat. The Willow branches on the shore brushed against the general,s shoulders and wet them with dew. The sound of the oars was very faint. The general surveyed the dark river nad began quietly humming to himself. He hardly looked like a man who was going off to battle."

جب کوچی سو کے پڑھ چکتا تو میں دہرانے لگتا:

"The night was very dark.
The general boarded the boat"

"The general, leading his desperate?
Leading his desperate men,"
Leading his desperate men.

یوں بالآخر کوچی سو کے میری تمام غلطیاں درست کر دیتا۔

جب سبق ختم ہو جاتا اور میرے گھر جانے کا وقت آ جاتا، کوچی سو کے ہمیشہ کی طرح مجھے انتباہ کرنے لگتا: ''دیکھو' جب پل پار کرو، نیچے دریا میں جھانکنے کے لیے کہیں مت رکنا۔''

وہ دراصل وادی کی ندی کے ایک ایسے حصے کے متعلق مجھے متنبہ کرتا رہتا تھا جہاں اس کا صاف شفاف پانی لہراتے بل کھاتے بھنور کی شکل میں اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اس کے اوپر ریشم کے تناور درختوں کی شاخیں تنی ہوئی تھیں اور وہ بڑی دریا دلی سے اپنے زردی مائل گلابی پھول نیچے لہروں پر نچھاور کرتے رہتے تھے۔ بھنور میں مدور چکر کاٹتے کاٹتے یہ رنگین پھول سطح آب پر یوں دائرے بنانے لگتے جیسے کسی مصور نے اپنے سرخ موقلم سے انہیں تراشا ہو لیکن یہ دائرے دیر پا نہ ہوتے، کچھ ہی دیر میں سطح کے نیچے گم ہو جاتے۔

میری یہ یادیں اب بیس سال سے زیادہ پرانی ہو چکی ہیں۔ آج کل میں ٹوکیو میں رہتا ہوں جہاں میں لکھاری بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ کوچی سو کے اکثر مجھ سے پوچھتا رہتا ہے کہ میں نے کون سا پیشہ منتخب کیا ہے لیکن میں ابھی تک اسے سیدھے سبھاؤ نہیں بتا سکا کیونکہ مجھے یقین ہے وہ ادب کا نام سن کر بالکل خوش نہیں ہو گا۔

میں جب کبھی اپنے گھر والوں سے ملنے گاؤں جاتا ہوں، وہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اور چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھنے لگتا ہے کہ میں کیا کام کرتا ہوں۔ میں سیدھا جواب دینے سے گریز کرتا ہوں اور اسے اپنے ذہن میں یہ غلط تاثر بٹھا لینے دیتا ہوں کہ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں اور بعض اوقات سے گمان گزرنے لگتا ہے کہ میں انجینئر ہوں۔ جیسے ڈاکٹر یا انجینئر اسی نے مجھے بنایا ہو۔

کوچی سو کے مجھ میں جو اتنی دلچسپی لیتا ہے، اس پر میرا اس کا مذاق اڑانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ آخر میں اس کا اکلوتا شاگرد ہوں۔ بیس برس قبل جب وہ مجھے انگریزی باقاعدہ پورے کا پورا سنا چکا، اس نے نگاہیں اوپر اٹھائی تھیں اور مجھ سے کہا تھا: ''اگر تم

زندگی میں کامیاب نہ ہوئے تو تم سے زیادہ مجھے دکھ ہوگا۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواب میں کیا کہوں۔ میں صرف یہ فیصلہ کر پایا کہ اب اس سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے جب قدم باہر نکالا مجھے صرف اتنا نظر آیا کہ کمرے کے اندر میری موجودگی کے دوران میں جو برف باری ہوئی تھی، وہ وادی اور پہاڑی کی چوٹیوں کو ڈھانپ چکی ہے۔

مجھے خوب اچھی طرح معلوم تھا اگر میں نے اس کے تازہ ترین مفروضے کی کہ میں ٹوکیو میں وکالت کا دھندا کر رہا ہوں، تصحیح کر دی، تو اسے سخت مایوسی ہو گی اور وہ غم سے نڈھال ہو جائے گا۔

''تم سے زیادہ مجھے دکھ ہوگا۔'' میری تردید پر اگر وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیتا اور وہیں انتقال کر جاتا تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوتی۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس غلط فہمی کا جوں کا توں برقرار رکھتا اور جھوٹ موٹ ظاہر کرتا رہتا کہ میں نوجوان وکیل ہوں۔

میں ایک لڑکی کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا۔ اس کا نام تائتو تھا۔ دراصل جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی، میں اس کے بارے میں کوئی خاص نہیں جانتا تھا۔ زیادہ تر باتیں مجھے تب معلوم ہوئیں جب ہمیں مل بیٹھنے کا موقع میسر آیا۔ تاہم اس کا ماضی کیا تھا، اس کے متعلق آپ کو اس خط سے کچھ نہ کچھ آگاہی ہو سکتی ہے۔ جو اس نے مجھے بھیجا تھا۔ میں اس کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:

''مجھے امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ میرے نانا ابوکوچی سو کے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ سال سے یہاں تعمیر کا کام بلاناغہ جاری ہے۔ عنقریب بند مکمل ہو جائے گا۔ یہ بے حد لمبی چوڑی دیوار ہے۔ یہ وادی کا ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک کا رابطہ منقطع کر دے گی اور پانچ میل سے زیادہ محیط رقبے پر جھیل بنا دے گی۔ اس جھیل کے لئے جگہ بنانے کی وجہ سے ہمیں اپنا گھر خالی کرنا ہو گا۔ اس منصوبے کی منظوری مرکزی حکومت نے دی تھی اور ہم یہاں سے نکلنے سے انکار نہیں کر سکتے، تاہم نانا ابو نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر تعاون کرنے سے گریزاں ہیں۔ جب جھیل مکمل ہو جائے

گی اور پانی سے بھر جائے گی تو ہمارا گھر اس کے عمیق ترین حصے میں ڈوب جائے گا۔ نانا ابو نے مجھے بتایا تھا کہ آپ وکیل ہیں اور میں نے سوچا اگر میں آپ سے مداخلت کی درخواست کروں، تو شاید انہیں یہ جگہ چھوڑنے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ براہ کرم نانا ابو کو خط لکھیں اور انہیں سمجھائیں۔ پچھلے دنوں ہمارا پارلیمنٹ کا مقامی ممبر آیا تھا اور اس نے نانا ابو سے کہا تھا کہ وہ گھر خالی کر دیں اور دوسروں کے لئے خواہ مخواہ مصیبت کا باعث نہ بنیں۔ وہ کہتا تھا کہ آئندہ انتخابات میں یہ اس کے لیے وقار کا مسئلہ بن جائے گا۔ نانا ابو نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ ممبر نے جھیل کا منصوبہ بنوایا ہی اس لیے تھا کہ وہ لوگوں کے ووٹ خرید سکے۔ جب پچھلی مرتبہ انتخابات ہوئے تھے، اسی سیاست دان نے سرخ اور سفید دھاریوں والے کھمبوں کے ساتھ مساحت کار (Surveyers) بھیجے تھے اور وہ اپنی تقریریں میں اعلان کرتا پھرتا تھا کہ وہ یہاں ریلوے لائن تعمیر کرائے گا لیکن ابھی تک اس کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ نانا ابو اب اس کے متعلق لوگوں سے شکوے کرتے اور انہیں سان پر چڑھاتے رہتے ہیں۔ مجھے فکر ہے اگر وہ یونہی بلاوجہ اس قسم کی باتیں کرتے رہے تو لوگ ہم سے نفرت کرنے لگیں گے۔

مجھے اپنے بارے میں آپ کو کچھ نہ کچھ بتا دینا چاہیے۔ میرا نام تائتو ہے اور کوئی دو سال ہوئے میں ہوائی سے نانا ابو کے ہاں چلی آئی تھی۔ میرے نانا نانی دونوں جاپانی ہیں لیکن میری امی نے ایک امریکی سے نکاح کر لیا تھا۔ چند سال پیشتر میرے ابا پیشگی اطلاع دیئے بغیر مجھے اور امی کو چھوڑ کر امریکہ چلے گئے تھے۔ چہرے مہرے سے میں شاید امریکی نظر آتی ہوں لیکن درحقیقت میں جاپانی ہوں۔ میری امی پچھلے سے پچھلے سال کے دسمبر میں مجھے یہاں لے آئی تھیں۔ اس وقت یہاں کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ وادی ویران اور درخت ننگے بچے نظر آ رہے تھے، اور مجھے نزلے اور تنہائی کی اذیت برداشت کرنا پڑی۔ امی کو جاپانی تصور کیا جاتا تھا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح کچھ روپیہ بچا لیا اور بہت جلد اپنے لیے نیا شوہر تلاش کر لیا۔ تاہم صرف دو ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ شاید آب و ہوا کی تبدیلی راس نہیں آئی تھی لیکن انہوں نے میری تربیت بطور جاپانی کی تھی اور میں یہاں ان کے ساتھ اپنی مرضی سے آئی تھی۔ جاپان ہوائی کی نسبت بہتر جگہ ہے۔ جاپان میرے آباؤ اجداد کی دھرتی ہے۔ میرے طور طریقے اور احساسات جاپانیوں کے ہیں اور اب میں اس

وادی میں بڑے اطمینان کی زندگی گزار رہی ہوں۔

اس خط نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ''تو کوچی سوکے، کے کندھوں پر غیر ملکی اور بسیار گونوا یکی غیر متوقع ذمہ داری آن پڑی ہے۔ مجھے تصور میں نظر آ رہا تھا کہ اس کی مسلسل اور بے تکان بک بک سے تنگ آ کر وہ پناہ ڈھونڈنے جنگل میں چلا جاتا ہوگا۔ وہاں وہ کرتا کراتا تو کچھ نہیں ہوگا، بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہوگا۔ اس نے تائتویا جھیل کے بارے میں مجھے ایک لفظ تک کیوں نہیں لکھا تھا؟ مجھے بلاتاخیر اس کے پاس جانا اور اس کے حقوق کا دفاع کرنا ہوگا اور اگر صورتِ حال نے تقاضا کیا تو میں اس کا مقدمہ لے کر صوبائی حکومت کے پاس جانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔

میں کوچی سوکے وادی کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاندنی رات میں گہری وادی میں پیدل چلنا خوشگوار تجربہ ثابت ہوسکتا ہے۔ بند کی تعمیر کے لیے سڑک چوڑی کی جا چکی تھی اور ٹرکوں کی آمدورفت نے اس میں جگہ جگہ گہرے کھڈ بنا دیئے تھے۔ چیڑ کے درختوں کے موٹے تنے روشن سڑک پر اپنے تاریک سائے ڈال رہے تھے۔ میں کسی گہری تلیا کے پانی میں چاند کے کج مج عکس کو دیکھنے اور اپنی چھڑی کے ساتھ بیلوں پر پھولوں کو جھٹکنے کے لیے بار بار رک جاتا تھا۔ تاہم میری خوشگوار مٹرگشت غیر متوقع طور پر مختصر ثابت ہوئی کیونکہ ایکا ایکی کسی قلعے کی فصیل کی طرح بلند و بالا سنگی دیوار آ گئی تھی۔ اسے پہاڑیوں کے مابین، جن میں وادی محصور تھی، خلا کو پر کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سے میں نے بند کی بنیاد تک فاصلے کا اندازہ لگایا۔ اس کی چوٹی تک اپنی نظر کے زاویے کا تعین کیا اور یوں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی بلندی تین سو فٹ سے زیادہ ہوگی۔ چنانچہ یہ دیوار جو جھیل بنائے گی، وہ کوچی سوکے کے مکان کو یقیناً گہرے پانی میں غرق کر دے گی۔ میں اس میں سے گزرنے کے لیے کسی شگاف کی تلاش میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ آخر مجھے نکاسی آب کا گیٹ مل ہی گیا لیکن اس میں سے پانی بڑی تیز رفتار سے نکل رہا تھا اور بھیانک شوروغل مچاتا ہوا آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ جہاں یہ پانی گر رہا تھا وہاں گہرا تالاب بن چکا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جونہی تعمیر مکمل ہوگی، یہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ پھر بھی یہیں کہیں وہ شگاف بھی لازماً ہوگا جس میں سے فالتو پانی کا اخراج ہوگا۔ میں اس کو تلاش کرتا رہا۔ بالآخر یہ

مجھے مل ہی گیا لیکن یہ سنگی دیوار میں نہیں تھا بلکہ مجھے چٹانی پہاڑی میں سرنگ نظر آئی۔ روشنی کے لئے دیا سلائی کی تیلیاں جلاتا میں اس کے اندر داخل ہو گیا۔ سرنگ ریلوے کے کسی انڈر پاس جتنی بلند اور فراخ تھی۔ اس میں معتدل بادِ نسیم چل رہی تھی۔ اس کی چھت پہاڑی کے دبیز ترین حصے میں تراش کر محراب کی شکل بنائی گئی تھی اور اس سے پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ سرنگ کے اندر چھوٹے موٹے سوراخوں میں چمگادڑوں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ جب میں سرنگ سے باہر نکلا، مجھے کوچی سوکے کے مکان کی کھڑکیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس کی لالٹینیں جل رہی تھیں اور ایک خوبانی کے درخت کو نیم روشن بنا رہی تھیں۔ ڈرامائی ملاقات سے بچنے کے لیے میں اسے دور ہی سے آوازیں دینے لگا:

''کوچی سوکے! جاگ رہے ہو؟''

اگلی صبح گائے کے ڈکرانے اور درانتی کے تیز کئے جانے کی آوازوں نے جگا دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے تکیے کی جانب دیوار پر ایک چھوٹی سی صلیب، جس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی، نظر آئی۔ میں نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔

کوچی سوکے میری کھڑکی کے باہر ایندھن کی لکڑیاں کاٹنے لگا۔ پھر اس نے پردہ ذرا سا کھسکایا اور کہنے لگا: ''یہاں جو اتنا شوروغل ہو رہا ہے، اس میں تو تم شاید ایک منٹ بھی نہیں سو سکو گے۔''

میں نے جواب دیا: ''شوروغل اتنا اونچا نہیں اگر ہوتا بھی تو میرے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔''

لکڑیوں کے چٹخنے اور پھٹنے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ اب ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی شخص درخت کی شاخوں کو زور زور سے جھنجھوڑ رہا ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کے چلنے سے پتوں میں سرسراہٹ ہو رہی ہو۔ کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ مجھے بے شمار خوبانیوں کے زمین پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں بستر سے اٹھا اور چلا کر بولا:

''کوچی سوکے! اس طرح تو سارے کچے پھل بھی زمین پر گر پڑیں گے۔''

''کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو ابھی اور بھی گرانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ دوبارہ شاخوں کو جھٹکے دینے لگا۔ جب میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو میں نے دیکھا کہ وہ خوبانی کے درخت پر چڑھ چکا ہے اور ایک تنے پر بیٹھا اپنے وزن سے

آگے پیچھے جھلا رہا ہے۔ اس کا ایک جھٹکا تو اتنا زور دار تھا کہ یوں نظر آنے لگا جیسے درخت درد میں مبتلا ہو گیا ہو۔ درخت کے نیچے زمین کچھ اس طرح دکھائی دے رہی تھی جیسے جھاڑو پھیر کر اس کی صفائی کر دی گئی ہو لیکن اوپر سے جو پھل اور پتے گر رہے تھے، وہ اس پر تازہ کوٹے کی تہہ جما رہے تھے۔ کٹی پھٹی خوبانیوں کی خوشبو، جو ادھر ادھر تیر رہی تھی، صبح کی فضا کو کسیلا بنا رہی تھی۔

میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ وادی کے اس حصے میں، جسے جھیل کی تہہ بننا تھا، بند کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور دھرتی سرخ مٹی کی بے ضرر ڈھلوان میں تبدیل ہو چکی تھی۔

ابھی تک ایک خوبانی درخت کی چوٹی پر لٹک رہی تھی۔ کوچی سو کے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور اسے گرانے کے لیے شاخوں کو پوری قوت کے ساتھ جھٹکے دینے لگا۔ صبح کے سورج کی کرنیں پتوں میں سے چھن چھن کر گزرتی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اسے سبز روشنی میں نہلا رہی تھیں۔ شبنم کے قطرے گرتے اور اس کی جلد پر چپک جاتے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ درخت کو اتنے متشددانہ انداز سے جھٹکے نہ دے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اسے مزید قوت سے جھلانے لگا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: ''تم مجھے مشورہ دے رہ ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤ۔ٹھیک؟ تو مجھے یہاں سے نکلنا ہی ہو گا۔ واقعی؟ خیر، کل رات تم جو بک بک کرتے رہے اور مجھے سمجھاتے رہے، مجھے اس پر عمل کرنا ہی ہو گا۔ میں نے مزید جدوجہد کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''

وہ درخت پر مزید اوپر چڑھ گیا اور ایک نسبتاً چھوٹے ٹہنے کو جھلانے لگا۔ ''لیکن میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم ہر متعلقہ شخص سے بات کرو اور میرے یہاں ٹھہرنے کے حق کا دفاع کرو۔ مجھے یقین نہیں کہ مجھے تمہاری بے پر کی تقریر سننے کا پھر کبھی کوئی موقع ملے گا۔''

میں نے اسے بتایا اگر وہ واقعی کہیں اور گھر بسانے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر اس کے حق میں میری طرف سے دلائل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوچی سو کے مجھے بتا چکا تھا کہ جو لوگ بند کی تعمیر کر رہے تھے، وہ اس کے لیے چھوٹا موٹا گھر بنانے بلکہ اسے نکاسی آب کے دروازے کی نگہبانی کا فریقہ سونپنے کا بھی وعدہ کر چکے ہیں۔ اسے اپنی خدمات

کے معاوضے میں ماہوار تنخواہ ملنے کی بھی توقع تھی۔ میں اس کا ارادہ تبدیل کرانے کے لیے ٹوکیو سے آ تو گیا تھا لیکن اسے دینے دلانے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

جب سورج کی کرنیں پہاڑی کی چوٹیوں پر پہنچیں تو تائتو ہٹی کٹی گائے ہانکتی گھر پہنچ گئی۔ اس نے کینوس کے جوتے اور اونچے کالروں کا ڈھیلا ڈھالا سبز کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پرکشش غیر ملکی دوشیزہ تھی۔ اس کی گائے کی پیٹھ پر لمبی سبز گھاس کے چار گٹھے لدے ہوئے تھے۔ جسامت کے اعتبار سے گائے تائتو سے چھ گناہ بڑی تھی لیکن وہ اس کے اشاروں پر عمل کر رہی تھی۔ جب گھاس کے گٹھے اتارے جا چکے تو وہ اپنے باڑے میں چلی گئی۔ تائتو نے اسے جانے کا اشارہ اپنی زبان کو تین مرتبہ ٹکٹکا کر دیا تھا۔ جب میں اپنے زیر جامے پر، جو پاجامے کا بھی کام دیتا تھا، پتلون پہن چکا تو میں عقب سے دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

میرے گزشتہ رات پہنچنے سے پہلے ہی وہ بستر پر لیٹ چکی تھی اور میرا اس کے ساتھ تعارف نہیں ہو سکا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو اپنا مہین سوتی شبینہ گاؤن پہنے اس نے تیزی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ سو چکی ہو۔ اس سے مجھے کوچی سوکے کے ساتھ مدھم آواز میں باتیں کرنے کے دوران میں اس کی سوئی ہوئی شکل کو بلا جھجک دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کے چھوٹے بالوں کی تراش خراش میں کسی بیوٹی پارلر کی کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ ان کے سادہ تہہ دار خطوط سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ انہیں قینچی سے خود ہی کاٹا چھانٹا گیا ہے۔ اس کا شبینہ گاؤن اس کے نوجوان شانوں کی گولائی منکشف کر رہا تھا اور ایک اونچے فٹ سٹول پر رکھے چراغ کی روشنی میں اس کی بھری بھری چھاتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک غیر مجلد کتاب، جو اس نے بے دھیانی سے ایک طرف پھینک دی تھی، اس کے نیلی دھاریوں والے تکیے کے قریب پڑی تھی۔ دیوار پر صلیب، جس پر مسیح کی تصویر کندہ تھی اور جسے میں نے اگلی صبح آنکھیں کھلنے پر اپنے بستر کے قریب پایا تھا، لٹک رہی تھی۔ شاید اسے کوچی سوکے نے میرے کمرے کی تزئین کی خاطر بغیر پوچھے رات کو کسی وقت وہاں پہنچا دیا ہوگا۔

تائتو زمین پر گرے پھل اکٹھے کر رہی تھی۔ چونکہ وہ ایک وقت میں اپنے ہاتھ میں چار سے زیادہ نہیں پکڑ پا رہی تھی، اس لیے اس نے اپنے بلاؤز کے سامنے کا دامن

اٹھایا، اسے جھولی بنایا اور پھلوں کو اس میں رکھنے لگی۔ پھر وہ خوبانیوں سے لدی پھندی میرے پاس آئی اور اس نے بے عیب جاپانی میں مجھے بتایا کہ اس نے پچھلے سال خوبانیاں دھوئے بغیر کھا لی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس کی جھولی سے ایک خوبانی اٹھائی اور دانتوں سے اس کے ٹکڑے کاٹ کر آہستہ آہستہ کھانے لگا۔ کوچی سو کے پہلے ہی گائے کے ساتھ پہاڑی کی طرف جا چکا ہے۔

تائتو چپ چاپ میرے پاس کھڑی رہی۔ اگر میں رومانی طبیعت کا مالک ہوتا تو مجھے اس کے اوپر کو اٹھے ہوئے بلاؤز میں زیادہ دلچسپی ہوتی لیکن میں اس وصف سے تہی دامن ہوں۔ میں جھوٹ موٹ ظاہر کرنے لگا کہ میں خوبانی کھانے میں پوری طرح منہمک ہوں لیکن ایسی آواز میں، جس میں اس شخص کی آواز سے کم تناؤ نہیں تھا، جو کسی دوشیزہ کو بہلانا پھسلانا چاہتا ہے، اس سے کہنے لگا: ''تم بھی ایک آدھ لے لو۔ پکی مزیدار ہیں۔ ترش تو ضرور ہیں لیکن مزیدار ہیں۔''

اس کی اشتہار کو بڑھانے کی کوشش میں میں نے جان بوجھ کر ایک نسبتاً سبز خوبانی پر بھی دانت مار دیئے اور اسے اپنے گالوں کے اندر کھینچے ہوئے اس کا رس منہ سے باہر ٹپکنے دیا جیسے یہ واقعی ترش ہو۔ وہ جھانسے میں آ گئی۔

''شکریہ۔'' اس نے خورد ترین اور سبز ترین خوبانی کو اٹھاتے اور اسے قدرے شرماتے شرماتے دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''اچھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔''ہاں''

تب ہم دونوں کو بلند ترین پہاڑی کی چوٹی پر چھ سات آدمیوں کا گروہ نظر آیا۔ وہ ایک عظیم الجثہ چٹان کی طرف، جسے بارشوں نے گھسا گھسا کر ہموار اور مدور بنا دیا تھا اور جو چوٹی کی سرخ مٹی کے اوپر سیاہ پھوڑے کی طرح نظر آ رہی تھی، اشارے کر رہے تھے اور چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔

''میں شرط لگانے کو تیار ہوں وہ اس چٹان کو توڑنا چاہتے ہیں۔''

میری قیاس آرائی درست نکلی۔ ایک اور شخص چٹان کے سائے سے برآمد ہوا اور پوری رفتار کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگنے لگا۔

عین اس وقت جب وہ اپنے رفقائے کار کو بتا رہا تھا فتیلوں کو آگ لگائی جا چکی ہے، یکے بعد دیگرے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دھماکوں کی آواز ناقابل یقین حد تک اونچی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوری وادی کو زیادہ نہیں تو چند انچ ضروری اپنی جگہ سے کھسکا دیں گے۔ ہوا کے دباؤ میں جو زبردست تبدیلی آئی تھی، وہ مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگی۔ میں یہ دیکھ کر مزید حیران ہوا کہ مدور چٹان دو مساوی حصوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ یہ دونوں حصے بہت جلد اپنا توازن کھو بیٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے وادی کی جانب لڑھکنے لگے۔ جو ٹکڑا پیچھے تھا، دونوں کے رفتار پکڑنے پر کھسکتا کھسکتا آگے نکل آیا۔

''دیکھیں، جو ٹکڑا پیچھے رہ گیا تھا، معلوم ہوتا ہے دوبارہ آگے آگیا ہے۔'' تائتو نے بے اختیار کہا۔ پیچھے آنے والا ٹکڑا بھیانک شور کے ساتھ دوسرے سے ٹکرایا اور پوری رفتار سے لڑھکتا آگے نکل آیا۔ جو ٹکڑا پیچھے رہ گیا تھا، وہ مختلف راستے پر چل پڑا۔ دونوں نے کڑکڑاتی اور تھپتھپاتی آوازوں سے ڈھلوان پہاڑی کے گھنے جنگل کو تہس نہس کر دیا۔ چٹان کے دونوں ٹکڑے بیک وقت وادی کی تہہ کی سرخ مٹی تک پہنچے، ایک کسی والز (Waltz) رقاص کے انداز میں لٹو کی طرح گھومتا اور بل کھاتا اپنے پہلو کے بل دھول میں آگرا۔ دوسرے کا نیچے گرنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے اس نے خلا سے سیدھے نیچے چھلانگ لگائی ہو۔

چٹان کے دونوں ٹکڑے لڑھکتے جہاں جہاں سے گزرے تھے، وہاں جنگل کا صفایا ہو گیا تھا۔ ان کے عقب میں دھول کے بادل اٹھنے لگے اور وادی پر کامل سکوت طاری ہو گیا۔

''مجھے پانی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔'' تائتو نے کہا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسے دریا کے تیزی سے بہنے کی آواز سنائی دی تھی۔

میں جانتا ہوں، ہم اس طرح کی بے شمار چیزیں دیکھتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے شہروں کے ناچ گھروں کا طواف کرنے والی لڑکیوں کو، جو فیشن کے معاملے میں دوسروں سے کہیں آگے ہوتی ہیں، تائتو کا ناک نقشہ دلچسپ نظر آتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آدمی ایک سائز بڑا اور خاصا بوسیدہ کوٹ پہن کر بہت مہذب اور کلچرڈ دکھائی دینے لگتا ہے۔ لیکن ناچ گھروں میں آپ کو خواہ کتنے ہی اونچے کالروں والے سبز کوٹ نظر آئیں، ان

میں سے کوئی بھی اتنا میلا کچیلا یا غیر موزوں دکھائی نہیں دے گا جتنا کہ تائتو کا تھا۔

تائتو تیز دھوپ میں آنکھیں سکیڑے نیل کے پودے کاٹ رہی اور انہیں گٹھوں میں باندھ رہی تھی۔ یہ پودے باجرے اور کپاس کے ساتھ مکان کے پیچھے ڈھلوان پہاڑی پر اوپر نیچے تختوں پر اگائے گئے تھے۔ باجرے کے پودوں کے سروں پر شگوفے پھوٹ آئے تھے اور کپاس کے پھولوں کی گہری زرد پتیاں پورے جوبن پر تھیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک ڈوڈے نہیں بنے تھے اور نہ ان میں بیج بنے تھے۔تاہم ان میں سے بعض ڈوڈے کھل چکے تھے اور وہ اپنے غلافوں کے اوپر خالص سفید روئی کے گالوں کی نمائش کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے تائتو اپنی مشقت سے ہاتھ اٹھا لیتی، آستین سے رخساروں کا پسینا پونچھتی اور ہوا میں اپنی چھاتیوں کو ذرا ٹھنڈک پہنچانے کے لیے بلاؤز کھول دیتی۔ میں نے اپنی کھڑکی جھری برابر کھولی اور دیکھنے لگا کہ وہ کھیتوں میں کس طرح کام کرتی ہے۔

بظاہر اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنا کوئی چھوٹا موٹا گیت گانے لگی۔ اس پر میں مسکرانے لگا۔ الفاظ کسی غیر ملکی زبان میں تھے لیکن ان کی تفہیم آسان تھی۔ یہ الفاظ کچھ اس قسم کے تھے: ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھے پسینا آ رہا ہے۔ میری پیٹھ بھیگ چکی ہے اور میرے تلوے تربتر ہو چکے ہیں۔''

وہ اپنا گیت گاتی رہی اور بار بار اس کے بول دہراتی رہی۔ بالآخر ان کی تکرار میرے مطالعے میں خارج ہونے لگے۔ اور میں غسل کا پانی گرم کرنے میں کوچی سوکے کو مدد دینے کے لیے باہر نکل آیا۔

ٹب عقبی دروازے کے قریب چھجے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہاں ایک چیری کا درخت بھی کھڑا تھا۔ اس کی شاخوں نے ٹب کے اوپر چھتری تان رکھی تھی۔ چوبی ٹب مضحکہ خیز حد تک لمبا چوڑا تھا۔ کوچی سوکے اور میں اکھٹے اس میں بیٹھ گئے اور آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ گرم پانی ہماری گردنوں کو چھو رہا تھا۔ ''جب تم عینک اتار دیتے ہو تو تم معمول سے بھی زیادہ بھدے، نظر آنے لگے ہو۔ جلدی کرو اور اسے دوبارہ پہن لو، ٹھہرو، پہلے میں پہن کر دیکھتا ہوں۔''

کوچی سوکے نے میری عینک اٹھانے کے لیے شیلف کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پہن کر دیکھنے لگا کہ یہ اس پر کیسے پھبتی ہے۔ میں نے عینک اس کی آنکھوں سے اتار لی اور

خود پہن لی۔ اب مجھے وادی بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بالکل ان زمینی مناظر کی تصاویر کی مانند نظر آ رہی تھی جو ٹوکیو کے حماموں کی دیواروں پر بنی ہوتی ہیں۔

''تمہاری تو بالکل ہی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔تم واقعی ،بھدے، ہو گئے ہو۔''

''یہ غربت کے سبب ہوا ہوگا۔''

''چھوڑو، کیا بات کر رہے ہو۔تمہاری مراد عورتیں تو نہیں؟''

''اگر میں اتنا ہی بھدا ہوں تو پھر عورتیں میرا مسئلہ نہیں ہو سکتیں۔''

''سب کچھ ممکن ہے۔''

کوچی سوکے نے اپنے جسم کا بالائی دھڑ پانی سے اوپر نکالا اور اپنی جھریوں بھری چھاتی پر دو ہتڑ مارا۔ پھر وہ بالکل ہی ٹب سے باہر نکل گیا۔

میں بھی باہر نکل آیا اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ جب بادِ نسیم میرے ننگے جسم کو خشک کر رہی تھی تو سہ پہر کی دھوپ باغیچے کے درختوں کے بیچ چمک رہی تھی اور شرارتی انداز سے میری جلد پر سبز سائے کے بیل بوٹے بنا رہی تھی۔ تائتو نے اپنی کٹائی ختم کر دی اور ٹب میں بیٹھنے کی باری لینے لگی۔ پانی کے چھینٹوں کے اڑنے اور قطروں کے ادھر ادھر گرنے کی آوازوں کے مابین خوف زدہ چیخ سنائی دی۔ اس کا سبب کیا تھا؟ تائتو نے ٹب سے باہر چھلانگ لگائی اور دیوانہ وار میری طرف بھاگی۔ اس کے جسم پر کپڑے کی دھجی بھی نہیں تھی۔

''سنڈیاں!''

اس نے ٹب کے کنارے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک موٹی تازی سنڈی کسی پناہ گاہ کی تلاش میں سرتوڑ بھاگنے کے انداز میں رینگ رہی تھی۔ میں نے بانس کی جھاڑو سے اسے پرے پھینک دیا اور دوبارہ جھاڑیوں کے آخری سرے پر پہنچ گیا تاکہ میں سبز روشنی کو درختوں میں سے چھن چھن کر آتے اور اپنے جسم پر پڑتے دیکھ سکوں۔لیکن تائتو نے ایک بار پھر بڑے زور سے چیخ ماری اور میری طرف سرپٹ دوڑنے لگی۔

''یہ کس قسم کی سنڈیاں ہیں؟ وہ ڈھیروں کے حساب سے چیری کی شاخوں پر رینگ رہی ہیں!''

درخت کی جو ٹہنیاں ٹب کے اوپر جھکی ہوئی تھیں، وہ واقعی ان جسیم سیاہ سنڈیوں

سے پٹی پڑی تھیں۔ وہ سب ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں اور سب نے مل کر بہت بڑے انبوہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

تائتو ے جلدی جلدی اپنی پتلون پہنی اور کوچی سوکے کو واپس بلانے چلی گئی۔ وہ آ گیا۔ اس نے ایک نظر سنڈیوں پر ڈالی اور ناک بھوں چڑھا کر بولا: ''چار پانچ روز بعد ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ اس دوران میں یہ تتلیاں نہیں بن سکیں گی۔''

اس شام مینہ برسنے اور تیز ہوا چلنے لگی۔ جوں جوں رات گزرتی گئی، توں توں ان دونوں کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ تائتو اس دیوار کے سامنے دو زانو ہو گئی جس پر اس کی صلیب لٹک رہی تھی اور اپنی شبینہ دعائیں پڑھنے لگی۔ جب وہ کسی غیر ملکی زبان میں التجائیں کر رہی تھی تو وہ سرتاپا سنجیدگی کی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ لیکن وہ کوچی سوکے کی جانب مڑی اور شکایت کرنے لگی کہ ہوا کا شور اسے سونے نہیں دے رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری وادی طوفان کی تندی کی تاب نہ لا کر سسک رہی ہے بلکہ خود دھرتی میا کی چیخیں نکل رہی ہیں۔ کوچی سوکے اور میں ڈرافٹ (Draft) کی بازی پر بازی لگائے جا رہے تھے۔

''اگر تمہیں نیند نہیں آ رہی تو پھر انہیں کھا کر دیکھو'' کوچی سوکے نے تائتو کو چند خوبانیاں تھماتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور اپنے دونوں ہاتھوں میں دو دو خوبانیاں پکڑ لیں۔

''اپنی آنکھیں بند کر لو۔ پھر شاید تمہیں نیند آ جائے گی۔''

اس نے جواب دیا کہ اسے نیند نہیں آ رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند تو کر لیں لیکن جھٹ پٹ دوبارہ کھول لیں۔

ڈرافٹ میں کوچی سوکے کو ہرانا بہت آسان تھا۔ وہ جب بھی ہارتا، کہتا: ''اتنی بھی بڑکیں نہ مارو! چلو، ایک بازی اور ہو جائے۔'' وہ اس طریقے سے بارش اور تیز ہوا کے سمع خراش شور وغل کا تدارک کر رہا تھا۔

تائتو نے سوچا شاید اس سے اپنی دعا میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ لحاف سے باہر نکلی اور ایک بار پھر دعا مانگنے لگی۔ وہ صرف اپنا مہین شبینہ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اپنے بازو کے ساتھ، جو آستین کے چھوٹے ہونے کے سبب برہنا تھا، صلیب کا نشان بنانے

کے بعد وہ ایک بار پھر غیر ملکی زبان میں بڑبڑانے لگی۔ جب کوچی سوکے اس اذیت میں مبتلا تھا کہ اب وہ اپنی کون سی گوٹ آگے بڑھائے، میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک دزیدہ نظر عبادت میں مصروف تائتو پر ڈالی۔ گھاس کی چٹائی پر، جہاں وہ جھکی ہوئی تھی، اس کی برہنہ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے اپنے پاؤں میں روایتی جاپانی جسامت کی جرابیں، جو محض ٹخنوں تک پہنچتی ہیں، پہنی ہوئی تھیں۔

جب وہ اپنی دوسری دعا ختم کر چکی تو اس نے چار خوبانیاں اٹھائیں اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ جونہی اسے نیند آئی اور اس کی ڈھیلی گرفت سے خوبانیاں نیچے لڑھکیں، ہوا اور بارش دونوں تھم گئیں۔

کوچی سوکے اور میں نے اپنی بازی ختم کی اور اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ ہم تینوں کے پلنگ ایک دوسرے کے برابر برابر تھے۔ مجھے پلک جھپکتے ہی نیند آ گئی حالانکہ کوچی سوکے ابھی تک مجھ سے ہم کلام تھا۔ جب کچھ دیر بعد میری ذرا سی آنکھ کھلی، تو وہ ابھی تک بہ آواز بلند بولے جا رہا تھا:

''ذرا سوچو، چڑیا اور فاختہ میں کون سا پرندہ زیادہ لذیذ ہے۔ میرا خیال ہے کہ فاختہ بہتر ہے لیکن تیتر اس سے بھی بہتر ہے۔ میرا مطلب ہے تیتر اور فاختہ کے بعد چڑیا کا نمبر آتا ہے۔ میرا خیال ہے یہی ترتیب درست ہے۔ خیر، یہ برشگالی وادی عنقریب برشگالی جھیل میں تبدیل ہو جائے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا گھیر پانچ میل ہوگا لیکن اگر اتفاق سے کوئی جنگلی مرغابی یا بگلا اس کے اوپر ذرا کافی بلندی پر پرواز کرتا گزرے تو اسے اندازہ ہی نہیں ہو پائے گا کہ اس کے عین نیچے کوئی جھیل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کارپ مچھلیوں کا شکار بھی مل سکتا ہے ۔ آج سے بیس سال بعد کارپ مچھلیاں صرف دو فٹ لمبی برسنے سے ذرا پہلے شام کو ان دو دو فٹ مچھلیوں کے جھیل کے اوپر اچھلنے کودنے کا منظر کیا منظر ہوگا! پہاڑیوں کی قوسوں میں سے گزرتا پانی نو چھوٹی چھوٹی کھاڑیاں بنا دے گا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اگر اس لمبی چوڑی برشگالی وادی کو لمبی چوڑی برشگالی جھیل میں تبدیل ہونا ہے، جس میں نو چھوٹے چھوٹے نالے ہوں گے، تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہی تو ہونا ہے۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ اصولی طور پر جب آٹھ یا آٹھ سے زیادہ چھوٹی چھوٹی وادیوں پر مشتمل جھیل وجود میں آئے گی، پھر اس میں کوئی نہ کوئی مہیب بلا ضرور ٹھکانا کرے

گی، تو مجھ پر کسی قسم کا الزام مت دھرو۔ مجھے ٹھیک ٹھیک پتا تو نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ بلا کسی نو فٹ لمبی کارپ مچھلی کی شکل کی ہو۔ اور اگر یہ واقعی اسی شکل کی ہوئی، پھر یہ ہر قسم کے رنگوں میں نظر آیا کرے گی۔''

میں جھوٹ موٹ کے خراٹے لینے لگا۔ کوچی سوکے نے مجھ سے مزید گفتگو کرنا بند کر دی۔ وہ لیٹ گیا اور مجھ سے بھی بلند آواز میں خراٹے لینے لگا۔ تاہم جونہی اسے اندازہ ہوا کہ میں اپنا تماشا ختم کر چکا ہوں تو وہ بھی اس سے دستبردار ہو گیا اور اس نے بات کا سلسلہ جہاں چھوڑا تھا، وہیں سے دوبارہ شروع ہو گیا۔

''میرا خیال ہے جب جھیل بھر جائے گی تو میں کارپ مچھلیوں کے سینکڑوں بچے خریدوں گا اور انہیں اس کے پانی میں چھوڑ دوں گا۔ مجھے تیتر جیسے پہاڑی پرندوں کا اور بھی شوق ہے لیکن انسان انہیں پال نہیں سکتے۔ کوئی دس سال گزرے، مجھے پہاڑیوں میں تیتر کا گھونسلا نظر آیا تھا۔ اس میں انڈے تھے۔ میں انہیں اٹھا لایا اور انہیں سینے کے لیے ان پر مرغی بٹھا دی۔ تقریباً سارے انڈے ضائع ہو گئے۔ صرف ایک سے بچہ برآمد ہوا۔ جب مرغی انڈوں پر بیٹھی تھی تو میں نے اس کے اوپر خاصا بڑا ڈربا رکھ دیا تھا۔ جب مادہ تیتر اپنے گھر پہنچی اور اس نے انڈے غائب پائے تو وہ سیدھی ہمارے گھر کی طرف آئی اور گیٹ کے باہر ساری رات واویلا کرتی رہی۔ پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ واپس چلی گئی۔ اف! میں تمہیں کیا بتاؤں، اس کا رونا پیٹنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ جب اکلوتا بچہ پیدا ہوا، میں اسے اندر لے آیا اور اسے دانہ دنکا کھلانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ صرف دس دن بعد مر گیا۔ تیتر کے بچے جب تک جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کریں، ان سے کچھ کھایا نہیں جاتا۔ وہ تھوڑا سا کھاتے ہیں اور، پھر ادھر ادھر کلیلیں کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑا سا اور کھاتے ہیں اور دوبارہ پھدکنے لگتے ہیں۔ میرا تیتر بیچارہ بھوک سے مر گیا ہوگا۔ شاید اس کی موت میں اس کی اچھل کود کا بھی کچھ ہاتھ ہو۔ نہیں، اب مجھے یاد آ گیا۔ اس کے سر پر کسی نے ٹھونگ ماری تھی اور یہ اسی سے مرا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ماں کسی طرح اندر آ گئی ہوگی اور اسی نے اسے ٹھونگیں مار مار کر ہلاک کر دیا ہوگا۔ اس قسم کی ماں سے بڑھ کر بھی کوئی بدذات چیز ہو سکتی ہے؟ اپنے ہی بچے کو ٹھونگیں مار مار کر ہلاک کر دینا، بے شک اسے آپ

ہی سے چرایا گیا ہو، عجیب سی بات ہے ۔ میں نے اس قسم کے متعدد واقعات دیکھے ہیں۔ مادہ اپنے بچے کی تلاش میں آپ کے گھر آتی ہے، لیکن یہ وہاں رکتی نہیں۔ پھر نر آتا ہے اور اس مرغی کے ساتھ، جو بچے کی دیکھ بھال پر مامور ہوتی ہے، داؤ کھیلتا ہے اور اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیتا ہے۔ بعض اوقات تو میں یہ ارادہ بھی کرتا ہوں کہ میں اس مرغی کے انڈوں سے بچے پیدا کرنے کا اہتمام کروں لیکن پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں مجھ پر مخلوط نسل کو وجود میں لانے کی ذمہ داری نہ عائد کردی جائے اور میں اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہوں۔ میں سمجھنے لگتا ہوں کہ یہ میرا، سراسر میرا، قصور ہوگا۔''

کوچی سوکے یونہی ادھر ادھر کی ہانکتا ہانکتا اچانک چپ ہوگیا۔ اس نے گہری سرد آہ بھری۔ شاید اسے تائتو کے متعلق سوچ کر دکھ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولا:

''یہ سارا میرا قصور ہے۔''

ایکا ایکی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے اور جسم کپکپانے لگا۔ جو کوئی بھی کسی بوڑھے کو رات گئے آنسو بہاتے اور آہیں بھرتے دیکھے گا، وہ اس کی حالت زار دیکھ کر لازماً متاثر ہوگا۔ خود میری آنکھوں سے بھی چند اشک ٹپک پڑے۔ تاہم میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے دلاسا کیسے دوں۔ چنانچہ میں دوبارہ خراٹے لینے لگا۔ کوچی سوکے نے بہت جلد رونا دھونا بند کیا۔ وہ خس بھی سو گیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔

ہم نے منتقلی کا کام مکمل کر لیا۔ ہم نے چھوٹی موٹی چیزیں تو خود ڈھوئی تھیں مگر بستر، پلنگ اور ٹب گائے کی پشت پر لاد کر لائے تھے۔ ہمیں انسانوں اور جانوروں کے قافلے کی صورت میں سرخ مٹی کے میدانوں کے متعدد چکر لگانا پڑے تھے۔

نئے مکان میں تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں چھ اور دوسرے کمرے میں ساڑھے چار چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تیسرا، جو خاصا فراخ تھا، صرف کچے فرش پر مشتمل تھا۔ اس کا ڈیزائن اور جن اشیاء سے اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی، وہ اس کے پرانے مکان سے مختلف نہیں تھیں جس میں وہ اب تک رہتا چلا آیا تھا۔ جس کمرے میں چھ چٹائیاں تھیں، اس کی کھڑکی کے باہر خوبانی کا درخت کھڑا تھا۔ مکان کی مشرقی جانب بیت الخلا اور گائے کا

طویلہ بنا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہر چیز نئی تھی۔ چھ چٹائیوں والا کمرا کثیر المقاصد تھا۔ اس میں سویا جا سکتا تھا، کھانا کھایا جا سکتا تھا، آپس میں بیٹھ کر گپ لڑائی جا سکتی تھی اور مہمانوں کا استقبال کیا جا سکتا تھا۔ غرض یہ کہ یہ سبھی کچھ تھا۔ ساڑھے چار چٹائیوں والا کمرا سٹور تھا۔ اس میں ٹرنک، بستر ے اور الم غلم اشیاء رکھی جا سکتی تھیں، اور جن بچوں کو ڈانٹ پڑے، وہ بھاگ کر اس میں پناہ لے سکتے اور آنسو بہا سکتے تھے۔

سامان ڈھونے کے بعد ہم مکان کی صفائی کرنے لگے۔ ہمیں فرش پر لوکاٹ، خوبانیوں اور سگرٹوں کے ٹوٹے، جنہیں ٹین کے ڈبوں پر رگڑ کر بجھایا گیا تھا، ادھر ادھر بکھرے پڑے ملے۔ کسی شخص نے کوئلے سے دیواروں پر مزاحیہ، سیاسی اور احتجاجی نعرے لکھ دیئے اور خاکے بنا دیئے تھے۔ ان کے نیچے دوسروں نے اپنے تبصرے تحریر کر دیئے تھے۔ یہ حرکت غالباً کاریگروں اور مزدوروں نے کی تھی۔

پورے مکان کی صفائی مکمل ہوگئی لیکن کوچی سوکے کو پھر بھی نقائص تلاش کرنے کا موقع مل گیا۔ ''مجھے یہ گھر، گھر محسوس نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے یہ ٹھیک ٹھاک ہو لیکن گرمیوں اور حبس کے دنوں میں اس کے اندر ہوا کے آر پار جانے کا کوئی انتظام نہیں اور یہ اس قسم کے بیکار مکانوں جیسا ہے جن میں سردیوں کے ایام میں آدمی کی قلفی جم جاتی ہے۔''

وہ بار بار کھڑکی سے باہر تھوکتا اور دل کے پھپھولے پھوڑتا رہا۔

''مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی دوسرے کے مکان میں اٹھ آیا ہوں۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے ساتھ یہ واردات گزرے گی۔ میرا دوسرا مکان اس سے کہیں بہتر تھا! میں مزید ایک رات وہاں گزارنے جا رہا ہوں۔''

اس شام کو کھانا کھانے کے بعد اس نے واقعی اپنا بستر اٹھایا اور وادی میں، جہاں تاریک گہری ہونے لگی تھی، چلنے لگا۔ تائتو نے گائے کھونٹے سے باندھی اور اس کی پیشانی اور پہلوؤں سے چچڑیاں کھینچنے لگی۔ اس نے کوچی سوکے کے چلے جانے پر اسے کوئی جلی کٹی نہ سنائی۔ اس کی بجائے اس کا سارا دھیان اپنے کام پر تھا۔ اسے مویشی کے جسم سے جو چچڑی ملتی، اسے وہ اپنے جوتے کی ایڑی تلے کچل دیتی۔ مٹی اور اپنے ہی خون سے لت

پت جھڑیاں جان ہار دیتیں۔

میں نے گھومنے والی سکرین پر دوبارہ کاغذ چپکانے کا کام ختم کر لیا تھا اور اس کے ہینڈل پر لئی سے میپل (Maple) کا پتا چسپاں کر رہا تھا مجھے خیال آیا ستتر سال کا ہونے کے باوجود کوچی سو کے پر اب بھی بعض اوقات بچپنا سوار ہو جاتا ہے۔ وہ جلد یا بدیر لازماً واپس آجائے گا۔

لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ رات آ گئی۔ تائتو جو رسی بٹ رہی تھی، وہ نصف کے قریب مکمل ہو چکی تھی مگر کوچی سو کے ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں اسے واپس لانے باہر نکل گیا۔ وادی پہلے ہی دھند کی لپیٹ میں آ چکی تھی اور چاندنی میں بھوسلے دھوئیں کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

جب میں وہاں پہنچا، کوچی سو کے اپنے بستر پر نہیں تھا۔ وہ نیم وا دریچے کے قریب بیٹھا تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے کہنیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر اور اپنی ٹھوڑی کہنیوں پر رکھی ہوئی تھی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدموں نے اس کا انہاک توڑ دیا۔

''اس قسم کی جگہ پر اونگھنا تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔ حالات نے جو کروٹ لی ہے، صرف اس نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔''

''دیر ہو چکی ہے۔ آؤ، گھر چلیں۔''

''مجھے یہ مکان اور بھی اچھا لگنے لگا ہے۔ میں کس چھت کے نیچے رہنا پسند کروں گا، اس کے فیصلے کا اختیار مجھے ملنا چاہیے۔''

''بگڑا بچہ بننا چھوڑ دو۔ آؤ چلیں۔''

''میرے ساتھ جو سلوک ہوا ہے، میں اس کے خلاف نئے سرے سے جدوجہد کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں میرے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں اسے کسی طرح بھی اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ واپس چلا جاؤں۔ میں نے چند قدم اٹھا بھی لئے مگر اسے ایک نظر

دوبارہ دیکھنے کے لیے رک گیا۔ یہ سوچ کر کہ میں جا چکا ہوں، اس نے اپنی ٹھوڑی دوبارہ کہنیوں پر رکھ لی تھی اور وہ ایک بار پھر اپنی ادھیڑپن میں کھوگیا تھا۔ میں نے اسے اسی کیفیت میں چھوڑا اور واپس چل پڑا۔

تائتو ابھی تک اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہ چھ چھ فٹ لمبی درجنوں پتلی رسیاں بٹ چکی تھی۔ اس نے کچے فرش پر تنکوں کی چٹائی بچھالی تھی اور وہ اس پر بیٹھی گھٹنوں پر دھاگے رکھے اپنا کام کر رہی تھی۔ جب وہ اپنے آگے کو بڑھے ہوئے بازوؤں کے برابر رسی بٹ لیتی تو اپنا ہاتھ اٹھاتی اور بٹے ہوئے حصے کو اپنی ٹانگوں کے بیچ رکھ لیتی۔ ابھی اس کی مصروفیت جاری تھی کہ بارش شروع ہوگئی۔

اگلی صبح کوچی سوکے بارش میں بستر اٹھائے واپس گھر آ گیا۔

درختوں کی کٹائی کی آوازیں اب وادی میں سنائی دینے لگی تھیں۔ شروع شروع میں دو کلہاڑوں کی صدائے بازگشت سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ چوب تراش صرف دو ہیں لیکن آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ موسم خشک رہے یا مینہ برستا رہے، وہ اپنا کام جاری رکھیں گے اور اس زمین سے، جو عنقریب غرقاب ہوجائے گی، تمام درخت کاٹ کر ہی دم لیں گے۔ معلوم ہوتا تھا درجنوں لوگ درخت کاٹنے میں مصروف ہیں اور اس شام تو بارش کی آواز بھی گرتے کلہاڑوں کی آواز میں گھل مل گئی تھی۔

کوچی سوکے مکان کے ایک کونے میں کھڑا تھا اور پوری توجہ سے شور وغل کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا کہ بلند ترین آوازیں ان تین کلہاڑوں کی ہیں جو سوکھے تناور بلوط کو کاٹ رہے ہیں۔ پھر ایک اور آواز ابھرنے لگی جس کی گونج باقیوں کی نسبت کہیں زیادہ ٹھوس تھی۔ یہ بے شک اس واحد درخت سے آ رہی تھی جو تن تنہا کھڑا تھا۔ یہ اس چوتازہ کی، جو سمفنی کی روح رواں ہوتا تھا، پتلی آواز سے مشابہ تھی۔ کوچی سوکے نے یہ گھٹی گھٹی آواز پہچان لی اور بولا کہ یہ آواز چیری کی لکڑی کاٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔

بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کوچی سوکے بیکار بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اس نے گائے کا رسا کھولا اور اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ جس قسم کی تنکوں کی چادر اس نے گائے کے جسم پر ڈال دی تھی، ویسی ہی برساتی اس نے خود پہن لی تھی۔ میں بارش سے

بچنے کے لیے گائے کے طویلے کے چھجے کے نیچے کھڑا تھا اور بند کے دروازے میں سے پانی کے اچھل اچھل کر تیزی سے نکلنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ دریا میں زبردست طغیانی پیدا ہو چکی تھی اور اس کا پانی دروازے میں ٹھوس شمار شہتیر دکھائی دے رہے تھے۔ چوب تراشوں نے جو درخت کاٹے تھے، بظاہر انہیں تراش خراش بھی دیا تھا اور ان کے شہتیروں کو وادی میں، جو ابھی تک ان کے کہاڑوں کی ٹھکا ٹھک سے گونج رہی تھی، بہتے دریا میں چھوڑ دیا تھا۔ شہتیر رکے بغیر دروازے میں سے باہر نکل رہے تھے۔

پانی بہت بڑی آبشار کی صورت میں گر کر نیچے تالاب بنا رہا تھا اور دھند کے بادل اڑا رہا تھا۔ پانی کے اتنے زور سے گرنے سے اتنی تیز ہوا پیدا ہو رہی تھی کہ چھینٹے فضا میں خاصی بلندی تک پہنچنے لگے تھے۔ تالاب میں جو شہتیر گرتے تھے وہ یا تو سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے یا پھر کامل دائروں میں گھومنے لگتے تھے۔ ان میں سے ایک پھسل کر دو دوسروں کے درمیان گر پڑا۔ یوں تینوں نے مل کر ایک قسم کی ناؤ بنا دی جو بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ دریا میں بہنے لگی۔ ایک اور شہتیر نے لڑھکنی کھائی اور اپنے ساتھیوں کے اوپر گر کر انہیں حیرانی میں مبتلا کر دیا لیکن اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور دوبارہ گہرے پانی میں گر پڑا۔

بارش کا سلسلہ پورے چار دن جاری رہا۔ اگلی صبح آسمان نکھر گیا اور وادی کے سبز رنگ چمکنے لگے۔

چوب تراشوں نے چوتھے روز اپنا کام ختم کر لیا اور پانچویں روز نیلگوں آکاش تلے ان کے کلہاڑوں کی آواز گونجنا بند ہو گئی۔ انہوں نے اپنی ذمے داری بہت قلیل مدت میں نبھا دی تھی۔ پہاڑی ڈھلانیں بند کی عین بلندی تک بالکل ننگی ہو گئی تھیں اور وہاں کسی درخت کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ درختوں سے محروم علاقہ کسی ایسی جھیل کا منظر پیش کر رہا تھا جس کے پانی کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا ہو۔ وادی کا یہ منظر ہم آخری بار دیکھ رہے تھے اور میں اس انقلاب پر حیران پریشان بند کی چوٹی کی گھاس پر کھڑا تھا۔

''یہ ہوئی نا کوئی چیز۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی جسامت بہت بڑھ جائے گی۔''

کوچی سوکے نے تبصرہ کیا۔

''مجھے تو صرف پانچ ننھی منی وادیاں نظر آ رہی ہیں۔''

چوب تراشوں نے درختوں کا جو سلسلہ کاٹا تھا، اس سے پہاڑیوں کی قوسوں میں پانچ نکڑیں بن گئی تھیں۔ تاہم کوچی سوکے کو میری گنتی سے اتفاق نہیں تھا اور اس نے اشاروں سے بتایا کہ اس چوٹی کے، جو ہماری بائیں طرف آگے کو نکلی ہوئی تھی، سائے تلے چار مزید چھوٹی وادیاں ہیں۔

''تو بلا وہاں رہتی ہے؟''

''جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی آ ہی جائے گی۔''

درختوں سے تہی داماں پہاڑیوں کے عمومی پہلو اس آسان ڈھلوان کی سرخ مٹی کے مقابلے میں، جسے جھیل کی تہہ بننا تھا، سرمئی تھے۔ اس کے مرکزی حصے میں دریا بہہ رہا تھا۔ تب زمین اس کشش سے محروم تھی جو کسی جھیل کا خاصہ ہوتی ہے۔ اس وقت وہ کسی شخص کی ایسی آنکھ ضرور نظر آ رہی تھی جو غیظ وغضب کے عالم میں کھلی ہو۔ اس پر ہیبت جھیل کی بے آب تہہ میں کوچی سوکے کا مکان ابھی تک صحیح سلامت کھڑا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے بند سے نیچے اترے اور اس سارے علاقے کا چکر لگانے لگے جہاں پانی سب سے گہرا ہوگا۔ کوچی سوکے ایک خاص مقام پر رک گیا اور جب وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا اس کی آہ نکل گئی۔ ''شاید بلا یہیں کہیں ابھرے گی۔'' وہ بڑبڑایا۔

دو سرکاری افسر موجود تھے۔ دونوں نے اپنے کوٹ اتار رکھے تھے اور وہ کارکنوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ نکاسی آب کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ جونہی آہنی ہینڈل گھمائے گئے، سٹیج کے پردوں جتنے بڑے دروازوں کو نیچے گرانے کے لیے مختلف جسامت کی تین دندانے دار چرخیاں لٹو کی طرح گردش کرنے لگیں۔

وادی میں جو دریا بہہ رہا تھا، اس کے پانی کے حجم میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ چند منٹوں میں یوں نظر آنے لگا جیسے وہ اپنے ہی سیلاب میں غرق ہو رہا ہو۔

کوچی سوکے اور میں تائتو کی معیت میں منظر دیکھنے کے لیے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے چلے گئے۔ وادی کی تہہ میں سرخ مٹی کی ڈھلوانوں کے اندر مٹی، کنکروں، پتھروں، پتوں اور دوسری الا بلا سے آلودہ پانی کا تالاب بننے لگا۔ اس کی سطح ہموار اور پرسکون تھی۔ بظاہر اسے اس رفتار کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی جس سے یہ معرض وجود میں آ رہا

تھا لیکن پانی کے کنارے کا منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسا جوار بھاٹے کے اوقات میں ساحل کے ساتھ متلاطم سمندری موجوں کے ٹکرانے کا ہوتا ہے۔

سطح بہ سطح کھیتوں کے نیچے کوچی سوکے کا پرانا مکان بتدریج الگ تھلگ ہوتا جا رہا تھا۔ گائے کے طویلے اور اس کے ارد گرد کے درختوں کا صفایا کیا جا چکا تھا لیکن پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ کارکنوں کے تباہ کن ہاتھوں نے خود مکان کو چھیڑنے سے احتراز برتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوچی سوکے کے لیے یہ سب کچھ دیکھنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ موجیں مارتا اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیتا پانی اب اس کے خالی مکان پر قابض ہونے لگا تھا۔

اچانک کوچی سوکے یوں پریشان دکھائی دینے لگا جیسے وہ خود مکان کے اندر موجود ہو۔

''نہیں، یہ عام پانی نہیں، یہ تو سمندری موج ہے! سب ختم ہوگیا!''

میں نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں کو، جو مایوسی کے عالم میں بے اختیار فضا کو دھکیلنے لگے تھے، اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا اور اسے متنبہ کرنے لگا: ''دیکھو، لوگ کیا کہیں گے! وہ یقیناً تمہاری اس چیخ پکار کو مذاق اڑائیں گے۔''

اس نے جھٹکے سے اپنے بازوؤں کو میری گرفت سے چھڑایا اور چیخنے چلانے اور سب وشتم کرنے لگا کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کر دیا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ حکام نے محض اسے برباد کرنے اور جھیل میں اس کا مکان ڈبونے کے لیے یہ سارا کھٹ راگ رچایا ہے۔

دریا کا بے مہر اور سفاک حملہ جاری رہا اور اس کا پانی شکستہ دروازے کے اندر داخل ہوگیا۔ دیواروں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور چھجے دھڑام سے نیچے آ گرے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری عمارت بھنور کی لپیٹ میں آ گئی اور سطح آب کے نیچے ناپید ہوگئی۔

''ڈوب گیا!'' تائتو نے عالمِ اضطراب میں آہ بھرتے ہوئے کہا۔ جہاں مکان کھڑا تھا، وہاں چند چوبی شہتیر ایک دوسرے کو دھکیلتے پانی کی سطح پر نمودار ہوگئے۔ بجلی کی رفتار سے ان کے دو تہائی حصے پانی کے اوپر بلند ہوئے اور اسی رفتار سے دوبارہ نیچے گر پڑے۔ اس مرتبہ وہ اپنے پہلوؤں کے بل گرے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہوئے اور افراتفری کے عالم میں افتاں و خیزاں کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔

اب پانی کھیتوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ وہاں باجرے کی فصل ابھی کٹائی کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی ریلے نے اسے بلاتردد دبوچ لیا اور پلک جھپکنے میں اس کا ملیدہ کر دیا۔ بعینہٖ کپاس کے پودے اپنے گہرے زرد پھولوں اور سفید پھٹیوں سمیت ان ڈھلوان کھیتوں کے ساتھ، جن میں وہ کھڑے تھے، تندو تیز طغیانی میں نیست و نابود ہو گئے۔ سیلاب دو خلیجیں بنانے لگا۔ کوچی سوکے کا خیال تھا کہ نوکی نوکھاڑیوں کو سیلاب کی زد میں آنے کے لیے کئی دن درکار ہوں گے۔ پھر بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ وادی میں صرف واحد جھیل نمودار ہو رہی ہے۔ اس کی سطح، جو کیچڑ کی طرح ملگجی تھی، ملحقہ پہاڑیوں اور نیلگوں آسمان کو یوں منعکس کر رہی تھی جیسے وہ ان تبدیلیوں کی، جن کے برپا کرنے کی وہ ذمے دار تھی، شدت کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

جب سمندر کی جانب بہتے دریا کی آوازیں ہمیشہ کے لیے ناپید ہوگئیں تو، کوچی سوکے اپنے کان مروڑنے اور شکایت کرنے لگا کہ ان میں سیٹیاں بج رہی ہیں۔ دونوں سرکاری افسر کارکنوں کی معیت میں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں اور کوچی سوکے بند چوٹی کی طرف چل پڑے۔ وہاں تختے پر اعلان نامہ چسپاں تھا کہ بند کا افتتاح اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوگا۔

ہم تختے کے قریب بیٹھ گئے اور چپ چاپ جھیل کو دیکھنے لگے۔ ایک ننھا منا پرندہ سطح آب پر ابھرا اور اڑنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں پھر رہا ہے۔ جھیل کسی بھوت کی مانند اچانک نمودار ہوئی تھی اور اس کے گھر کو اجاڑ گئی تھی۔ پانی میں اپنے عکس کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور وہ جوش و خروش کے عالم میں اپنے پر پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ فضا میں خاصی بلندی پر پہنچا، اپنے پروں کو سمیٹا اور دوبارہ سطح آب کی طرف لپکا۔ تائتو بھی پانی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی: ''بے چارہ بہت جلد تھک جائے گا۔ ویسے یہ کون سا پرندہ ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے جاپانی کوئل معلوم ہوتی ہے۔''

اندھیرا چھا گیا لیکن پرندے کی غصیلی پرواز ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جب پانی کی سطح گدلی چاندی جیسی ہوگئی تو پرندہ اس کے اوپر سیاہ لکیر بناتا نظر آیا۔ شاید یہ اس کے اپنے پھڑ پھڑاتے پروں کی آواز تھی جس نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔

کوچی سوکے نے کہا: ''یہ جھیل کتنی بے درد ہے!''

تائتو نے چند کنکریاں اٹھائیں۔ وہ انہیں نشانہ باندھ کر پھینکنے اور پرندے کو آوازیں دینے لگی۔ ایک کنکری اس کے سر کو چھوتی گزر گئی۔ پرندہ حیران رہ گیا۔ اس نے خطرے کی پروانہ کرتے ہوئے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے دائرہ نما چکر کاٹااور پہاڑی کے درختوں میں غائب ہوگیا۔

کوچی سوکے نے اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھی اوریوں آہیں بھرنے لگا جیسے اسے ابھی ابھی کوئی بات سوجھی ہو۔ وہ گہری سانس لیتا اور اپنے کندھوں کو جھٹکا دے کر زور سے ہوا خارج کر دیتا جیسے وہ ہمیں سمجھانا چاہتا ہو کہ وہ اس طریقے سے اپنے دل و دماغ سے پریشان کن خیالات ہمیشہ کے لیے نکال دینا چاہتا ہے۔ اپنی ہر سانس کے، جو وہ اندر کھینچتا اور پھر باہر نکالتا تھا، اختتام پر شدت جذبات سے اس کا بدن ذرا سا کپکپا جاتا۔ بتدریج بڑے میاں کی آہیں ہچکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔

مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔

تائتو صبر و تحمل سے ہمارے اٹھنے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں کی تیوری مجھے بتا رہی تھی کہ وہ کوچی سوکے کو بند پر چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گی۔

دازائی اوسامو

طلسمی چراغ

دازائی اوسامو(Dazai Osamu) (1909ء تا1948ء) جاپان کے اہم ترین اور زرخیز ترین جزیرے ہون شو(Honshu) کے ضلع ایوموری(Aomori) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار تھے اور وہ گیارہ بہن بھائیوں میں دسویں نمبر پر تھے۔ وہ بچپن ہی میں اپنی ماں کی شفقت سے محروم ہوگئے اور ان کی پرورش کا بار ان کی پھوپھی اور ملازمین نے اٹھایا۔ اپنی عمر کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ ذہین اور حساس تھے لیکن انہیں اپنے خاندان کے ساتھ کبھی لگاؤ نہ پیدا ہوا۔ جب وہ سکول میں پڑھتے تھے تو مضمون نگاری میں اپنے ہم جماعتوں سے کہیں آگے ہوتے تھے۔ ادب سے انہیں شروع ہی سے بڑی دلچسپی تھی اور ہائی سکول کی تعلیم کے دوران میں انہوں نے طلبا کی ادبی انجمن قائم کی۔ اس ادبی انجمن کے اہتمام اور اوسامو کے روپے کی مدد سے ایک ادبی رسالے کا بھی اجرا ہوا جس میں ان کی اپنی کہانیاں بھی باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔

1930ء میں اوسامو ٹوکیو یونیورسٹی کے فرانسیسی شعبے میں داخل ہوئے۔ ان دنوں مارکسی تحریک کو بڑا فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اوسامو بھی طالب علم کی حیثیت سے اس میں شامل ہوگئے تاہم وہ زیادہ دیر اس کا ساتھ نہ دے سکے اور دو سال بعد انہوں نے اس سے علیحدگی اختیار

کر لی۔

صحیح معنوں میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1933ء میں ہوا۔ 1934ء میں ان کی کہانیوں کا پہلا اور 1935ء میں دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔ ادبی میدان میں کامیابی کے باوجود ان کی گھریلو زندگی طلاتم رہی۔ ان کے اپنے خاندان نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا کیونکہ وہ مسلسل کسی گیشا کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوئے تھے اور اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے اس دوران میں چار مرتبہ کسی عورت کے ساتھ خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ چوتھی کوشش میں عورت تو ڈوب کر ہلاک ہو گئی لیکن وہ خود بچ گئے۔ پھر ان کا آپریشن ہوا۔ اس پر وہ اتنا مضمحل ہوئے کہ منشیات میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور انہیں علاج کے لیے ذہنی امراض کے شفا خانے میں داخل ہونا پڑا۔

1939ء میں ان کی شادی ہائی سکول کی استانی ایشی ہارا میچی سے ہوئی۔ یہ شادی بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس نے ان کی ذاتی اور ادبی دونوں زندگیوں کا دھارا تبدیل کر دیا۔ ان کا طرز نگارش اور تخلیقی ساخت زیادہ واضح، زیادہ فطری اور سادہ ہو گئے۔ ان کی زندگی کا یہ پر مسرت دور 1945ء تک جاری رہا۔

1945ء میں جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی، ان کی ادبی معراج کا تیسرا اور آخری دور شروع ہوا مگر یہ صرف ڈیڑھ سال جاری رہا۔ اس دوران ان کی تین کتابیں ''ڈوبتا سورج'' (1947ء)، ''ولون کی بیوی'' (1947ء) اور ''انسانیت سے محروم'' (1948ء) شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کو ان کی اعلیٰ ترین تصنیفات گردانا جاتا ہے۔لیکن اس دوران میں ان پر ایک بار پھر افسردگی نے غلبہ پالیا اور انھوں پانچویں مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب رہی اور وہ 1948ء میں اپنی ایک محبوبہ کے ساتھ ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

اوسامو جاپانی کے انتہائی متنازعہ ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ موت کے بعد ان کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا اور ان کا یوم وفات بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

میں اس کے متعلق جتنی زیادہ گفتگو کرتی ہوں، لوگوں کی بدگمانیوں میں اتنا ہی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ میں جس شخص سے بھی ملتی ہوں، وہ مجھ سے چوکنا ہو جاتا ہے۔ جب میں محض دوسروں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے جاتی ہوں، وہ مجھے عجیب عجیب نظروں

سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے وہ سوچ رہے ہوں کہ میں کیوں آئی ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ ناقابل برداشت معلوم ہونے لگتا ہے۔

اب مجھ میں کہیں جانے کا یارا نہیں رہا۔ آج میں اپنے گھر کے قریب حمام چلی گئی لیکن مجھے شفق کی سرخی کے چھا جانے تک انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کوئی مجھے دیکھ سکے۔ ابھی گرمیاں زوروں پر تھیں، جھٹ پٹے کی سرخی میں میرے سوتی کمونو (Kimono) کی سفیدی خوب جھلملاتی رہتی تھی اور مجھے یہ فکر ستاتی رہتی تھی کہ کتنی نمایاں نظر آ رہی ہوں۔ لیکن کل سے موسم خاصا خنک ہوگیا ہے۔ اب ہم چند ہی دنوں میں خزاں کے ملبوسات پہننا شروع کر دیں گے اور میں اپنا غیر دھاری دار سیاہ کمونو پہننے لگوں گی۔ مجھ سے یہ تصور برداشت نہیں ہوتا کہ حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے، وہ اس پر مزید ایک سال چلتے رہیں گے...... آخر کسی بات کی حد ہونا چاہیے، میرے لیے یہ تصور سوہان روح ہے۔ اگلی گرمیوں تک مجھے کسی نہ کسی طرح سماج میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہوگا تاکہ جب میں اپنا صبح کی دھوپ کی طرح جگمگاتا جاذب نظر کمونو پہن کر باہر نکلوں تو کوئی بھی شخص نہ تو مجھ پر انگلی اٹھائے اور نہ مجھے گھور کر دیکھے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ جب میں تہواروں کے ایام میں مندروں اور درگاہوں میں لوگوں کے ہجوم میں گھوموں پھروں تو میں نے کم از کم معمولی میک اپ ضرور کیا ہو۔ جب میں سوچتی ہوں اس میں کتنا مزہ آئے گا، میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔

ہاں، میں نے چوری کی تھی۔ بھلا میں اس سے کیسے انکار کرسکتی ہوں؟ سچ پوچھیں تو حرکت مجھ سے سرزد ہوئی، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں، لیکن، خیر...... میں آپ کو بتانا چاہ رہی ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے شروع ہوا۔ میں یہ کام اس لیے نہیں کر رہی کیونکہ مجھے اس بات کی کوئی پروا ہے کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ انہیں تو میں حقیقتاً جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھتی۔ پھر بھلا میں کیوں سوچنے لگی کہ ان کی میرے متعلق کیا رائے ہے۔ پھر بھی اگر آپ کو میری کہانی پر یقین آ سکے تو میں شروع ہو جاتی ہوں...... شاید اسی میں میری بھلائی ہے۔

میں ایک غریب جاپانی جفت ساز کی بیٹی ہوں...... دراصل میرا باپ جوتے نہیں بلکہ کھڑاؤں بناتا ہے اور میں اس کی اکلوتی اولاد ہوں۔ جب میں کل رات باورچی خانے میں بیٹھی بہاریہ پیاز کاٹ رہی تھی، مجھے پچھواڑے سے اپنے پڑوسیوں کے کسی بچے کی نیم

روہانسی آواز سنائی دی: ''بہن جی!'' میں پیاز کاٹتے کاٹتے رک گئی اور دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے خیال آیا اگر میرا بھی کوئی چھوٹا بھائی یا بہن ہوتی، جسے وقتاً فوقتاً میری ضرورت پیش آتی رہتی اور وہ اس بچے کی طرح مجھے پکارا کرتی تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری آنکھیں، جو پہلے ہی پیاز کاٹنے سے دکھنے لگی تھیں، گرم گرم آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔ میں اپنی ہتھیلی کی پشت سے ان آنسوؤں کو صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن چبھن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آنسو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور بلا روک ٹوک بہتے ہی جا رہے تھے۔ میں بالکل بے بس ہو گئی۔

یہ گزشتہ بہار کے آخری ایام تھے۔ چیری کے پھول اپنی چمک دمک کھو چکے تھے اور سوسن کے گلابی اور نیلے پھول، پھولوں کی دکانوں پر نظر آنے لگے تھے کہ حجام کی دکان پر افواہ پھیلنے لگی: یہ بگڑی ہوئی لونڈیا آخر کار مردوں کے پیچھے لگ گئی ہے۔

لیکن میں ابھی تک خوش تھی۔ میزونو ہر روز سر شام مجھ سے ملنے آجاتا تھا۔ اندھیرا چھانے سے پہلے میں اپنا کمونو تبدیل کرتی، ہلکا پھلکا میک اپ سجاتی اور اس کے انتظار میں بیٹھ جاتی۔ جب بیٹھنا دشوار ہو جاتا، میں اٹھتی اور اندر باہر جھانکنے لگتی کہ وہ آ گیا ہے یا نہیں۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ ہمارے پڑوس کے لوگ میرے اس معمول سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ میری طرف ڈھکے چھپے اشارے کرتے اور آپس میں باتیں کرتے: ''دیکھو، کھڑاؤں والے کی چھوکری سا کیکو پر مستی آ گئی ہے!'' اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور یوں میرا مذاق اڑاتے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، میرا خیال ہے کہ میرے والدین کا مبہم سا احساس تھا لیکن وہ اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔

میں اس سال چوبیس کی ہو گئی ہوں مگر ابھی تک کنواری ہوں۔ ابھی تک میری شادی کیوں نہیں ہو سکی، اس کا ایک سبب غربت تو ہے ہی لیکن اصل اور بڑی وجہ میری ماں ہے۔ جب وہ ابھی پڑوس کے بہت بڑے زمیندار کی داشتہ تھی تو اس کی میرے باپ کے ساتھ آنکھ لڑ گئی۔ وہ اپنے سابقہ مربی کی تمام مہربانیوں کو فراموش کر کے اس کے ساتھ بھاگ گئی اور بہت جلد مجھے اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ تاہم مصیبت یہ تھی کہ میں نہ تو زمیندار پر اور نہ اپنے باپ پر گئی تھی۔ کیا میری ماں کا کوئی تیسرا عاشق بھی تھا؟ خیر، میری پیدائش کے بعد میری ماں روز بروز دوسروں سے کٹتی گئی اور کچھ عرصے کے لیے محلے والوں

نے اس کا حقہ پانی بالکل ہی بند کر دیا۔ چونکہ میں اس قسم کی عورت کی بیٹی تھی، میری شادی کے امکانات تقریباً معدوم ہو گئے۔ لیکن میں نے جو شکل پائی ہے، اگر میں کسی صاحب حیثیت اور عالی نسب شخص کی بیٹی ہوتی، تب بھی میرا مقدر یہی ہوتا۔

اگرچہ مجھے نہ تو اپنے باپ سے اور نہ اپنی ماں سے کوئی بغض ہے، تاہم اتنا بالکل طے ہے کہ بیٹی میں اپنے باپ ہی کی ہوں۔ دوسرے خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں، مجھے اس کا بہر حال پختہ یقین ہے۔ میرے دونوں والدین میرا بڑا خیال رکھتے ہیں اور میں بھی ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھتی۔ وہ کمزور لوگ ہیں اور اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ وہ میرے ساتھ بھی کسی خاص جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کرتے حالانکہ میں ان کی اپنی بیٹی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں کمزور، ڈرپوک اور جھینپو لوگوں کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے والدین کی خاطر کرب اٹھانے اور تنہائی جھیلنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ تب کی بات ہے جب ابھی تک میزونو سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان کی طرف سے مجھ پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی تھیں، اس زمانے میں میں نے ان سے کبھی اغماض نہیں برتا تھا۔

اگرچہ بات کھسیانا کرنے والی ہے، مجھے بتا دینا چاہیے کہ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے اور یہ کہ وہ کسی کمرشل سکول کا طالب علم ہے۔ لیکن آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ میری اس سے ملاقات موسم بہار میں ایک ماہر علاج چشم کی انتظار گاہ میں ہوئی تھی جب میری بائیں آنکھ میں تکلیف تھی۔ میں اس قسم کی عورت ہوں جو پہلی ہی نظر میں محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ میری طرح اس کی بائیں آنکھ پر پٹی تھی۔ وہ کسی مہین لغت کی ورق گردانی کر رہا تھا، اس کی پیشانی شکن آلود تھی اور وہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اپنی پٹی بندھی آنکھ کی وجہ سے خود مجھ پر افسردگی طاری تھی۔ پاسانیا(Pasania) کے نوخیز پتے، جو مجھے کمرے کے دریچوں میں سے نظر آ رہے تھے، نیلگوں شعلوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جو تمازت زدہ ہوا میں ٹمٹما رہے ہوں۔ باہر کی دنیا کی ہر شے بعید از حقیقت معلوم ہو رہی تھی اور اس کا چہرہ غیر صحت مند لیکن پراسرار قسم کے حسن کا آئینہ دار تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ آنکھ پٹی کے جادو کا نتیجہ تھا۔

میزونو یتیم لڑکا ہے۔ اس کے ناز اٹھانے کے لیے اس کا کوئی قریبی رشتے دار موجود نہیں۔ اس کے والدین خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے لیکن وہ ابھی شیر خواری کے منازل طے کر رہا تھا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور ابھی صرف بارہ سال کا تھا کہ اس کا باپ بھی چل بسا۔ اس کے بعد اس کا خاندانی کاروبار (وہ ادویات کا کاروبار کرتے تھے) انحطاط پذیر ہونے لگا۔ اس کے دونوں بڑے بھائیوں اور بہن کو دور پار کے رشتے دار الگ الگ اپنے پاس لے گئے۔ فی الحال وہ اپنے خاندان کی آخری نشانی ہے۔ اس کے اخراجات اس کے باپ کی دکان کا منیم برداشت کرتا ہے اور وہ کمرشل سکول میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ میرا خیال تھا چونکہ وہ یکہ وتنہا ہے، اس لیے اس کی زندگی بہت محدود ہوگی۔ اس نے خود ایک مرتبہ میرے سامنے اقرار کیا تھا کہ اس کی زندگی کے انتہائی مسرت بخش لمحات وہ ہوتے ہیں جب وہ میرے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکلتا ہے۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ شبہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی بہت سی اشیاء سے محروم ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک دوست کے ساتھ تیراکی پر جانے کا وعدہ کر چکا ہے لیکن وہ اس وعدے پر خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ درحقیقت وہ بالکل بجھا بجھا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی رات میں نے تیراکی کا مردانہ جانگیا چرا لیا۔

میں اپنے محلے کی سب سے بڑی دکان ''دائیمارو'' میں تیز لیکن دبے قدموں داخل ہوئی۔ عورتوں کے سادہ سوتی ملبوسات میں سے کسی چیز کے انتخاب کا بہانہ کرتے ہوئے میں نے آنکھ بچا کر کاؤنٹر سے سیاہ جانگیا کھسکایا، بغل میں دبایا اور دکان سے باہر نکل گئی۔ ابھی میں پانچ گز بھی دور نہیں گئی ہوں گی کہ کسی کی بلند آواز سنائی دی۔ ''رکو!'' میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور میں پاگلوں کی طرح دوڑنے لگی۔ مجھے اپنے پیچھے ''چور، چور!'' کی سمع خراش چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی نے میری کمر پر گھونسا مارا اور میں لڑکھڑا گئی۔ جب میں واپس مڑی، ایک گھونسا میرے منہ پر پڑا۔

مجھے پولیس چوکی لے جایا گیا۔ اس کے سامنے محلے کے جانے پہچانے چہروں والے لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بال بکھر چکے ہیں اور میرے گرمیوں کے کمونو کے نیچے میرے گھٹنے ننگے ہو رہے ہیں۔ اس وقت میری حالت دیدنی ہوگی!''

ایک پولیس والے نے اپنے دفتر کے کسی اندرونی کمرے میں، جس کے فرش پر تنکوں کی چٹائی بچھی ہوئی تھی اور جس پر الم غلم اشیا کا بے ترتیب ڈھیر لگا ہوا تھا، مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ شکل صورت سے وہ اجڈ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر تقریباً ستائیس اٹھائیس سال، رنگ گورا اور چہرہ چھوٹا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام، پتا اور عمر پوچھی۔ وہ میرے جواب نوٹ بک میں لکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر تبسم بکھر گیا اور مجھ سے دریافت کرنے لگا: ''تم یہ حرکت کتنی مرتبہ کر چکی ہو؟''

اس کی دماغ میں کیا تھا، اس کے متعلق سوچ کر ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ لیکن اگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تو لازماً وہ مجھے حوالات میں ڈال دے گا اور میرے خلاف بھیانک الزامات کا ڈھیر لگا دے گا۔ مجھے احساس ہوا مجھے کچھ اس طریقے سے بات کرنا ہوگی کہ میں اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کر سکوں۔ میں نے (اپنے فعل کی) وضاحت کے لیے سر توڑ زور لگایا لیکن لگ کچھ یوں رہا تھا جیسے میں دبیز دھند میں پھنس گئی ہوں۔ اس سے پہلے میں اس قسم کے ڈراؤنے تجربے سے کبھی بھی گزری تھی۔ جب آخر میں کچھ نہ کچھ کہنے میں کامیاب ہو گئی، خود مجھے بھی اپنا انداز بھونڈا اور کھڑا کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم جب میں ایک مرتبہ شروع ہو گئی، پھر میں بولتی ہی چلی گئی جیسے میرے اندر کوئی خبیث روح حلول کر گئی ہو:

''آپ کو مجھے جیل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ میں بری عورت نہیں، میری عمر چوبیس سال ہے۔ میں اپنی ساری زندگی اپنے ماں باپ کی خدمت کرتی رہی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں اور دونوں کا پورا پورا خیال رکھتی ہوں۔ یہ کوئی غلط بات ہے؟ میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی کہ لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں اور میرے متعلق چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔

''مسٹر میزونو اچھا آدمی ہے۔ وہ بہت جلد بڑا نام کمائے گا، مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے کوئی خفت اٹھانا پڑے۔ اس نے کسی کے ساتھ وعدہ کر لیا تھا وہ اس کے ساتھ تیراکی پر جائے گا اور میں چاہتی تھی کہ جب وہ وہاں جائے تو وہ بھی اسی قسم کا جانگیا پہنے ہوئے ہو جو دوسرے پہنتے ہیں۔ اس میں خرابی کیا ہے؟ میں بے وقوف

ہوں۔ بے وقوف! لیکن اسے میں بڑھیا آدمی بنا دوں گی اور آپ کے ملاحظے کے لیے اسے آپ کے سامنے پیش کردوں گی۔ اس کا تعلق اچھے گھرانے سے ہے۔ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ اگر اسے زندگی میں کامیابی ہو جائے اور اس کا مقدر سنور جائے، پھر مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہوگی کہ مجھ پر کیا بیتتی ہے۔ میں بلکہ خوش ہوں گی۔ مجھے اس کی مدد کرنا ہے۔

''مجھے جیل میں نہ ڈالیں۔ میں نے آج سے پہلے کبھی کوئی برا کام نہیں کیا۔ میں بساط بھر اپنے غریب والدین کی خدمت کرتی رہی ہوں۔نہیں، آپ مجھے جیل میں نہیں ڈال سکتے۔ آپ یہ کام نہیں کر سکتے! میں چوبیس برس سے مشقت کی چکی میں پس رہی ہوں۔ صرف اس مرتبہ میرا ہاتھ بھٹک گیا اور مجھ سے یہ چھوٹی سی حماقت سرزد ہوگئی۔ اس کی پاداش میں آپ نے یہ کام کیا تو آپ بڑی غلطی کریں گے۔ آپ مجھے اس لیے چور سمجھتے ہیں کہ زندگی میں ایک بار، صرف ایک بار، میرا دایاں ہاتھ سوچے سمجھے بغیر بارہ انچ آگے بڑھ گیا؟ یہ بڑی زیادتی ہوگی، بہت بڑی زیادتی! بس لغزش ہو گئی—— چند سیکنڈ نے کیا سے کیا کر دیا۔

''میں ابھی نو عمر ہوں۔ ابھی میری ساری زندگی میرے سامنے پڑی ہے—— بالکل اسی قسم کی زندگی جس طرح کی میں اب تک گزارتی رہی ہوں۔ بالکل ویسی۔ میں بالکل تبدیل نہیں ہوئی۔ میں آج بھی وہی سا کیلو ہوں جو میں کل تھی۔ اس فضول جانگیے سے میں نے ''دائمارو'' کا کیا بگاڑ دیا ہے؟ یہاں ایسے ایسے نوسرباز پڑے ہیں جو لوگوں سے حیلے بہانے ہزار دو ہزار ین (Yan) ہتھیا لیتے ہیں—— بلکہ بعض کو تو وہ ان کی پوری جمع پونجی سے محروم کر دیتے ہیں...... لیکن انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا، الٹا ہر کوئی ان کی تعریفوں کے پل باندھتا رہتا ہے۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟ یہ جیلیں کن کے لیے ہیں؟ صرف غریب مسکین لوگوں کو ان کی ہوا کھانا پڑتی ہے۔ مجھے چوروں پر ترس آتا ہے۔ چور محض بے ضرر چھوٹے لوگ ہیں۔ وہ اتنے کمزور اور دیانت دار ہیں کہ دوسروں کے ساتھ فریب نہیں کر سکتے اور یوں اچھی زندگی نہیں گزار سکتے۔ چنانچہ جب ان کی جان ضیق میں آنے لگتی ہے تو وہ دو تین ین کی چھوٹی موٹی چیز چرا لیتے ہیں اور ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انہیں پانچ سے دس سال کے لیے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ خدایا! یہ سب کچھ کتنا بھدا، کتنا مکروہ ہے! نرا پاگل پن ہے!

میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں: نرا پاگل پن!''

میرا خیال ہے کہ مجھ پر اس وقت دیوانگی طاری ہوگئی ہوگی۔ پولیس والے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے واقعی کچھ کچھ پسند کرنے لگی ہوں۔ ہسٹریائی آنسو بہاتے بہاتے میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ لازماً سوچ رہا ہوگا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ وہ مجھے بڑی احتیاط سے مرکزی تھانے لے گیا جیسے ہی کوئی عورت نہیں نہیں بلکہ بم تھی۔ مجھے اس رات حوالات میں بند رکھا گیا۔ اگلی صبح میرا باپ مجھے لینے آ گیا اور مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اس نے راستے میں مجھ سے صرف اتنا—— اور وہ بھی ڈرتے جھجکتے—— پوچھا کہ انہوں نے مجھے مارا تو نہیں تھا؟ اس نے سارے راستے اس کے سوا اور کچھ نہ کہا۔

اس شام جب میں نے اخبار دیکھا، میرا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا۔ میں سرخیوں میں موجود تھی: ''بائیں بازو کی گھٹیا عورت کی پر جوش اور موثر تقریر۔'' میری ذلت و خواری یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ میرے پڑوسی میرے گھر کے قریب بے مقصد ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاہتے کیا ہیں، لیکن بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ میری ایک جھلک دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اس پر میرا سارا بدن کپکپانے لگا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہونے لگا کہ میرا حقیر سا جرم دراصل کتنا بھیانک ہے۔ اگر مجھے کہیں سے زہر کی پڑیا مل جاتی تو میں بلا تامل کھا جاتی یا کہیں قریب بانسوں کا جھنڈ ہوتا تو میں ان سے لٹک کر اپنا گلا گھونٹ دیتی۔ ہم نے چند دن کے لیے اپنی دکان بند کر دی۔ کوئی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ مجھے مسٹر میزونو کا مندرجہ ذیل خط ملا:

''سا کیکو! مجھے دینا کے کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت تم پر زیادہ اعتبار ہے۔ لیکن تمہاری تربیت صحیح خطوط پر نہیں ہوئی۔ تم دیانتدار خاتون ہو لیکن بعض امور میں تم اتنی راست باز نہیں جتنا کہ تمہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہاری شخصیت کے اس پہلو کی اصلاح کرنا چاہی لیکن میں ناکام رہا۔ افراد کی لازماً تعلیم و تربیت ہونا چاہیے۔ پچھلے روز میں اپنے دوست کے ساتھ تیراکی کرنے گیا تھا اور ہم کافی دیر تک ساحل پر بیٹھے اپنی آرزوؤں کے

متعلق گفتگو کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم بالآخر کامیاب رہیں گے۔

میری تم سے بس اتنی درخواست ہے کہ اپنے رویے کی اصلاح کرو۔ سماج سے معافی مانگو اور یوں اپنے جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کرو۔ ہم گنہگار کی نہیں، گناہ کی مذمت کرتے ہیں۔

میزونو سابورو

پس تحریر: خط پڑھنے کے بعد اسے اور لفافے کو نذرِ آتش کرنا نہ بھولنا۔''

اس کے خط میں بس یہی کچھ لکھا تھا۔ میرا خیال ہے میں بھول گئی تھی کہ اس کا خاندان کبھی امیر کبیر ہوا کرتا تھا۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا میں کانٹوں کی سیج پر بیٹھی ہوں۔ اب خزاں کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ ابا کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت مرجھا چکی ہے کیونکہ آج چھ چٹائیوں والے کمرے میں روشنی کم تھی۔ چنانچہ انھوں نے پرانا نسبتاً کم قوت والا بلب اتار دیا اور اس کی جگہ پچاس واٹ کا نیا بلب لگا دیا۔ ہم نے آج رات کا کھانا نئے بلب کی روشنی میں کھایا۔ اماں بار بار شکایت کرتی رہیں کہ روشنی بہت زیادہ ہے اور ان کی آنکھیں چندھیا رہی ہیں۔ انھوں نے جس ہاتھ میں کھانے کی تیلیاں پکڑ رکھی تھیں، اسے وہ اپنی پیشانی پر رکھ لیتیں اور اپنی آنکھوں پر سایہ کر لیتیں۔ یوں ان کی طبیعت بہت شگفتہ ہو گئی۔ میں نے ابا کو چاول کی شراب بھی پلائی۔

بہر حال ذہنی طور پر میں اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسی قسم کی چیزیں......مثلاً زیادہ کا بلب لگانا......ہی تو ہیں جن سے ہم مسرت حاصل کرتے ہیں۔ درحقیقت مجھے کسی بات کا دکھ نہیں تھا۔ اس کے برعکس میری سوچ یہ تھی کہ اس معمولی لیمپ کی روشنی میں میرا خاندان کسی طلسمی چراغ کی طرح ہے اور میرا جی چاہتا تھا میں یہ کہہ دوں: ''مہربانی فرما کر ذرا ہمیں دیکھیں تو سہی۔'' میرے والدین اور مجھ پر مشتمل ہمارا گھرانا بڑا من موہنا ہے۔'' میرا دل پرسکون مسرت سے لبریز ہو گیا۔ میں اس کی عام منادی کرنا چاہتی تھی، خواہ سننے والے باغ کے محض حشرات الارض ہی ہوں۔

ایشی کاوا جن

مہتابی جواہر

''......جو ہوائیں ناول کے صفحات میں جنبش پیدا کرتی ہیں وہ عام دنیاوی جھونکوں سے مختلف ہوتی ہیں۔''

(بدھستو)

ایشی کاوا جن (Ishikawa Jun) 1899ء میں پیدا ہوئے۔ نسب کے اعتبار سے وہ ٹھیٹ ٹوکوئی ہیں۔ انہوں نے فرانسیسی ادب کی تعلیم حاصل کی اور آندرے ژید کے ناولوں کے ترجمے کئے۔ جاپانی زبان میں ان کے ادبی کیریر کا آغاز ''حسن'' (1935ء) اور ''بدھستو'' (1936ء) کی اشاعت سے ہوا۔ ان سے پہلے جاپان میں ''میں ناول'' اپنے عروج پر تھا۔ اپنی ان دونوں کتابوں میں وہ اس طرز تحریر پر طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں اور اسے مسترد بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آندرے ژید نے ''نقل ساز'' (Les Faux-Monnayeurs) میں ناول ("Roman") کا جو تصور پیش کیا تھا، وہ اس پر پورا اترنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

ایشی کاوا جن کی ادبی زندگی کو یوں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جاپان کی نثری فکشن میں یورپی جدیدیت کے تصورات داخل کرنے، دیسی روایت میں ان کے ادبی اور فلسفیانہ مماثلت ڈھونڈنے اور وہ، جسے انہوں نے بعد میں Jikken Shosetsu یا تجرباتی ناول کا نام دیا، تخلیق

کرنے کی سعی کی۔ یہ وہ کام تھا جسے ان کی نسل کے دوسرے ادیبوں ، بالخصوص یوکومسور اچّی (1898ء تا1947ء) نے سرانجام دینے کی پوری کوشش کی لیکن انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ خود ایشی کاوا بھی اس میدان میں تب سرخرو ہوئے جب ان کے انتہائی تجرباتی شاہ کار ''عقاب'' (1953ء)، ''ستارہ پھول'' (1956ء)، ''سرکش روحیں'' (1963ء) اور ''الف سعادت'' (1965ء) شائع ہوئے۔ یہ ناول خالصتاً ذہن کی پیداوار ہیں، حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ''عقاب'' میں وہ کسی پراسرار زبان کر ذکر کرتے ہیں جسے وہ ''مستقبلیت'' (Futurese) کہتے ہیں۔ ''الف سعادت'' میں جو داستان بیان کی گئی ہے، وہ بھی انوکھی ہے۔ کوئی کموڈرور پیری(Perry) سیاہ جہازوں میں، نئے عہدنامے میں بیان کردہ دنیا کی تباہی کی پیشن گوئیاں (یوحنا کا مکاشفہ) لے کر جاپان پہنچتا ہے، تو ملک میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور غیر اعلانیہ عیسائی اس انتشار سے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان ناولوں کے پڑھنے کے بعد دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض تخیلاتی داستانیں ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں ادبی پیروڈی اور طنزیہ تمثیلیہ (Satiric Allegory) کے عناصر بھی شامل ہیں۔ پھر مصنف جس اسلوب نگارش کو استعمال کرتا ہے اسے ''سنجیدہ مزاحیہ'' (Seriocomic) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں مل کر اس کے ناولوں کو عام سطح سے اٹھا کر عظیم فن پاروں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

ایشی کاوا کی موجودہ کہانی ''مہتابی جواہر'' اس کی بابعد جنگ کی تجرباتی فکشن کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں تیکنیک تو وہی استعمال کی گئی ہے جو ''حسن'' اور ''بدھستو'' میں برتی گئی تھی لیکن موضوع کے اظہار میں داستان طرازی اور تخیل کاری کو کہیں زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیا گیا ہے۔ ''مہتابی جواہر'' دل دوز تمثیلیہ ہے۔ اس میں ایک طرف کسی مصنف کی—— جو زمانے سے ٹکر لینے کے لیے تو تیار ہے لیکن فعال اور بامعنی مزاحمت کرنے کے وسائل سے تہی دامن ہے—— امنگوں اور دوسری طرف ان مایوسیوں کا، جن کا اسے قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے، بڑے موثر انداز سے ذکر کیا گیا ہے۔

ایشی کاوا کا آخری ناول ''پاگل ہوا کی کہانی'' 1980ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی جن کتابوں کے انگریزی میں تراجم ہوئے ہیں، ان میں سرفہرست ''ستارہ پھول'' (Asters) ہے۔ ایشی کاوا کا اسلوب نگارش اتنا دقیق ہے کہ انہیں کبھی عوامی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، تاہم انہیں جاپان کے بہترین ادبی ایوارڈ کا ضرور مستحق ٹھہرایا گیا۔ انہیں جاپانی، چینی اور مغربی ادب پر جو

دسترس حاصل ہے، اس کی بنا پر انہیں آخری ادبی دانشو(The Last of the Literati) سمجھا جاتا ہے۔ جاپانی جرائد میں اکثر ان کی تجرباتی فکشن کا موازنہ نابوکوف اور بورجیس(Borges) سے کیا جاتا ہے۔

1945ء کا سال نو۔ میں صبح سویرے اٹھا اور ایک ہاشمین خانقاہ پر چلا گیا۔ میں نئے سال کا استقبال کرنے اور یادگار کے تحفے کے طور پر خوش قسمتی کا تیر وصول کرنے گیا تھا۔ جب میں ہجوم کے مابین خانقاہ کے سامنے کھڑا تھا اور طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں، جو چاروں اور فضا کو منور کر رہی تھی، نہار رہا تھا، میں نے جاپان کی قدیم صنفِ شاعری کائیوکا (Kyoka) میں اَن گھڑت نظم کہہ ڈالی:

اگرچہ ان کی تکونی چوٹیاں
نئے سال کی
دُھند میں لپٹی ہوئی ہیں
میں اپنی ساری امیدیں
ہمیشہ کی طرح دیوتاؤں کی تحویل میں دیتا ہوں۔

مَیں شہر کے آخری سرے پر واقع اپنی ننھی منی رہائش گاہ میں واپس آ گیا اور تیر آرائشی حاشیے کی پٹی میں پھنسا دیا جو کمرے کے اوپر کے نصف حصے پر بنی ہوئی تھی۔ میرے بے کیف بیچلر فلیٹ میں نوروز کے پودے سین ریو (Senryo) کی تین شاخوں کے ساتھ، جنہیں میں پہلے ہی سستے گل دان میں سجا چکا تھا، یہ میری سال نو کے لیے واحد رعایت بن گیا۔ مجھے راشن میں جو چاول کی شراب ملی تھی، اس کی دھیرے دھیرے چسکیاں لیتے مجھ پر اس شراب کی شان میں ایک اور مشکوک قسم کی کائیوکا نظم کہنے کی دھن سوار ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ چاول کی شراب اپنے ''جواہرات سے مرصع جاروب'' کے ساتھ تمام تفکرات خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے اور نوروز کا پودا سین ریو، جس کا سرخ پھل موسم سرما کے عین وسط میں پکتا ہے، ''ایک ہزار رائیوٗ' (Ryo) کے برابر ہوتا ہے۔

جواہرات سے مرصع جاروب کی شیریں اکسیر
سرخ پھلوں سے مزین نوروز کا درخت،

یہ سین ریو کی بہار ہے،
اس کی روشنی چاروں اور پھیل رہی ہے
ایک ہزار طلائی اوراق کی مانند چمک رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے کائیو کا کے عظیم شاعروں کے اسلوب کی جو بھدی نقل اتاری تھی، وہ اس پر خوب ہنسے ہوں گے۔ کہنے کو تو میں خانقاہ پر چلا گیا تھا اور وہاں سے تیر کا تحفہ بھی لے آیا تھا لیکن سب کچھ میں نے محض اضطراری طور پر کیا تھا، ورنہ محض اس وجہ سے کہ آج سال نو کا آغاز ہو رہا تھا، مجھے نوروز منانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کسی مخفی خواہش نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا اور اس کو پورا کرنے کے لیے میں کسی بابرکت گھڑی میں تہیہ کرنا چاہتا تھا۔ خواہش؟ مجھ پر اسے مخفی رکھنے کی کوئی پابندی نہیں۔ تو میری خواہش یہ تھی کہ میں کسی طور بائیسکل چلانا سیکھ لوں اور میں یہ کام جتنی جلدی کر سکوں، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا جب میرے دماغ میں بائیسکل چلانے کے رموز سیکھنے کا سودا سمایا اور میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ میں اپنے منصوبے پر عمل کر کے ہی رہوں گا۔

اگرچہ میری ذات میں کوئی ایسی شے نہیں جس پر تیزی طراری کا ذرہ برابر گمان ہو سکے، میرا میلان جھٹ پٹ اور سہولت سے ہو جانے والی چیز کی طرف ہے۔ میری طرف کوئی بال آہستگی اور نرمی سے بھی پھینکا جائے تو میرے ہاتھ صرف اتنی حرکت کر پاتے ہیں کہ اسے نیچے گرا دیں۔ اگر کوئی ٹرام سڑک کی دوسری جانب آ رکے تو میری ٹانگیں اتنا بھی نہیں کرتیں کہ وہ تیزی سے چند گز کا فاصلہ طے کریں اور مجھے اس میں سوار کرا دیں۔ جب حالت یہ ہو، پھر مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ میں کسی ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کی کم ہی امید کر سکتا ہوں جو زمانے کے بے رحم حقائق پر پورا اتر سکے۔ میرا پیشہ بھی کچھ اس قسم کا ہے جس میں پھرتیلے ہاتھ پاؤں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی، چنانچہ میرا مقدر یہ رہا ہے کہ میں انہیں بے عملی پر ہی قانع رہنے دوں۔

درحقیقت میں جس چیز کو اپنی ذات کہتا ہوں اگر آدمی اس کا ریاضیاتی مترادف

تلاش کرنا چاہیے، یہ منفی ایک (1-) کا جزرڈھونڈنے کی کوشش ہوگی۔ میرا اپنے بارے میں یہ خیال ہے کہ میں روئے زمین کے اوپر نہیں بلکہ اس کے نیچے رہتا ہوں۔ اپنے اس طرز حیات پر مجھے شرم تو محسوس ہوتی ہے لیکن اسے ترک کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اوپر اٹھنا چاہیے، اس ذلت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے، رینگ کر ہی سہی لیکن بہر حال زمین سے باہر نکلنا چاہیے۔ اس سے زیادہ نہیں، تو کم از کم ایک فٹ ہی اوپر بلند ہونا چاہیے اور دیوانہ وار اس حقیقت میں کود جانا چاہیے جو ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لیتی اور کسی انداز سے ہمارے گرد گھیرا تنگ کرکے ہمارے لیے مسائل کھڑے کرتی رہتی ہے۔

اگر اس خواہش نے کبھی کوئی ٹھوس صورت اختیار کرنا ہے تو بائیسکل کی خود کار مشین سے بڑھ کر میری ضروریات کے لیے اور کوئی چیز موزوں نہیں ہوگی۔ میں کم از کم اتنا تو کرسکتا ہوں کہ کوئی پرانی بائیسکل خریدلوں۔ اس میں تیل ڈلوانے کا جھنجھٹ نہیں کرنا پڑتا اور اسے چلانا بھی نسبتاً آسان ہے کیونکہ عورتیں اور بچے بھی ان پر عام سواری کرتے پھرتے ہیں۔اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ میں اپنی خواہش کی تکمیل آسانی سے کرسکتا ہوں۔ مجھے صرف بائیسکل حاصل کرنا ہوگی اور پھر میں مسافروں سے ٹھساٹھس بھری ہوئی ریلوے گاڑیوں پر حقارت کی نظر ڈالتا شہر کا مشکل سہی لیکن سفر تو کرسکوں گا۔ مزید برآں بائیسکل کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں—— ممکن ہے میری یہ غیر متوقع کامیابی لوگوں کی زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت توجہ حاصل کرلے اور یوں اس تحریک کی راہ ہموار ہو جائے جس کی میں خواہش کرتا رہتا ہوں——اس تصور ہی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا لیکن ابھی مجھے اس سواری کی مبادیات پر عبور حاصل کرنا تھا۔

کچھ مدت ہوئی میرے ایک دوست نے کسی تجارتی کمپنی کے نام مجھے تعارفی خط دیا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ مجھے، اس کے اپنے الفاظ میں ''وقت کے اہم معاملات'' میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اس کے ارادے نیک نیتی پر مبنی تھے اور اپنی اس خوش قسمتی پر مجھے بہت خوشی ہورہی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میں سانپوں کے جس بل میں رہ رہا ہوں، آخر کار مجھے اس سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے، چنانچہ پچھلے سال ایک روز میں اس شخص سے ملنے چلا گیا جو کمپنی میں اہم عہدے پر فائز تھا۔

یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہاں میری جس سے ملاقات ہوئی، وہ آدمی نہیں بلکہ اس کے بوٹ تھے۔ جس لاپروائی سے وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے اپنی کرسی پر بیٹھا آرام کر رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے آئینے کی طرح چمکتے دمکتے سرخ چرمی جوتے—— وہ اتنے تنگ تھے کہ ان پر کہیں بھی کوئی شکن نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ اتنے نئے نکور تھے کہ ان سے ابھی تک کسی خصی بچھڑے کی بو آ رہی تھی—— کمرے پر اتنے چھائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے کہ ان کے مقابلے میں ان کو پہننے والا بے چارہ شخص غیر متناسب طور پر چھوٹا اور حقیر معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے کمرے کے کسی کونے کھدرے میں دھکیل دیا گیا ہو۔

میں مانتا ہوں میں جو ان بوٹوں سے اتنا متاثر ہوا، اس کی معقول وجہ تھی۔ بائیسکل کے بعد مجھے جس چیز کی شدید تمنا تھی، وہ عمدہ بوٹوں کی جوڑی تھی۔ کیا مجھے ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللساں ہو جانا چاہیے؟ جب رات کو فضائی حملے کا سائرن بجتا ہے، اندھیرے میں ساق پوشوں کے ساتھ ٹامک ٹوئیاں مارنے اور انہیں الٹا سیدھا پہننے کی نسبت بوٹوں میں پاؤں ڈالنا کتنا آسان ہوگا۔ اگر آدمی نے عام قسم کے معمولی جوتے پہن رکھے ہوں، پھر اسے اس سڑک پر، جس پر چور اچکوں کا تسلط ہو، بچ بچا کر، کندھے اور گردن جھکا کر، پنجوں کے بل چلنا پڑتا ہے۔ مگر سوچیں اگر اس کے پاؤں میں بوٹ ہوں، پھر وہ کس طرح اکڑ کر اور چھاتی تان کر چل سکے گا! علاوہ ازیں سائیکل سواری کے لیے بوٹ نہایت لازمی ہیں۔ وہ بہت سٹائلش نظر آتے ہیں اور انہیں پہن کر آدمی بہتر انداز سے پیڈل مار سکتا ہے۔ اگر راستے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا جائے تو چوٹ لگنے یا ایڑی میں موچ آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

آپ کہیں گے کہ ابھی بائیسکل تو حضرت کے ہاتھ آئی نہیں اور ذکر لے بیٹھے ہیں بوٹوں کا۔ کیا شاہانہ مزاج ہے! آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اگر معمولی، بلکہ کسی حد تک پرانے سیاہ چرمی بوٹ ہی مل جائیں، میں تب بھی قناعت کر لوں گا......تاہم یہ بھی میرا وہ خواب ہے جس کے متعلق مجھے صرف آدھا یقین ہے کہ وہ پورا ہو سکے گا۔ اب جب کہ یہ بوٹ ان غیر دل پذیر بوٹوں کا، جن کے حصول کے میں محض خواب دیکھتا رہا تھا، مضحکہ اڑانے کے لیے منظر عام پر آ گئے تھے، مجھے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کس مقصد کی خاطر اس شخص کے دفتر میں حاضر ہوا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا اور

کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ میں ان بوٹوں کی خوبصورت چمک دمک کے سامنے، خواہ یہ کتنی ہی پُر ہیبت کیوں نہ ہو، اپنا سر جھکا دوں۔

بوٹوں سے خاصے دور چہرے نے میرے تعلیمی اور دیگر کوائف کا معائنہ کیا جو قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان کوائف میں صرف ایک سطر ایسی تھی جو مجھے بے روزگاروں اور ناتراشیدہ لوگوں سے ممیّز کرتی تھی۔ اس میں میری صلاحیتوں کا بے لاگ بیان تھا۔ اور اگرچہ آپ شاید اسے خودستائی پر محمول کریں تاہم اس میں لکھا تھا: ''بہ اعتبار لکھاری۔'' اس سے اس شخص کو کوئی مدد نہ ملی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی فرم میں دوقسم کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو اشیاء کو ہینڈل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو کاغذات چلاتے ہیں۔ اس کے انداز سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ میرے لیے موخرالذکر شعبے میں کوئی اسامی ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔''اگر مجھے اشیاء کی خرید و فروخت کے شعبے میں بھیج دیا جائے تو میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔ میں اسی مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے یہ بات پورے خلوص سے کہی تھی۔ میں دفتری کام، اس کے اعداد و شمار اور خط و کتابت کے گورکھ دھندے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''ہماری فرم کے کاروباری شعبے میں تربیت کا کام سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔'' اس نے تحمل سے جواب دیا۔

''آپ مجھ سے یہ کام نہیں کرا سکتے؟''

جونہی میں نے یہ سوال پوچھا، میری نگاہوں کے سامنے ان نوخیز لڑکوں کا منظر گھومنے لگا جو بڑے فخر سے اپنی سائیکلوں پر کمپنی کا کاروبار کرتے پھرتے ہیں۔ اگر مجھے سائیکل چلانا آتی تو شاید میں اپنا معاملہ زیادہ پرزور طریقے سے پیش کر سکتا تھا، لیکن میں قدرے کھسیانا ہو رہا تھا اور اس کا اظہار میرے لب و لہجے سے بھی ٹپکنے لگا تھا۔ میرے انداز التجا میں کمزوری جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو بائیسکل چلانا آتی ہے؟''

اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا لیکن اس میں ایک طرح کی بھونڈی ہنسی کی آمیزش تھی جیسے اسے میری حالت زار پر ترس آ رہا ہو۔ اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس

شخص نے لباس نہیں، بوٹ پہن رکھے ہیں اور اس کی نظر بہت تیز ہے۔ میری حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا اور میں نے وہاں سے واپس لوٹ آنے میں ہی اپنی خیریت جانی۔ چنانچہ ملازمت کی تلاش، جسے میں نے اتنے لاابالی انداز سے لیا تھا، تین منٹ کے انٹرویو کے بعد اچانک ختم ہوگئی۔ میں نے اپنے دوست کے نیک عزائم پر پانی پھیر دیا تھا۔ دونوں کی عنایت کا طلب گار بن کر اور ان میں سے کسی کو بھی خوش نہ کرکے میں نے گلے میں بہت بڑی مصیبت ڈال لی تھی۔ میں اپنے آپ سے شکوہ کرنے پر مجبور ہوگیا کیونکہ میں جن برے حالات میں پھنس گیا تھا اس کی وجہ محض یہ تھی کہ مجھے بائیسکل چلانا نہیں آتی تھی۔ اگر میں نے کسی اضطرابی لمحے میں اپنے بل سے باہر نکلنے اور ''زمانے کے اہم معاملات'' میں دوبارہ پناہ ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا تو جب تک بائیسکل چلانا نہیں آئے گی، مجھے اسی قسم کی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اس ناکامی کا اعادہ میری خجالت میں مزید اضافہ کردے گا اور مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زمین کے ایک فٹ نیچے دفن کردے گا۔ یہ چیز صحت کے لیے کتنی مضر ثابت ہوگی!

جہاں تک کسی بھی قسم کے اسباق کا تعلق ہے، آدمی جتنی چھوٹی عمر میں انہیں شروع کردے، اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اور جن کاموں میں جسمانی مہارت درکار ہوتی ہے، وہاں تو یہ کلیہ اور بھی صحیح بیٹھتا ہے۔ ایمانداری کی بات ہے میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں جسے نوجوانی کہنا نوجوانی کی توہین ہوگا......اور پھر میری جو جسمانی حالت ہو چکی ہے، اس میں میں گھڑی کی سوئیوں کو الٹا چلانے کے نااہل ہو چکا ہوں کیونکہ میں ناگزیر طور پر اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں طبعی وقت اور انسانی زندگی کا دورانیہ ایک دوسرے سے گلے ملنے لگتے ہیں۔ لیکن جب تک مجھ میں اپنا اوبی (Obi=ایک قسم کا جاپانی کمر بند) باندھنے اور دو پاؤں پر چلنے کی ہمت ہے، میرے لیے لازمی ہے کہ میں مزید تاخیر کے بغیر سائیکل پر سواری کرنا سیکھ لوں۔

آج، یعنی سال کے پہلے دن، مجھے اپنے پہلے سبق کا موقع مل رہا ہے۔

میری رہائش گاہ کے عقب میں چھوٹا سا خالی میدان ہے۔ وہاں استعمال شدہ بائیسکل اور میری استاد میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میری استاد دراصل ایک نوعمر لڑکی ہے۔ وہ

میرے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔

''او جی سان! آپ کہاں ہیں؟ آپ ابھی تیار نہیں ہوئے؟''

مجھے اس کی آواز کھڑکی کے باہر سنائی دے رہی ہے۔ وہ اب تک مجھے دو تین مرتبہ مخاطب کر چکی ہے۔ میں جلدی جلدی اپنا مشروب ختم کرتا ہوں۔ اپنے پرانے ساق پوش اور ٹینس شو پہنتا ہوں اور اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ اس قسم کے موقع پر مزاحیہ نظمیں کہنے کے لیے کس کے پاس وقت ہوتا ہے؟

جن لوگوں کو مرکزی ٹوکیو کے قدیم اور گنجان آباد گلی کوچوں سے آگاہی ہے، انہیں یاد ہوگا کہ اگر آدمی کسی عقبی گلی میں بدرووں کے ڈھکنوں کے ساتھ ساتھ چلتا جائے تو انجام کار وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں گلی تنگ اور ختم ہونے لگتی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہاں اسے کوئی خاصا فراخ خالی میدان بھی مل جائے۔ یہ میدان اکثر خاصے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور انہیں رنگ ریزوں جیسے لوگ، جو وہاں کمونو کے تھان بچھا دیتے ہیں، استعمال کرتے ہیں۔ آج کل یہ میدان بس کہیں کہیں رہ گئے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر شہر کی نواحی بستیوں میں ہی ملتے ہیں۔ میں جس عقبی میدان کا ذکر رہا ہوں وہاں اگرچہ کوئی رنگ ریز تو نظر نہیں آتا لیکن وہ ان چند ایک میدانوں میں ضرور شامل ہے جو باقی رہ گئے ہیں۔

بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ اس کا مالک کوئی نہیں اور عام طور پر اس میں بہت کم لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ البتہ گرمیوں کی بات اور تھی۔ تب وہاں سومو کشتیوں کا اکھاڑا بنا لیا جاتا تھا اور شام کو محلے کے بچے کشتی کی مشق کرنے آجاتے تھے۔ چنانچہ خزاں کے آغاز تک وہاں خوب لہر بہر رہتی تھی۔ تاہم سال کے ان مہینوں میں وہاں ہل چلا دیا گیا تھا اور سبزیوں کے قطعے کے ساتھ، جسے محلے کی انجمن محبان وطن نے کاشت کر رکھا تھا، بموں سے بچنے کی پناہ گاہوں کے طور پر مورچے کھود دیئے گئے تھے۔ وہاں سائیکل چلانے کی مشق کرنے کے لیے کافی جگہ تھی اور ہل چلانے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ کناروں کے ساتھ ساتھ زمین نرم ہو گئی تھی۔ یوں اگر آدمی سائیکل سے نیچے گر پڑتا تو اسے چوٹ آنے کا احتمال کم ہی تھا۔

میری رہائش گاہ مشرقی کنارے کے عقب میں واقع تھی۔ جنوبی جانب کوتاہ

قامت چٹان تھی لیکن وہ میدان کے مقابلے میں خاصی اونچی دکھائی دیتی تھی۔ شمالی جانب گلی تھی جو اس سڑک سے جاملتی تھی جس پر ٹرام چلتی تھی۔ مغربی طرف سات آٹھ مکانوں کے عقبی دروازے تھے۔ ان مکانوں کے سامنے کے حصے بڑی سڑک کی جانب کھلتے تھے اور دکانوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انہی دکانوں میں ایک سائیکلوں کی دکان تھی۔

ویسے دکان کبھی کی بند ہو چکی تھی اور اس کا مالک، جسے مسلح افواج کے غیر عسکری شعبے میں لازمی بھرتی کے قانون کے تحت شامل کر لیا گیا تھا، ہر صبح ٹرام پر اسلحہ سازی کے کارخانے میں جاتا تھا جو ریلوے لائن کے قریب واقع تھا۔ اب اس کی دکان میں صرف دو پرانی سائیکلیں باقی رہ گئی تھیں۔ یہ کہ وہ ان میں سے ایک مجھے ادھار پٹے پر دینے کے لیے تیار تھا، اس کا سبب اس کی فیاضی تھی۔ یہ شخص پچاس کے پیٹے میں داخل ہو چکا تھا لیکن ہم باقیوں کی نسبت کہیں زیادہ صحت مند اور ہٹا کٹا دکھائی دیتا تھا...... پتا نہیں کیوں؟ بائیسکل کو پرانی کہنا اس کے ساتھ زیادتی کرنا تھا۔ دراصل اس کے لیے ٹوٹی پھوٹی کا لفظ کہیں زیادہ موزوں تھا۔ تاہم اس کی عمر اور خستہ حالت نے مجھ جیسے نو آموز کے لیے اسے بہت کار آمد بنا دیا تھا۔ اس کے مالک اور میرے مابین سمجھوتا طے پا گیا کہ جونہی میں نے سائیکل سواری کے رموز سیکھ لیے اور ان پر عبور حاصل کر لیا، وہ ''خصوصی رعایت'' کے تحت اسے دس ین ماہوار کی قسط پر مجھے فروخت کر دے گا۔ میں اس سے بہتر سودے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مزید برآں اس کی ایک سولہ سالہ بیٹی تھی اور یہی وہ دوشیزہ تھی جس نے رضا کارانہ مجھے اپنا شاگرد بنانے کی پیشکش کی تھی۔ حالانکہ یہ لڑکی فطرتاً معصوم تھی اور اس کے اعضاء نرم و ملائم تھے، لیکن کسی بھی کینہ پرور شخص کو، جو اس میں نقائص ڈھونڈنے کے درپے ہوتا، جھٹ معلوم ہو جاتا کہ اس کی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ کی نسبت چھوٹی ہے۔ اسے اپنا کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود محلے کے بعض ناتراشیدہ اور شوخ چشم لوگ شکایت کرتے رہتے تھے کہ اسے غیر عسکری فرائض انجام دینے والے نسوانی شعبے میں بھرتی نہیں کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ لنگڑا کر چلتی ہے۔

مانا کہ جب وہ بھاگنے کی کوشش کرتی تھی، وہ اپنی ٹانگ گھسیٹ کر چلتی تھی لیکن اس کا لنگ بمشکل نظر آتا تھا اور لگتا تھا کہ یہ اس کے لیے کسی تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ جب ایک مرتبہ وہ سائیکل پر سوار ہو جاتی (اس کام میں اسے زبردست مہارت حاصل

تھی) تو وہ اپنے دونوں ہاتھ فضا میں اچھال دیتی اور دائرے میں یوں چکر کاٹنے لگتی (اور یہ دائرے بتدریج چھوٹے سے چھوٹے ہوتے چلے جاتے) جیسے ہوا کے دوش پر چیری کے پھول کی پتی پھڑ پھڑا رہی ہو۔ اس میں گھڑ سواروں کی نفاست، سلیقہ اور توازن تھا۔ جن لوگوں نے اسے بائیسکل چلاتے دیکھا ہے، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ بائیسکل صحیح معنوں میں اس کی ٹانگیں تھیں۔

نئے سال کے پہلے روز کے اولین اسباق کے دوران میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کے ذکر سے میری بڑائی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ لڑکی کی ہدایات کامل اور بے عیب تھیں، لیکن چونکہ میرے لیے یہ نیا کام تھا، میرا بیشتر وقت سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے زمین پر گرنے میں صرف ہوا۔ میں نو آموز تھا اور بائیسکل میرا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ میں گرتا لیکن گھبرائے یا خوف کھائے بغیر اٹھ کھڑا ہوتا۔ لیکن بائیسکل پر میری اس دیدہ دلیری کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ جب میں دوبارہ اس پر بیٹھتا، وہ جھٹ مجھے نیچے پٹخ دیتی۔ میں نے اسے منانے، اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی لاکھ کوششیں کیں۔ صبر و تحمل کا دامن جھٹک کر اس پر زبردستی حاوی ہونا چاہا لیکن وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور مجھے یوں نیچے پھینکتی رہی جیسے میں آدمی نہیں، غیر ضروری فرنیچر کی طرح کوئی بیکار چیز ہوں جس کا پھینک دینا ہی بہتر ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس ضدی اور سرکش مخلوق سے، جس پر نہ میری منت سماجت اور نہ دھمکیاں اثر انداز ہو رہی تھیں، کس طرح نپٹوں۔ میرا پسینا چھوٹنے لگا۔ میرے کپڑے کیچڑ سے تربتر ہو گئے۔ میرے ہاتھوں پر خراشیں آ گئیں اور ان پر جگہ جگہ گھاؤ پڑ گئے۔ بعض اوقات جب میں گرتا تو میں اتنا نڈھال ہو چکا ہوتا کہ میرے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا۔ اور گویا کہ یہ میری اذیت کی محض ابتداء تھی۔ مزید ستم ڈھانے کے لیے محلے کے چاروں کونوں کھدروں سے بچے بھی آ گئے۔ انہوں نے میرے ارد گرد حصار بنا لیا اور جب بھی میں لڑھکنی کھا کر نیچے گرتا، وہ اپنی پر مسرت چیخ چنگھاڑ سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔

بچے اتنی زیادہ تعداد میں اکٹھا ہو گئے تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ کہاں چھپے ہوئے تھے۔ میں کسی زمانے میں ایک فرانسیسی کو جانتا تھا۔ وہ بے چارہ جاپان میں جہاں بھی جاتا، بچوں کے غول کے غول اس کے گرد ہجوم کر لیتے۔ وہ ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتا،

بس بے بسی سے اپنے بازو فضا میں اچھال دیتا اور چلانے لگتا "Des gosses, des gosses!" (''بچاؤ، بچاؤ، مجھے ان لونڈوں سے بچاؤ!'')

اسی طرح یہاں بھی بے شمار بچے جمع ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں یہ کہاں سے ٹپک پڑے تھے کیونکہ (جنگ کے پیش نظر) ان کی اچھی خاصی تعداد پہلے ہی دیہات میں پہنچائی جا چکی تھی۔ ان کی موجودگی بار خاطر تھی۔ لیکن جس چیز نے میرے پر سو درے کا کام کیا، وہ یہ تھی کہ نوعمر لڑکی بھی، جس پر میں اتنا انحصار کر رہا تھا، ان کی صف میں شامل ہو گئی اور عالم مسرت میں تالیاں پیٹ پیٹ کر میرا مذاق اڑانے لگی۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ آگے بڑھی، بائیسکل پر جھپٹی، پھدک کر اس پر سوار ہوئی اور خود اسے چلانے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں آنے کے بعد اڑیل مشین میں نئی جان پڑ گئی ہے اور وہ سدھائے ہوئے ٹٹو کی طرح حسب ہدایت دائرے میں چکر کاٹنے لگی ہے۔ میں نے اپنا تھکا ہوا جسم زمین سے اٹھایا اور اپنے کپڑوں سے گرد و غبار جھاڑنے لگا۔

''آج اتنا ہی کافی ہے۔ کافی، کافی......''

تاہم میں مستقل مزاجی سے سبق لیتا رہا۔ جب کبھی موسم ساز گار ہوتا، میں عقبی میدان میں مشق کرنے چلا جاتا۔ لیکن اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، میرا بے ڈھنگا پن ختم نہ ہوا اور میں رتی برابر ترقی نہ کر سکا۔ بائیسکل میرا ٹھٹھا اڑاتی رہی لیکن آخر اتنا ضرور ہوا کہ میں نے گرنے کے فن میں مہارت حاصل کر لی۔ اب مجھے نہ تو کوئی چوٹ آتی تھی اور نہ کوئی خاص تکلیف ہوتی تھی۔

جہاں تک بچوں کا تعلق ہے، چند ہی دنوں میں ان کا آنا جانا بند ہو گیا۔ سردی بڑھ گئی تھی اور ان کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار ان میں سے کسی کے ماں یا باپ کا میدان میں سے گزر ہوتا لیکن بالغ ہمیشہ جلدی میں ہوتے تھے اور وہ میرے اسباق کو پر کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ نوعمر دوشیزہ بڑے صبر و تحمل سے مجھے فن کی مبادیات سکھاتی رہی لیکن چونکہ اسے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی کوئی مجبوری نہیں تھی، میں اکیلا ہی بائیسکل کے ساتھ کئی کئی گھنٹے نبرد آزما ہوتا رہتا۔

جب میں اکیلا رہ جاتا، بائیسکل بدخواہانہ، بلکہ تقریباً قاتلانہ، وتیرہ اختیار کر لیتی اور جب میں منہ سے دھول تھوک رہا ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے موت و حیات کی کشمکش

میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ہر روشن صبح کا ایک گھنٹہ اس کے ساتھ کیوں گزارتا ہوں یا میں نے یہ کام اپنے ذمے لیا ہی کیوں ہے۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ میں اپنے بستر پر پاؤں پسارے نیند کے جومزے لوٹا کرتا تھا، اس کی میعاد میں اس گھنٹے نے تخفیف کر دی ہے اور یہ بائیسکل مجھے کسی متشدد، تقریباً قاتلانہ کارروائی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ جب تک میں تھک ہار کر زمین پر نہ گر پڑتا، سب کچھ بھول جاتا تھا۔

کسی اجنبی کو میرا رویہ شاید مضحکہ خیز معلوم ہو، لیکن یہ عقبی میدان دنیا کے شور و شغب سے دور پرسکون علاقے میں واقع تھا اور وہاں مشق کرنے سے مجھے کسی قسم کی خفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اگرچہ جنوب کی جانب چٹان کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے یہ میدان مختصر ترین راستہ فراہم کرتا تھا، عام طور پر کوئی شخص بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا کیونکہ یہاں ہر وقت ٹھنڈی بادشمال چلتی رہتی تھی۔ زمین ننگی بچی اور یخ بستہ تھی، بانس کے پودے مرجھا چکے تھے اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ ہاں، کبھی کبھار ایک بوڑھا آدمی ضرور ادھر آ نکلتا تھا۔ وہ چٹان کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے یہ سیدھا راستہ اختیار کرتا تھا۔

اگرچہ میں نے اس شخص کو بوڑھا کہا ہے لیکن اس میں بوڑھوں کی قدامت پسندی نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ سیدھا تن کر چلتا تھا، اس کے سر پر سیاہ پشمینے کی ٹوپی ہوتی تھی۔ اس کے پہننے سے اس کے سفید ریشمی بالوں پر شباب آ جاتا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ کوٹ ہوتا تھا اور وہ اپنی ٹانگوں پر اس قسم کی نفیس ٹویڈ کی پتلون لپیٹے ہوتا تھا جو جنگ سے پہلے دستیاب ہوتی تھی۔ اس کے پاؤں میں نیچی ایڑی کی گھسی ہوئی کھڑاؤں ہوتی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ میں چھتری اور کبھی کوڈک کیمرے کا چرمی بیگ ہوتا تھا اور وہ اس میدان کی خشک گھاس پر خاصے تیز قدموں سے چلا کرتا تھا۔ فی الحال میں اس بزرگ شخصیت کی شناخت مسٹر گوکا (Guka) یعنی ''کنول'' کی حیثیت سے کرانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

گوکا بڑا نامور شاعر ہے۔ وہ مجھ سے پانچ چھ بلاک دور ایک پرسکون گلی کے آخری سرے پر رہتا ہے۔ وہ اسے ''دارالرابطہ'' کہتا ہے۔ عام لوگوں کو اگرچہ مطلق علم نہیں کہ گوکا نے گزشتہ دہائی کے دوران میں شاعری کے میدان میں کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں، تاہم اس کے متعلق افواہیں ان تک بھی پہنچ چکی ہیں کہ وہ اپنے محل نما مکان میں

شاعرانہ زندگی بسر کرتا ہے ہمارے معاشرے کی بدعنوانیوں اور بے راہ رویوں کی مذمت میں، جن کا عام دعویٰ کیا جاتا ہے، ایک لفظ بھی کہنے کا روادار نہیں۔ اس نے اپنے دروازے ہماشما کے لیے بند کر رکھے ہیں اور ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا سروکار رکھنے سے انکاری ہے۔

میں چونکہ صحیح معنوں میں کسی بھی پیشے سے وابستہ نہیں ہوں، اپنا بھرم برقرار رکھنے کے لئے میں دعویٰ کرتا رہتا ہوں کہ ''بلحاظ پیشہ میں لکھاری'' ہوں۔ لیکن سچ پوچھیں تو جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کی حیثیت سراسر مشتبہ ہے اور چونکہ میں پیدائشی طور پر کاہل اور سست الوجود واقع ہوا ہوں اس لیے میں محض سطحی اور فاقہ مست فنکار کا مقام حاصل کر سکا ہوں۔ میں اتنا تن آسان ہوں کہ میں گوکا کی تصنیفات کے مطالعے کی خاطر لائبریری کا چکر لگانے کے لئے بھی اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا اور مجھے محض دوسروں سے سنی سنائی باتوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ کہنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ ''کنول'' اکیلا رہتا ہے اور وہ کوئی ایسا فن پارہ تخلیق کرنے میں مصروف ہے جسے وہ فی الحال دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام خود ہی کرتا ہے اور جب بعض مواقع پر کوئی بے ذوق شخص گھومتا گھماتا بلا اجازت اس کے بیرونی گیٹ کو پار کر کے صحن میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور مکان کے اندرونی دروازے پر دستک دیتا ہے تو مسٹر گوکا خود آتا ہے، پٹ کی آڑ میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے یہ بتا کر کہ ''کنول گھر پر نہیں'' واپس بھیج دیتا ہے۔

اگر واقعی اس کا یہی دستور ہے تو حالانکہ میں اس کے گھر کے قریب رہتا ہوں، میں کبھی اس کے جنگلے کے اندر جھانکنے اور اس کے گھر کے بیرونی گیٹ اور اندرونی دروازے کے مابین پرخطر جگہ پر قدم دھرنے کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں اور نہ مجھے اس قسم کا تجسس ہے۔ جب کبھی سرراہے میری اس سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے، میں اسے دل ہی دل میں سلام عرض کرتا ہوں۔ میں نے نہ تو اس سے کبھی کوئی بات کی ہے اور نہ اپنی ٹوپی اتارنے جیسی کوئی فضول حرکت کی ہے۔ صحیح معنوں میں ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور جب کبھی وہ سیر پر نکلتا ہے تو اسے علم ہی نہیں ہو پاتا کہ میں چٹان کے نیچے خالی میدان میں سائیکل چلانے کی مشق کر رہا ہوں۔ وہ بس آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ میں بھی بڑے

مزے سے اپنے کام میں مگن رہتا ہوں اور اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دیتا۔

ہاں، ایک بات سے مجھے ضرور پریشانی ہوتی ہے مگر اس کا تعلق گوکا کی شاعری سے نہیں بلکہ اس کی کھڑاؤں سے ہے۔ میں نے سنا ہے اپنے اچھے دنوں میں وہ اپنے لباس کی جزئیات پر پورا دھیان دیتا تھا اور کھڑاؤں صرف کمونو کے ساتھ پہننے پر اصرار کرتا تھا۔ کسی فنکار کی زندگی کے واقعات کے سلسلے وار بیان میں اس زمانے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جب وہ مغربی لباس کے ساتھ کھڑاؤں پہننا شروع کر دیتا ہے، لیکن میرا اٹکل پچو اندازہ ہے کہ مسٹر گوکا کی یہ اختراع حال ہی میں وجود میں آئی ہے، اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی روحانی قوتوں میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے۔ جب اس کے ملبوسات کی چمک دمک ماند پڑنے لگی اور اس کی کھڑاؤں گھسنے اور بوسیدہ ہونے لگیں تو وہ برق رفتاری کے ساتھ —— کم از کم ادبی میدان میں —— آگے بڑھنے لگا۔ ابتدا میں ولایتی سوٹ اور کھڑاؤں کے جوڑ کو نرالا قرار دیا گیا اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ لوگ اس کی اس وضع کو دیکھ کر دل کھول کر قہقہے لگاتے تھے۔ مگر آج یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ فیشن کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دنیا گوکا کی کھڑاؤں کا ساتھ دینے کے لیے اتنی تیزی سے بھاگنے لگی ہے کہ اسکی سانس پھولنے لگی ہے۔ تاہم شاعر جس رفتار سے آگے بڑھتے ہیں، آدمی خواہ کتنا ہی چوکس کیوں نہ ہو، وہ ان کا ساتھ دینے سے قاصر رہتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو ویسے ہی اس سے بہت جونیئر ہوں، چنانچہ میں دنیا سے بھی بہت پیچھے رہ گیا ہوں جو خود اس سے کہیں پیچھے رہ گئی ہے۔ میں نے سائیکل سواری کے اسباق ابھی حال ہی میں شروع کئے ہیں اور سولہ سال کی بچی کو اس پر جو پہلے ہی عبور حاصل ہو چکا ہے، میں ابھی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔ مجھے اپنے آپ پر بڑی شرم آنے لگی ہے۔

اور اگرچہ میری اور گوکا کی زندگیوں کے مابین کوئی باہمی ربط موجود نہیں، اس کے باوجود شاید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کھڑاؤں اور میری بائیسکل کے مابین تعلق بالکل ہی عنقا بھی نہیں۔ زندگی کا جو سفر اس نے ایک دہائی میں طے کیا ہے، مجھے لازماً اسے چند گھنٹوں میں سمونا ہو گا۔

چینی کہاوت ہے کہ سردی اور مفلوک الحالی آدمی کو روشن طبع اور پھرتیلا بنا دیتی

ہے۔ جہاں تک سردی اور غربت کا تعلق ہے، ان کی مار جتنا مجھے برداشت کرنا پڑتی ہے، کوئی دوسرا شخص اس کی ہمسری نہیں کرسکتا، لیکن جہاں تک روشنی طبع اور چستی چالاکی کا تعلق ہے، مجھے اپنے اوپر قطعاً کوئی اعتماد نہیں...... اگر کہاوت یہ ہوتی کہ سردی اور غربت آدمی کا بھرکس نکال دیتی ہیں اور اسے جاہل بنا دیتی ہیں، پھر یہ مجھ پر کتنی صادق آتی!

جب میں عمودی چٹان کے نیچے کھڑا گوکا کو نگاہیں گاڑ کر دیکھ رہا ہوتا تو کیا یہ محض جھوٹا پندار یا شکست تسلیم کرنے کی نااہلیت تھی جو مجھ سے کہلواتی رہتی:

''لعنت ہو تم پر، گوکا؟'' کبھی کبھار اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیتا اور ''دارالرابطہ'' کے مالک کا بغور جائزہ لینے لگتا۔ کیا یہ محض نری پری خوش فہمی تھی یا وہ واقعی رک کر میری طرف دیکھ لیتا تھا؟ شاید ہم دونوں کے مابین کوئی نہ کوئی تعلق بہرحال ہے!

پھر بھی جب اس کی کھڑاؤں (چین کے) قدیم شاہی خاندان چو (Chou 1027 ق م تا 221 ق م) کے جلیل القدر شہنشاہ مووانگ (Mu Wang) کے آٹھ برق رفتار ناآختہ گھوڑوں کی مانند روئے زمین پر اڑاتی جاتی تھیں تو میری بائیسکل ایک گز لمبی قوس بھی نہیں بنا پاتی تھی۔ ہم دونوں کے مابین فاصلہ کم کرنے کے لیے مجھے وقت کے وقت ترکیب سوچنا پڑی۔ میری صلاحیتیں محدود سہی لیکن مجھے عملی منصوبہ سوجھ ہی گیا۔ یہ بے انتہا سیدھا سادھا اور آسان تھا: میں ہر صبح گہری سانس کی ورزش کیا کروں گا۔

جن دنوں میری صبح سویرے آنکھ کھل جاتی، میں پو پھٹنے پر گھر سے باہر نکل جاتا اور اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے اور باہر نکالنے لگتا۔ نوخیز لڑکی ابھی سو رہی ہوتی اور گوکا نے ابھی آنا ہوتا۔ عقبی میدان صرف میرے قبضے میں ہوتا۔ صبح کو طلوع ہوتے آفتاب کی خنک روشنی میں یخ بستہ شہر دھندلا دھندلا دکھائی دیتا۔ آسمان پر بادل اکٹھے ہو جاتے اور آہستہ آہستہ کچھ اس طرح جگمگاتے شعلوں کی طرح سرخ ہو جاتے جیسے وہ اپنی مشرقی روشنی میں میرے جسم کے انگ انگ کو گرم کر دینا چاہتے ہوں۔ جب ہوا کے تھپیڑے مجھ سے ٹکراتے، میں اپنا سینہ پھیلا دیتا، منہ کھول لیتا اور زور زور سے اندر باہر سانس کھینچنے لگتا۔

صبح کے آسمان پر تین نیلی، سفید اور سرخ دھاریاں نمودار ہو جاتیں۔ یہ نہ ہوا سے اور نہ روشنی سے مشابہ ہوتیں۔ یہ آسمان پر دوڑتی آپس میں گتھم گتھا ہو جاتیں اور یوں میرے منہ میں داخل ہو جاتیں جیسے کسی نے نشانہ باندھ کر انہیں عمداً وہاں بھیجا ہو۔ جونہی

ان کی خنکی میری زبان کو چیرتی اور میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی، میرا جسم ٹھنڈا ہو جاتا اور مجھے اپنے اندر کی بے تابی، جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ اپنے نتھوں سے نکلتی محسوس ہونے لگتی۔ یہی وہ چیز ہے جسے جادوگری کے چینی آرٹ میں Tai-Su Nei Ching یا ''عظیم اصول کا داخلی ادراک'' کہا جاتا ہے۔ مجھے حاصل کیا ہوتا؟ میرا جسم پہلے کی نسبت ہلکا پھلکا ہو جاتا اور جسم کی یہ کیفیت سائیکل سوار کے لیے بہت سہولت بخش ہوتی ہے۔ میں چونکہ ابھی تک تاؤ (Tao) کے اس فن سے ناآشنا تھا، چنانچہ میری نئی کیفیت صرف چند ثانیے برقرار رہتی تھی۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس لمحے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے آلہ سدس (Sextant) مل گیا ہو۔ اس کی سوئی درست کر کے مجھے نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا کہ گوکا کس طرح زمینی وقت کو پھلانگتا چلا آ رہا ہے۔ بلکہ میں اس پھرتی کو بھی ماپ لیتا جس سے نوخیز لڑکی بائیسکل چلاتی تھی۔

اتفاق سے مجھے ایک اور چیز معلوم ہوگئی۔ ہوا یہ کہ میں خاصی رات گزر جانے کے بعد بھی بائیسکل چلانے کی مشق کرنے لگا۔ یہ وہ اوقات تھے جب کل عالم نیند کی آغوش میں لیٹا ہوا تھا، حالانکہ مردوں کو اس وقت شاذ ہی اپنے تکیوں پر آرام سے سونے کا موقع ملتا ہوگا۔ جب سائرن دہاڑنے لگتے، میں بھی اپنا لحاف ٹھوکر مار کر ایک طرف پھینک دیتا۔ بستر سے چھلانگ لگاتا، اندھیرے میں اپنے ساق پوش (بلاشبہ الٹے) پہنتا، ہاتھ میں آگ بجھانے والوں کا کلہاڑا پکڑتا اور بارش کا پانی اکٹھا کرنے والے پیپوں کی برف توڑنے اندھا دھند باہر بھاگ نکلتا۔ اگر حملے کے سبب کوئی حادثہ رونما نہ ہوتا، میں دوبارہ بستر میں گھسنے کے بجائے میدان کا رخ کرتا اور بائیسکل چلانے کی مشق کرنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ کسی نہ کسی طور میں اس وقت دوسرے اوقات کی نسبت یہ کام زیادہ احسن طریقے سے سر انجام دے رہا ہوں اور اپنے آپ کو یہ سوچ کر فریب دینے لگتا کہ میں دن کے دوران میں جو ایک گھنٹہ بیکار محنت مشقت میں ضائع کرتا ہوں، اب پندرہ منٹ میں اس کی تلافی ہوگئی ہے۔

رات کو مشق کرنے کے لئے چاندنی کی ضرورت پیش آتی ہے اور پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ چاند کتنا چمکیلا ہوتا ہے۔ ایک مشہور کائیو کا نظم میں شاعر نے سمجھایا ہے کہ آدمی کو زندگی سے چاول کے پورے پیالے اور چاندنی رات سے زیادہ کسی چیز کا ''مطالبہ

کرنے'' (Moshikane) کی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔ پھر اس ذو معنی لفظ کو مزاحیہ انداز سے استعمال کرتے ہوئے وہ کہتا ہے ''شاید روپیہ (Moshi kane) بھی قابل تمنا ہو سکتا ہے۔ روپیہ پیسا تو خیر چھوڑیں، اس زمانے میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو چاول کا پیالہ اور چاندانی رات کے مل جانے پر شکر نہ ادا کرتا ہوگا۔ سرِشام ہی بتیاں گل کر دی جاتی تھیں اور اتنا گہرا اندھیرا ہوتا تھا کہ آدمی کو ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لیے زمین میں کھودے گئے مورچوں کی تلاش میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھانا پڑتی تھیں۔

ایک رات مختصر نیند کے بعد میں گھر سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ چاند نکل آیا ہے اور اس کی روشنی میں سارا عقبی میدان نہایا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ پرانی بائیسکل میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے۔ اس کے وہ حصے بھی، جو رگڑیں کھا کر رنگ سے محروم ہو چکے تھے، کچھ اس طرح چمک رہے تھے جیسے ان کا اصل رنگ جوں کا توں برقرار ہو۔ اور اگرچہ اس کے وہ حصے، جنہیں کروم کے محلول سے شفاف اور چمکدار بنا دیا گیا تھا، برف کی مانند اتنے ٹھنڈے تھے کہ اگر ان پر انگلی رکھ دی جاتی تو وہ فوراً یخ بستہ ہو جاتی اور اس میں تریڑیں پڑ جاتیں، اس کے ہینڈل کی آب و تاب اور چمک دمک دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا اور میں چھلانگ لگا کر کاٹھی پر سوار ہو گیا۔

جب میں بائیسکل چلا رہا تھا، اس کے پہیے بالکل اسی طرح دائرے میں چکر کاٹنے لگے جس طرح فوارے کے پانی کے قطرے گردش کرتے ہیں۔ وہ دیوانہ وار گھوم رہے تھے اور اپنی رفتار بڑھائے جا رہے تھے تا آنکہ کچھ ہی دیر بعد میں سوچنے لگا کہ یہ بائیسکل مجھے کہاں پہنچا کر دم لے گی۔ جھلملاتے رنگ، بدلتے قیمتی پتھر! ماہتابی جواہر! یہ کتنی نایاب چیزیں ہیں! میرے ہاتھوں کی مہین گرفت میں جو جواہر تھے، وہ خالص چاندانی کے شکستہ اجزا تھے جن کی بائیسکل کے ہینڈل پر بارش ہو رہی تھی۔ اس بائیسکل کو مطیع بنا کر کتنا لطف آئے گا ـــــ اگر پوری طرح نہیں تو لڑکی سے آدھا ہی سہی ـــــ تیز تر ـــــ آدھا، تہائی یا چوتھائی سیکنڈ تیز تر ـــــ بائیسکل، تمہارے ساتھ زور آزمائی کرتے مجھے کس کس عذاب سے گزرنا پڑا ـــــ اب موقع آ گیا ہے کہ میں تم پر فطری، ہموار اور خوبصورت انداز سے سواری کروں ـــــ اب ہم یہاں نہیں ـــــ کبھی تھے ـــــ مگر یہ بہت پرانی بات ہے ـــــ ایک مغربی شاعر بھی انتباہ کر چکا ہے ـــــ ''اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ کوئی

چیز ہمیں اتنی تیزی سے بربریت کے راستے پر ڈال سکتی ہے جتنا کہ روحانی پاکیزگی کا تصور پورے انہاک سے اپنانے پر ہوسکتا ہے......''

''او جی سان! پکڑے رہو۔ مضبوطی سے پکڑے رہو۔''

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میری اتالیق میدان میں آ چکی ہے اور پیچھے سے مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ وہ زور دے کر کہہ رہی تھی کہ میں اپنا کام جاری رکھوں۔ میں خود کو کتنا پُراعتماد محسوس کر رہا تھا...... میں چکر پر چکر.......... چکر پر چکر لگائے جا رہا تھا.......... تا آنکہ ایک ہاتھ کا توازن بگڑ گیا......نہیں، نہیں...... اور میں دھڑام سے زمین پر آ گرا۔

اس سال معمول سے کچھ زیادہ ہی برف باری ہوئی: اتنی سردی شاید ہی پہلے کبھی پڑی ہو۔ علاوہ ازیں آگ لگنے کے بھی متعدد واقعات پیش آئے۔ آسمان اکثر شعلوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ میرے عزم کے باوجود ہر رات مشق جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔ جنوری اور فروری کے مہینے آئے اور گزر گئے اور مارچ کے آغاز تک میں بائیسکل سے مانوس ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ مادی چیز تھی، یہ میرے ساتھ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مروت برتنے لگی تھی۔ اب میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں ہاتھ چھوڑ کر اسے چلا سکتا تھا۔ جب تک میں اس پر اپنا توازن برقرار رکھ سکتا، میں اس پر تقریباً پورا گھنٹہ ڈٹا رہتا۔

مزید برآں بائیسکل میری ملکیت میں آنے کے عمل میں سے گزرنے لگی تھی۔ میں اس کے مالک کے ساتھ بات کر چکا تھا اور ہمارے سابقہ معاہدے کی رو سے اسے دس ین ماہوار کی اقساط کی ادائیگی پر میری ہو جانا تھا۔ میں نے پہلی قسط یکم مارچ کو ادا کر دی۔ مالک کے مطالبے کے مطابق مجھے اس کی دیکھ بھال کے لیے ہر مہینے مزید دس ین ادا کرنا تھے۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بائیسکل کتنی قدیم ہو گی۔ میرے پاس یہ واحد سواری تھی اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں اسے بتا سکتا کہ یہ مزید اخراجات کی مستحق نہیں۔

مارچ کے پہلے ہفتے کے دوران میں ایک شب تیز ہوا چلنے لگی اور جوں جوں رات گزرتی گئی، توں توں اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب یہ بالکل ہی آندھی بن گئی تو فضائی حملے کے سائرن بجنے لگے۔ میرے پڑوس کے لوگ اپنے بستروں سے اچھل کر نکل پڑے۔ ان معاملات میں ہمارے اندر چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی اور یوں ہمیں بے

وقت اٹھنے میں کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ ہم اسے ناگہانی آفت سمجھتے تھے۔ جب میں میدان میں پہنچا، وہاں اچھا خاصا ہجوم جمع ہو چکا تھا اور ہر شخص حملے سے نپٹنے کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ لوگ اپنی اشیاء پناہ گاہوں میں لے آئے تھے اور وہاں انہوں نے ایک دوسرے کے اوپر ان کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ تیز آندھی میں ریڈیو کڑکڑا رہا تھا۔ آگ بجھانے کا پانی پائپ ایک طرف پڑا تھا اور اس کے قریب ایک دستی پمپ رکھا ہوا تھا۔

شہر کے اوپر افق پر سرخ روشنی پھیل گئی اور جب ہم ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے، آگ پھیل گئی اور ہمارے اور شعلوں کے مابین فاصلہ کم کرنے لگی۔ تیز ہوا نے آگ کو بھڑکا دیا تھا اور یہ مجنونانہ انداز سے ناچنے اور بے قابو ہونے لگی تھی۔ شعلے اب شہر تک محدود نہیں رہ گئے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں بھی یہاں وہاں آگ بھڑکنے لگی تھی۔ آسمان پر نحوست سے پر روشنی پھیل چکی تھی۔ اس سے لوگوں کے چہرے، جو وہاں اکٹھے ہو گئے تھے، بلکہ ہمارے ملبوسات کے رنگ بھی، بالکل نمایاں ہو گئے تھے۔ ہمارے سروں کے اوپر چنگاریاں چکر کاٹ رہی تھیں۔

میں اپنی رہائش گاہ کے عقبی دروازے کی طرف، جہاں میں عام طور پر بائیسکل کھڑی کرتا تھا، واپس چل پڑا۔ آگ بجھانے کی بالٹیاں پانی سے بھری ہوئی تھیں اور عمارت کو بچانے کے لئے تیار تھیں۔ میرے پاس کوئی ایسی خاندانی یادگار نہیں تھی جسے مجھے کمرے سے اٹھانا پڑتا۔ اس کے علاوہ میں اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قریبی شعلے ہمارے گھروں تک پہنچ نہیں پائیں گے۔ حفاظتی اقدامات اپنا رنگ دکھائیں گے اور آگ چھوٹے سے رقبے تک محدود رہے گی۔ پھر بھی آدمی اپنی چوکسی میں سستی نہیں دکھا سکتا تھا، ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ نوخیز لڑکی میرے پاس کھڑی ہے۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پیچھے آ گئی تھی اور کاٹھی کے ساتھ ٹیک لگا کر بائیسکل کا دباؤ مجھ پر ڈال رہی تھی۔ وہ پورے انہماک سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس نے اپنی زبان بند کر رکھی تھی۔ اگرچہ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے اسے خوف چھو کر بھی نہ گزرا ہو، یہ کیسا مبہم سا دھڑکا تھا کہ اس کے شانے ہلکے ہلکے کپکپانے لگے تھے؟ تب مجھے پہلی مرتبہ پوری طرح سمجھ میں آیا کہ اس کی دائیں ٹانگ نارمل نہیں ہے۔ اب وہ نوخیز لڑکی نہیں تھی جو بڑی آسانی اور

روانی سے بائیسکل چلایا کرتی تھی بلکہ وہ قابلِ رحم نوجوان خاتون تھی جس کا لنگ ساری زندگی اسے معذور بنائے رکھے گا۔

میں یہ بھول گیا کہ میں کوئی بھی کام کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوں اور وہیں کھڑے کھڑے تہیہ کر لیا کہ اگر کوئی بحرانی صورت حال پیدا ہوئی تو میرے پاس اس دنیا میں اپنی جو واحد پونجی............ یعنی نایاب اور پرانی کتابوں کا ذخیرہ............ ہے اور جسے میں اپنے فلیٹ میں رکھتا ہوں، تو میں ان کی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ اس بچی کو بچانے کی غرض سے میں اسے اپنی بائیسکل پر بٹھاؤں گا اور دنیا کے آخری کونے تک لے جاؤں گا۔

خوش قسمتی سے اس عزم کو عملی جامہ پہنچانے کی نوبت نہ آئی۔ پو پھٹنے تک پڑوس کی تمام آگ بجھائی جا چکی تھی اور ہمارے محلے میں ایک بھی شخص نہ تو ہلاک اور نہ زخمی ہوا تھا۔ شہر کے اوپر آسمان کا رنگ جس طرح پھیکا پڑا تھا، اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ صبح طلوع ہو گئی تھی، اصل سبب یہ تھا کہ شعلے مدھم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی کہ آگ بجھانے والے کامیاب رہے ہیں۔

''اوجی سان! ہم جیت گئے ہیں، ہم جیت گئے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو ایک اور سبق پڑھاؤں گی۔'' نوخیز لڑکی نے اپنے گھر کی جانب دوڑ لگاتے ہوئے کہا۔ اب اس کے قدم ہموار اور خود اعتماد تھے۔ وہ ایک بار پھر بائیسکل کی ننھی منی شعبدے باز بن گئی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سوچا۔ ''اسے اندازہ نہیں مجھے اس کے متعلق کتنی پریشانی تھی؟'' جب وہ بھاگی جا رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا جیسے میں اس کے حق میں دعائے خیر کرنا چاہتا ہوں۔

''ہاں، ہم جیت گئے ہیں۔ میں بہت جلد تم سے پھر پوچھوں گا۔''

میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ میرا ارادہ سونے کا نہیں تھا لیکن جب میری آنکھ کھلی، تقریباً دوپہر ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پڑوس تبدیل ہو چکا ہے۔ آسمان نکھر چکا تھا لیکن فضا کچھ اس قسم کی تھی کہ آدمی میں خواہ مخواہ اضطراب اور چڑچڑاپن اور ناقابل بیان تشویش نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرے

لیے ساکت بیٹھنا ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ میں باہر نکلا اور بائیسکل پکڑ لی۔ یہ اپنی مرضی سے شہر اور اس درگاہ کی جانب، جس کی میں نے سال کے پہلے روز زیارت کی تھی، چل پڑی۔

یہ بائیسکل پر میرا پہلا سیر سپاٹا تھا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی کا یہ واقعہ اس قسم کے دن رونما ہو گا۔ مجھے بائیسکل سنبھالنے اور چلانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ میں اپنے پرانے ٹینس شو پہنے دیوانہ وار پیڈل مارتا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔

مجھے ابھی بوٹ حاصل کرنا تھے۔ شاید انہی میں میری بھلائی تھی۔ میرے تمام خواب پورے ہو جاتے اور مجھے یہ جاننے کی مزید خواہش نہ ہوتی کہ میں اپنے آپ کا کیا کروں۔

کچھ ہی دیر میں میں درگاہ کے نواح میں پہنچ گیا۔ جو کچھ میں نے وہاں یا راستے میں دیکھا، مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں اور میں یاد رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ درگاہ کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ اب اس کے حسب حال کوئی کائیو کا نظام نہیں لکھی جا سکے گی۔

میں جس راستے سے آیا تھا، بلاتاخیر اسی پر دوبارہ چل پڑا۔ جب میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا، مجھے احساس ہوا کہ میرے کپڑوں پر سیاہی مائل گرد کی دبیز تہہ جم چکی ہے۔ میں نے لپک کر برش اٹھایا اور چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اپنے کندھوں سے مٹی جھاڑنے لگا۔ فضا میں جو بو رچ بس گئی تھی، اس میں میرا دم گھٹنے لگا۔

میری نگاہوں کے سامنے ایک منظر تیرنے لگا۔ یہ وہ منظر نہیں تھا جو میں نے شہر کو جانے والی سڑک کے کنارے دیکھا تھا۔ اس کا نقشہ ایک عبارت میں پیش کیا گیا تھا جو میں نے مدتوں پہلے کسی کتاب میں پڑھی تھی...... اس عبارت میں جاپان کے قدیمی دارالسلطنت (اور بدھ مت کے مرکز) کیوٹو کے محلے توری بینو کے مرگھٹ کا بیان ہے۔ آسمان پر خوش الحان پرندے ناچتے کودتے پھر رہے تھے اور بہار کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا لیکن چتاؤں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے اور ادھر ادھر کھیتوں کے اوپر منتشر ہو رہے تھے۔ تاہم گھاس اور فصلوں کے اوپر کڑوی کسیلی بو چھائی ہوئی تھی اور وہ چمکدار دھوپ میں گھل مل رہی تھی۔ یہی وہ بو تھی جو میرے کپڑوں میں سرایت کر چکی تھی۔ میں گرد جھاڑتے جھاڑتے رک گیا، بے دلی سے برش اپنے قریب گرا دیا اور خود پتھر کا بت بن کر کھڑا رہا۔

میری اداسی بے کراں تھی۔

مجھے مسٹر گوکا اور اس کے محل نما مکان کی سلامتی کے متعلق تشویش ہونے لگی۔ جب میں شہر کی یاترا پر نکلا تھا تو میں اس سڑک پر سے گزرا تھا جو اس کے مکان کے عقب میں واقع ہے۔ وہاں مجھے ہر چیز ٹھیک ٹھاک دکھائی دی تھی اور یوں میں نے اس کی سلامتی کے متعلق کوئی تردد نہیں کیا تھا۔ اب میرے سامنے یہ سوال آ گیا کیا گزشتہ رات اسی علاقے سے شعلے بلند نہیں ہو رہے تھے۔ جہاں وہ رہتا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کے مکان کا عقبی حصہ تباہی سے بچ گیا ہو لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کے سامنے کا حصہ آگ کی زد میں آ گیا ہو؟ میں مڑا اور ادھر چل پڑا۔ اس مرتبہ میں پیدل تھا۔ میں اس راستے کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنے لگا جو میدان کے پچھلے حصے سے عمودی چٹان کی چوٹی پر جاتا تھا۔ وہاں سے میں نے قریبی مکانوں کے بیچ مختصر راستہ اختیار کیا۔ میں تیز قدموں سے چل رہا تھا لیکن اچانک رک گیا۔ چٹان کی چوٹی سے جو کوچہ نظر آ رہا تھا اور جس میں گوکا کا محل نما مکان واقع تھا، زمین بوس ہو چکا تھا۔

میں کھنڈرات کے بیچوں بیچ چلنے لگا۔ اس مکان کے، جو اب معدوم ہو چکا تھا، پھاٹک کی بچی کھچی نشانیوں کے سامنے اس کی دہلیز کے پتھر پر کھڑا تھا۔

رات قریب آ رہی تھی اور سورج کی مدھم روشنی میں سارا علاقہ کسی دریائی گھاٹی کے نشیب کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہاں وہاں فضائی حملے میں نقصان اٹھانے والے اپنے ہاتھوں میں چمٹے پکڑے سلگتی راکھ کرید رہے تھے کہ شاید کوئی چیز بچا لیں۔ گوکا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک بڑھیا ملبے میں سے، جو گوکا کے مکان کے پیچھے پڑا تھا، کارآمد اشیاء ڈھونڈ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھنے لگتی جیسے اسے اندازہ ہو کہ کوئی شخص کچھ فاصلے پر بے دھیانی کے عالم میں کھڑا ہے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھی، میرے قریب آئی اور خاموشی سے یوں میرے منہ کو تکنے لگی جیسے وضاحت کی طلبگار ہو۔

''یہ مسٹر گوکا کا ہی مکان تھا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ بھسم ہو چکا ہے۔''

''ان کا کیا بنا؟......''

''وہ محفوظ ہیں۔ وہ وقت پر نکل گئے تھے۔''

''سمجھا۔ اور ان کی اشیاء؟''

جونہی میرے منہ سے یہ سوال نکلا، میں اس کے بے تکے پن پر کھسیانا ہو گیا۔ اس کا جواب ٹھوس تھا جیسے وہ اپنی بات پر زور دینا چاہتی ہو۔

''نہیں، مسٹر گوکا ایسے آدمی نہیں جنہیں اپنے مال اسباب کی فکر ہو۔ یہ علاقہ سب سے آخر میں آگ کی زد میں آیا لیکن اگر ان کے پاس وقت ہوتا تو بھی وہ ایسے آدمی نہیں جنہیں کوئی خاص تشویش ہوتی۔ انہوں نے بس اپنا مسودہ اٹھایا، کپڑے میں لپیٹا اور باہر نکل آئے۔ وہ گلی کی دوسری جانب ٹیلے پر چڑھ گئے اور اپنے مکان کو جلتا دیکھنے لگے۔ وہ وہیں کھڑے رہے جب تک کہ مکان بھسم ہو کر نیچے نہ گر پڑا۔ یہ پو پھٹنے کا واقعہ ہے۔ وہ آخر تک اسے دیکھتے رہے۔''

میں اس بڑھیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اس کا برجستہ اور بے تکلف انداز بہت شگفتہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے اس خیال کو نئے سرے سے تقویت ملی کہ میرا سوال واقعی بالکل بے محل اور بے تکا تھا۔ مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی۔

''جب صبح ہوئی، چند لوگ انہیں ملنے آ گئے۔ میں ان کی پڑوسن ہوں اور کئی سالوں سے انہیں جانتی ہوں۔ آپ کو معلوم ہے وہ اکیلے رہتے تھے۔ وہ خاموش طبع انسان تھے اور کسی سے کوئی خاص ملتے ملاتے نہیں تھے۔ جب آخر کار وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے، میرے گھر میں کچھ ڈبل روٹی تھی اور چونکہ مجھے معلوم تھا کہ انہیں ڈبل روٹی بہت پسند ہے اور میرے پاس کچھ مکھن بھی تھا، چنانچہ میں نے یہ دونوں چیزیں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ مجھے امید ہے وہ کل واپس آ جائیں گے۔''

بڑھیا کیا کہہ رہی تھی، اب میرا دھیان اس پر نہیں تھا۔ اس کی بجائے میری آنکھوں کے سامنے اس شخص کا خاکہ ابھرنے لگا جو مسودے کے سوا ہر چیز سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ ٹیلے پر کھڑا تھا، آندھی چل رہی تھی، چنگاریاں اڑ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ اپنے مکان کو بھسم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں بوڑھے لیکن نڈر عظیم شاعر کی تصویر بنانے کی کوشش کی۔

اگر کوئی شخص کمان تانتا ہے تو اسے یہ کام جرأت اور حوصلے سے کرنا چاہیے۔

مسٹر گوکا نے ہمارے عہد میں ادب عالیہ کی جو کمان تانی ہے، وہ کوئی معمولی نہیں۔

جب میں واپسی کے لیے مڑا، میں نے بڑھیا کا شکریہ ادا کیا۔

اس شام میں خالی میدان میں چلا گیا۔ بائیسکل پر دن کے وقت میں جو گرد جم گئی تھی، وہ میں نے جھاڑی پونچھی اور بائیسکل کو چمکا دیا۔ اگرچہ شام ابھی زیادہ نہیں گزری تھی لیکن پڑوس معمول سے کہیں زیادہ خاموش تھا۔ گھروں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور ان کے دروازے بند تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوخیز دوشیزہ مجھے ملنے نہیں آئے گی۔ شعلوں کی حرارت، جس نے شہر کو برباد کر دیا تھا، ابھی تک فضا میں رچی بسی تھی لیکن آسمان پر چاند طلوع ہو چکا تھا اور اس نے عقبی میدان کو اپنی خنک سفید روشنی میں نہلا دیا تھا۔

جنوبی ہوائیں چلنا بند ہو گئی تھیں۔ دن گرم سے گرم تر ہو رہے تھے۔ اگر حالات مختلف ہوتے تو ہم دنوں کا حساب کرتے رہتے یہاں تک کہ چیری کے پھول نکل آتے۔ سائیکل کی جھاڑ پونچھ کرنے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں ایک کائیو کا نظم کہہ ڈالی۔ میں نے اسے ''بائیسکل کے لیے محبت کا گیت'' کا عنوان دے دیا۔

بائیسکل پر جھاڑ پونچھ کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی چاہیے تھا اور آخر کار یہ تھوڑا بہت چمکنے لگی۔ شاید یہ چاند کی چمک تھی۔ بائیسکل کو چھجے کے نیچے کھڑا کرنے کی بجائے میں اس پر سوار ہو گیا اور کھلے میدان میں گھومنے لگا۔ میں نے ایک ہی سانس میں اس کے چھ چکر کاٹ ڈالے اور زمین پر خاصی بڑی قوس بنا دی۔

صبح کو زور زور سے سانس اندر باہر کھینچنے کی ورزشوں کے بعد میرے جسم کی اینٹھن ختم ہو گئی تھی اور میری حرکات میں پھرتی آ گئی تھی۔ آخر کار مجھے اسے استعمال کرنے کا ڈھنگ آ ہی گیا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ بائیکسل میری ملکیت بننے والی ہے لیکن اس کے متعلق میرا جنون کم ہونے لگا ہے۔ اگر کسی شخص کو پرانی کھٹارا بائیسکل کی سچی خواہش ہو تو میں اسے یہ تحفتاً دینے کو تیار ہوں۔

ایبے کوبو

طلسمی چاک

ایبے کوبو (Abe Kobo) (1924ء...........) میں پیدا تو ٹوکیو میں ہوئے تھے لیکن ان کا تقریباً سارا عہد شباب مانچوریا کے عظیم صحراؤں کے آس پاس گزرا۔ ان کا حقیقت کے متعلق جو تصور ہے وہ اکثر بدلتا رہتا ہے۔ ایک نقاد کے خیال کے مطابق اس کی تشکیل میں ان کے اس تجربے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میشیما یوکیو نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ بیشتر جاپانی ادب کا طرہ امتیاز اس کی ''طراوت'' (humidity) ہے لیکن ایبے کی فکشن میں یہی چیز سب سے کم پائی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ معاصر جاپانی قارئین ان کی تحریروں کو ایک ایسے مصنف کی تخلیقات گردانتے ہیں جو اپنے ماحول سے بالکل کٹا ہوا ہے۔ جاپان اور مغربی ممالک میں ان کے حمایتی انہیں جاپان کا واحد ''بین الاقوامی'' ادیب تصور کرتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ خصائص جو کسی ادیب پر جاپانیت کا رنگ چڑھاتے ہیں، ایبے کے ہاں وہ مفقود ہیں۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ جاپانی زبان ان کے لیے موزوں ذریعہ اظہار نہیں، اس کی بجائے اگر وہ کاتا کانا (Kata Kana) کو ذریعہ اظہار بنائیں تو اپنی صلاحیتوں کو کہیں بہتر طور پر بروئے کار لاسکیں گے۔ (کئی دوسرے ممالک کی طرح جاپان میں بھی ایک نئی زبان وجود میں آ رہی ہے۔ اس کا نام ''کاتا کانا'' رکھا گیا ہے یہ بھانت بھانت کے الفاظ اور محاوروں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان الفاظ کی اصوات جاپانی لہجے سے ادا کی جاتی ہیں، پھر بھی انہیں صحیح معنوں میں

جاپانی نہیں کہا جا سکتا اور نہ انہیں جاپان میں پوری طرح ضم کیا جا سکا ہے۔)

شروع میں جو چیز جاپانیوں کی توجہ کا مرکز بنی، وہ ایبے کوبو کی کہانیوں کی اختراعیت اور انتہائی جدیدیت ہے۔ ان میں جزوی طور پر کافکا کا لہجہ، جزوی طور پر سائنسی عقلیت، جزوی طور پر ابسرڈزم (Absurdism) اور جزوی طور پر سائنسی فکشن کی تیکنیک پائی جاتی ہے۔ اس کی ''طلسمی چاک'' (جو اس کتاب میں شامل ہے) اور ''ابریشم کا سرخ کویا'' جیسی کہانیاں منطقی اصولوں کے اعتبار سے احمقانہ قضیوں (Absurd premises) پر مبنی ہیں، لیکن ان میں جس منطق کو استعمال کیا گیا ہے، وہ بہت مفصل اور قابل قبول نظر آتی ہے۔ اس منطق میں ان کی میڈیکل کالج کی تربیت اور بے مہار ادبی تخیل کی آمیزش شامل ہے۔ ایبے نے اپنی فکشن میں جو متعدد تیکنیک استعمال کی ہیں اور بھانت بھانت کے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، اگرچہ ان کی جڑیں جاپان اور مغرب دونوں کے ادب میں تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن وہ اپنی کہانیوں کے مہمل پن (Nonsense) کو جس سنجیدگی سے پیش کرتے ہیں، وہ دنیا بھر کے قارئین کے لیے تحیر اور دلچسپی کا باعث بنا ہے۔

ایبے کوبو کا بہترین ناول ''ریت کے ٹیلوں میں عورت'' 1962ء (انگریزی ترجمہ 1964ء) میں شائع ہوا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اپنے اس ناول میں انہوں نے جو ویژن (Vision) پیش کیا تھا، وہ بہت جلد اس سے تائب ہو گئے اور اسے تبدیل کرنے کے لئے مختلف سمتوں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ وہ فکشن لکھنے کے علاوہ تھیٹروں میں بھی سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان کا اپنا ایکٹنگ سٹوڈیو ہے اور وہ اپنے ڈراموں کے، جو زیادہ تر ان کی اپنی کہانیوں پر مشتمل ہوتے ہیں، سکرپٹ بھی خود ہی تحریر کرتے ہیں۔ ان کا مشہور ترین ڈرامہ ''دوست'' (1967ء) ہے۔ اس کے لیے انہیں ادب کا تانازاکی (Tanazaki) انعام ملا تھا۔ ان کا تازہ ترین ناول 1984ء میں شائع ہوا تھا۔

شہر کے آخری سرے پر فلیٹوں پر مشتمل عمارت کے بیت الخلاء سے ملحق کمرے میں، جو چھت کے ٹپکنے اور کھانا پکانے کے دوران میں بخارات کے اڑنے کی وجہ سے سیلا ہو چکا تھا، ایک مفلوک الحال آرٹسٹ رہتا تھا۔ اس کا نام آرگون تھا۔ یوں تو کمرا بہت چھوٹا تھا کیونکہ یہ صرف نو فٹ لمبا اور نو فٹ چوڑا تھا لیکن اپنی جسامت کے مقابلے میں خاصا

فراخ نظر آتا تھا کیونکہ اس میں صرف ایک کرسی تھی جو دیوار کے ساتھ پڑی رہتی تھی۔ اس کی ڈیسک، خانے دار الماری، پینٹ باکس بلکہ ایزل بھی روٹی کی خاطر فروخت ہو چکا تھا۔ اب صرف کرسی اور آرگون باقی رہ گئے تھے۔ لیکن یہ دونوں بھی کب تک رہیں گے؟

ڈنر کا وقت قریب آ گیا تھا۔ ''میری ناک کتنی حساس ہوگئی ہے!'' آرگون نے سوچا۔ اس کے کمرے میں جو پیچیدہ خوشبوئیں چلی آ رہی تھی، وہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن کن چیزوں کی خوشبوئیں ہیں، کتنی کتنی دور سے آ رہی ہیں اور جن چیزوں کی یہ خوشبوئیں تھیں، ان کے رنگ کیا کیا ہیں۔ ٹرام کی پٹڑی کے قریب بوچڑ کی دکان میں تلتا ہوا گوشت زردی مائل نارنجی ہے۔ پھلوں کے جس کھوکھے کے سامنے سے بادِ جنوب گزرتی چلی آ رہی ہے، وہ زمردی سبز ہے۔ بیکری سے جن اشیاء سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں، ان کی رنگت اشتہا بڑھانے والی زرد ہے۔ نچلی منزل میں خانہ دار خاتون جو مچھلی بھون رہی ہے، وہ غالباً میکرل (Mackerel) ہے اور اس کی رنگت اداس کرنے والی آسمانی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اس روز آرگون کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی تھی۔ اس کا پیٹ پیٹھ سے لگ چکا تھا، چہرے پر زردی کھنڈنے لگی تھی اور پیشانی پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ اسے اپنے کنٹھے پر اختیار حاصل نہیں رہا تھا، وہ کبھی اوپر اٹھ جاتا اور کبھی نیچے گر پڑتا۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں اور اس کی کمر خمیدہ ہو چلی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونس لیے اور تین مرتبہ جماہی لی۔

اسے اپنی جیب میں کوئی نسبتاً لمبی لیکن پتلی چیز محسوس ہوئی۔

''ایں، یہ کیا؟ سرخ چاک۔ یاد نہیں پڑتا یہ یہاں کیسے آیا؟''

اپنی انگلیوں سے چاک کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس نے ایک اور زبردست جماہی لی۔

''اخ، مجھے کچھ کھانے کو چاہیے۔''

یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے، آرگون چاک سے دیوار پر گھسیٹا گھسیٹی کرنے اور بے اختیار مختلف کھانے پینے کی اشیا کے خاکے بنانے لگا۔ جو پہلا خاکہ بنا، وہ سیب کا تھا۔ یہ کوئی معمولی سیب نہیں تھا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ اگر آدمی اسے سالم کھا جائے تو اسے مزید کچھ کھانے کی ہوس نہ رہے۔ سیب کے بعد اس نے پھلوں کے چھلکے اتارنے کا چاقو بنایا۔

یہ چاقو اس نے اس لیے بنایا تھا کیونکہ وہ سیب کو فوراً ہی کھا جانا چاہتا تھا۔ راہداری اور کھڑکی میں سے ڈبل روٹی کے پکائے جانے کی جو خوشبو گھسی چلی آ رہی تھی، اسے سونگھتے سونگھتے اس نے ڈبل روٹی کا خاکہ بنا دیا۔ جسامت کے اعتبار سے یہ ڈبل روٹی بیس بال کے دستانے کے برابر تھی اور اس میں جام (Jam) بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے رول (Rolls) بنائے جن میں مکھن بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک اور ڈبل روٹی کی باری آئی۔ یہ ہٹے کٹے آدمی کے سر جتنی بڑی تھی۔ اس میں سے خمیر کی جو خوشبو اٹھ رہی تھی، وہ آدمی پر نشہ طاری کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس ڈبل روٹی کے قریب اینٹ کے برابر مکھن کا ڈلا نمودار ہوا۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا لیکن کچھ پینے کو بھی تو چاہیے۔ چنانچہ اس نے پہلے ایک پیالی بنائی۔ یہ کسی جگ سے چھوٹی نہیں تھی۔ اس میں تازہ تازہ بنی ہوئی کافی تھی جس سے ابھی تک بخارات اٹھ رہے تھے۔ پھر پرچ کی باری آئی۔ اس میں ماچس کی ڈبیا جتنی بڑی چینی کی مکعب ڈلیاں تھیں۔

''لعنت ہے!'' وہ اپنے دانت پیسنے لگا اور اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ''مجھے کچھ کھانے کو چاہیے!''

آہستہ آہستہ اس کے شعور پر اندھیرا غالب آنے لگا۔ کھڑکی کے باہر ڈبل روٹیوں اور پیسٹریوں کا جنگل تھا، ڈبوں میں بند کھانے پینے کی اشیاء کا پہاڑ تھا، دودھ کا سمندر تھا، چینی کا ساحل تھا، گائے کے گوشت اور پنیر کا باغ تھا............ ہیجانی کیفیت میں وہ تیزی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کمرے میں چکر لگانے لگا یہاں تک کہ تھکاوٹ نے اس پر غلبہ پا لیا اور وہ سو گیا۔

فرش پر چیزوں کے گرنے اور برتنوں کے چٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازوں نے اسے جگا دیا۔ سورج پہلے ہی غروب ہو چکا تھا۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے گردوپیش کیا ہو رہا ہے۔ پریشانی کے عالم میں اس نے نگاہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا جدھر سے شوروغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو کچھ اس نے دیکھا، اس نے اسے بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ وہاں ایک ٹوٹا ہوا کپ پڑا تھا۔ اس میں سے جو سیال باہر گرا تھا، وہ یقیناً کافی تھی اور اس میں سے ابھی تک بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے قریب سیب، ڈبل روٹی، مکھن، چینی، چمچہ، چاقو اور پرچ (جو خوش قسمتی سے صحیح سلامت تھی)

پڑی تھی۔ اس نے چاک سے دیوار پر جو خاکے بنائے تھے، وہ غائب ہو چکے تھے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے......''

اچانک اس کے جسم کی ایک ایک رگ بیدار ہونے اور پھڑکنے لگی۔ آرگون دزدیدہ انداز سے رینگتا رینگتا قریب ہو گیا۔

''نہیں نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن دیکھو تو سہی، سب کچھ اصلی ہے۔ اس کافی کی خوشبو، جو حواس پر چھائی جا رہی ہے، نقلی نہیں اور یہ ڈبل روٹی کتنی ہموار ہے۔ حوصلہ کرو، چکھ کر دیکھو۔ آرگون! تمہیں اب بھی یقین نہیں آیا کہ یہ اصلی ہے؟ ہاں، واقعی اصلی ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن اس سے خوف آتا ہے۔ اس پر یقین کرتے خوف آتا ہے۔ تاہم یہ اصلی ہے۔ یہ کھانے کے لائق ہے!''

سیب کا ذائقہ سیب (برفانی سیب) جیسا تھا۔ ڈبل روٹی کا ذائقہ (امریکی آٹے کی) ڈبل روٹی جیسا تھا۔ مکھن کا ذائقہ بالکل مکھن کا تھا (جیسا کہ اس کے ملفوف کاغذ پر تحریر تھا کہ یہ مکھن ہے...... مارجرین نہیں)۔ چینی بالکل اصلی چینی جیسی میٹھی تھی۔ اخاہ! تمام چیزوں کا ذائقہ اصلی چیزوں جیسا تھا۔ چاقو چمک رہا تھا اور اس میں اسے اپنے چہرے کا عکس نظر آ رہا تھا۔

جب آرگون اپنے حواس میں آیا، وہ کسی نہ کسی طرح کھانے پینے کی چیزیں پیٹ میں اتار چکا تھا اور اب اس نے اطمینان کی سانس لی لیکن جب اس نے یاد کیا کہ اس نے اس طرح کی سانس کیوں لی تھی، ایک بار پھر اس کا دماغ پراگندہ ہو گیا۔ اس نے انگلیوں میں چاک پکڑا اور بڑے انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ خواہ کتنی ہی دقیق نظروں سے اس کا جائزہ لیتا، جو بات اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی، وہ پڑ سکتی ہی نہیں تھی۔ اس نے پکا یقین کرنے کے لیے ایک مرتبہ اور کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اگر وہ دوسری بار کامیاب رہا تو پھر اسے ماننا ہی پڑے گا کہ یہ سب کچھ حقیقتاً ہوا تھا۔ اس نے سوچا اب کے وہ مختلف چیزوں کا خاکہ بنانے کی کوشش کرے گا لیکن جلد بازی میں وہ محض جانے پہچانے سیب ہی کا خاکہ بنا سکا۔ جونہی اس نے خاکہ مکمل کیا، سیب نیچے گر پڑا۔ ''تو یہ بہرحال اصل چیز ہے۔ اسے بار بار دہرایا جا سکتا ہے۔''

وہ اتنا خوش تھا کہ اچانک اس کا جسم لکڑی کی طرح اکڑ گیا۔ اس کی رگوں کی

نوکیں اس کی جلد میں سے باہر نکلنے اور خشک پتوں کی طرح سرسراتی ہوئی کائنات کی جانب پھیلنے لگیں۔ پھر اچانک غیر متوقع طور پر اس کا تناؤ ختم ہو گیا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور کسی ہانپتی کانپتی سنہری مچھلی کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

''کائنات کے قوانین تبدیل ہو گئے ہیں۔ میری تقدیر بدل گئی ہے۔ بدقسمتی نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اخاہ! خواہشات کی تکمیل کا زمانہ آ گیا ہے۔ میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہوں جہاں آرزوئیں بارآور ہو سکتی ہیں...... خدایا! مجھے نیند آ رہی ہے۔ خیر، میں پلنگ کا خاکہ بناتا ہوں۔ یہ چاک اتنا ہی قیمتی ہو گیا ہے جتنی کہ خود زندگی ہوتی ہے لیکن پلنگ ایک ایسی چیز ہے جس کی (سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد) ہمیشہ ضرورت پیش آتی ہے اور یہ حقیقتاً کبھی گھستا بھی نہیں۔ چنانچہ مجھے اس کے سلسلے میں کسی قسم کے بخل کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ آج میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ گھوڑے بیچ کر سوؤں گا۔''

اس کی ایک آنکھ تو بہت جلد بند ہو گئی لیکن دوسری کھلی رہی۔ آج پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کل کیا ہو گا۔ تاہم آخر کار اس کی دوسری آنکھ بھی بند ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ چونکہ اس کی آنکھوں میں باہمی مطابقت نہیں تھی اور وہ اپنی اپنی مرضی کرنے پر تلی ہوئی تھیں، اسے ساری رات انجمل بے جوڑ خواب آتے رہے۔

خیر، یہ پریشان کن کل اس طرح طلوع ہوا:

اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی خونخوار درندہ اس کا تعاقب کر رہا ہے اور وہ پلی سے نیچے گر گیا ہے۔ گرا وہ پلنگ سے نیچے تھا......نہیں۔ جب اس کی آنکھ کھلی، وہاں پلنگ ولنگ نام کی کوئی شے نہیں تھی، حسب معمول صرف کرسی وہاں پڑی تھی، اور کچھ نہیں۔ پھر گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟ آرگون سر گھما کر ڈرتے ڈرتے دیوار کی جانب دیکھنے لگا۔

وہاں سرخ چاک سے بنے ہوئے پیالی (یہ شکستہ تھی) چمچے، چاقو، سیب کے چھلکوں اور مکھن لپیٹنے کے کاغذ کے خاکے موجود تھے۔ ان کے نیچے پلنگ کی تصویر تھی............ اسی پلنگ کی تصویر جس سے وہ اپنی دانست میں نیچے گرا تھا۔

گزشتہ رات کے خاکوں میں سے صرف وہی، جنہیں وہ کھا نہیں سکا تھا، دوبارہ تصویریں بن پائے اور واپس دیوار پر پہنچ پائے تھے۔ اچانک اسے اپنے کولہے اور کندھے

میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہونے لگیں۔ یہ ٹیسیں جسم کے عین ان حصوں سے اٹھ رہی تھیں جہاں سے انہیں اٹھنا چاہیے تھا بشرطیکہ وہ واقعی پلنگ سے نیچے گرا ہوتا۔ اس نے احتیاط سے پلنگ پر ہاتھ رکھا جہاں چادریں تڑ مڑ گئی تھیں اور اسے ہلکی سی حرارت کا احساس ہوا جو کہ تصویر کے بقیہ حصے کی ٹھنڈک سے مختلف تھی۔

وہ تصویری چاقو کے پھل پر انگلی پھیرنے لگا۔ یہ یقیناً چاک ہی تھا اور کچھ نہیں۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور انگلی پھیرنے سے مٹ گیا، صرف دھبا باقی رہ گیا۔ آزمائش کی خاطر اس نے نیا سیب بنانے کا ارادہ کرلیا۔ اب کے نہ تو سیب سرخ ہوا، نہ نیچے گرا اور نہ ان جڑے کاغذ کی طرح اکھڑا بلکہ وہ اس کی زخمی انگلی کے نیچے دیوار میں غائب ہوگیا۔

تو اس کی خوشی صرف ایک رات کا خواب تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور وہ واپس وہیں پہنچ گیا تھا جہاں وہ ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے تھا۔ کیا واقعی یہ بات تھی؟ نہیں، اس کی کلفت میں پہلے کی نسبت پانچ گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ بھوک سے پہلے سے پانچ گنا بلبلا رہا تھا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے جو کچھ کھایا پیا تھا، وہ اس کے معدے میں دیوار اور چاک کی اصل صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔

جب وہ ہاتھوں کی اوک بنا کر اجتماعی نلکے سے ایک کلو کے برابر پانی پی چکا تو وہ سنسان شہر کی جانب چل پڑا جو ابھی تک صبح صادق کے کہرے میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک ان ڈھکی بدرو پر جھکا جو اس سے تقریباً سو گز دور واقع کسی ریستوران کے باورچی خانے سے آ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ کولتار جیسی سیاہ اور لجلجی غلاظت میں گھسیڑ دیا اور کوئی چیز باہر کھینچ لی۔ یہ جالی دار آہنی ٹوکری تھی۔ اس نے اسے قریب کی ایک چھوٹی سی ندی میں دھویا۔ اس میں جو بچی کھچی اشیا موجود تھیں، اسے خیال گزرا انہیں کھایا جا سکتا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر خاص طور پر خوشی ہوئی کہ ان میں سے نصف چاول جیسی کوئی چیز تھی۔ فلیٹوں کی جس عمارت میں وہ رہتا تھا، اس میں رہائش پذیر ایک بوڑھے نے اسے حال ہی میں بتایا تھا اگر آدمی جالی دار ٹوکری گندی نالی میں رکھ دے، اسے اتنی خوراک مل سکتی ہے جس سے اس کا پورا دن نکل سکتا ہے۔ کوئی ایک مہینا ہوا، اس شخص کو سویا بین سے بنے ہوئے پنیر کے بچے کھچے ٹکڑے خریدنے کے ذرائع میسر آ گئے تھے، چنانچہ اس نے ریستوران کی یہ نالی آرٹسٹ کے سپرد کر دی تھی۔

گزشتہ رات کی پرتعیش دعوت کے بعد یہ کھانا گدلا، پھسپھسا اور بدمزہ تھا لیکن یہ جادو کی چیز نہیں تھی۔ لیکن یہ جادو کی چیز نہیں تھی۔ جو چیز بھی اس کے پیٹ کی آگ بجھا سکتی تھی، وہ بیش بہا تھی اور یوں ٹھکرائی نہیں جا سکتی تھی۔ اگرچہ ہر لقمے پر اسے احساس ہوتا تھا کہ یہ بدبودار اور بدذائقہ ہے لیکن وہ کھانے پر مجبور تھا۔ لعنت! یہ اصلی چیز ہے!

دوپہر سے ذرا قبل وہ شہر پہنچ گیا اور اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا جو کسی بینک میں کام کرتا تھا۔ اس کا دوست ذرا طنزیہ انداز سے مسکرایا اور پوچھنے لگا: ''آج میری باری ہے؟''

اپنا جسم اکڑائے اور چہرے پر کسی قسم کے تاثرات پیدا کئے بغیر آرگون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حسب معمول اسے اپنے دوست کا آدھا لنچ مل گیا۔ اس نے وہ کھایا، پھر خاصا جھک کر سلام کیا اور واپس چلا گیا۔ باقی دن آرگون نے اپنے خیالات کا تانا بانا بننے میں گزارا۔

اس نے نرمی سے چاک اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور جب وہ جادو کے متعلق اپنے خوابوں میں کھویا ہوا تھا تو اس کی شدید خواہشات واضح صورتیں اختیار کرنے لگیں اور وہ سوچنے لگا شاید ان کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ آخر ایک مرتبہ پھر شام ہو گئی اور اس کی یہ امید کہ غروب آفتاب کے بعد جادو اپنا رنگ دکھائے گا، تقریباً اعتماد میں تبدیل ہو گئی۔

قریب ہی کسی پرشور ریڈیو نے اعلان کیا کہ شام کے پانچ بج گئے ہیں۔ وہ اٹھا اور اس نے دیوار پر ڈبل روٹی اور مکھن، سارڈین مچھلیوں کے بند ڈبے اور کافی کے خاکے بنا دیئے۔ اس مرتبہ اس نے ان کے نیچے میز کی تصویر بھی بنا دی کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گزشتہ رات کی طرح چیزیں نیچے گریں اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں پھر وہ انتظار کرنے لگا۔

کوئی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے کے کونے کھدروں سے تاریکی چپ چاپ آگے بڑھنے اور دیوار کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ جادو کیا طریقہ اختیار کرتا ہے، اس نے بتی جلا دی۔ وہ پہلے ہی گزشتہ رات تصدیق کر چکا تھا کہ برق روشنی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔

سورج غروب ہو گیا۔ دیوار پر تصویریں ماند پڑنے لگیں جیسے اس کی اپنی بصارت دھندلا گئی ہو۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں اور دیوار کے مابین کوئی دھند حائل ہو گئی ہے۔ تصویریں بتدریج مدھم پڑتی گئیں اور دھند گہری ہوتی چلی گئی اور جیسا کہ اسے توقع تھی، بہت جلد دھند ٹھوس شکلیں اختیار کرنے لگی............ کامیابی! تصویروں کی اشیاء اچانک حقیقت کا روپ دھار گئیں۔

کافی، جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی، کتنا للچا دینے والی تھی! روٹی تازہ تازہ بھٹی سے نکلی تھی اور ابھی تک گرم تھی۔

''اف! میں ڈبا کھولنے والا اوزار بنانا تو بھول ہی گیا تھا۔''

اس نے تصویر بنائی اور اپنا ہاتھ اس کے نیچے کر دیا تاکہ اس کے فرش پر گرنے سے پہلے ہی وہ اسے پکڑ لے۔ جب وہ تصویر بنا رہا تھا، خاکہ ساتھ ساتھ مادی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کی تصویر میں واقعی جان پڑ گئی تھی۔

اچانک اس نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ ارے، پچھلی رات کا پلنگ پھر آ ''موجود'' ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چاقو کا دستہ (وہ اس کا پھل مٹا چکا تھا)، مکھن لپیٹنے کا کاغذ اور شکستہ فرش پر گری پڑی تھی۔

اپنا خالی پیٹ بھرنے کے بعد آرگون بستر پر لیٹ گیا۔

''خیر، اب اس کے بعد کیا ہو گا؟ اب اتنا تو واضح ہو گیا کہ جادو دن کی روشنی میں اپنے کمالات نہیں دکھا سکتا۔ کل پھر دن کے دوران میں مجھے بھوک کی اذیت برداشت کرنا ہو گی۔ اس سے بچنے کا کوئی آسان طریقہ ہونا چاہئے۔ ارے واہ! بڑا زبردست خیال سوجھا ہے............ میں کھڑکی پر پردے چڑھا دوں گا اور اپنے آپ کو اندھیرے میں بند کر لوں گا۔''

تاہم اس منصوبے کو عملی جامہ پہنے کے لئے اسے کچھ رقم درکار تھی۔ سورج کی روشنی کو اندر آنے سے روکنے کے لئے ایسی ٹھوس اور اصلی اشیا چاہیے تھیں جن پر دھوپ نہ اثر انداز ہو سکتی اور نہ ان کا وجود مٹا سکتی۔ روپیہ بنانا بھی مشکل کام تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر بوجھ ڈالا اور پھر نوٹوں سے بھرے ہوئے بٹوے کی تصویر بنا ڈالی............ کامیابی اس کے قدم چوم چکی تھی اور جب اس نے بٹوا کھولا، اسے اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ نوٹ مل

گئے جو اس میں ٹھساٹھس بھرے ہوئے تھے۔

پریوں کی کہانیوں میں درختوں کے پتوں سے بجو جس قسم کے نقلی سکے بنایا کرتے تھے، وہ دن کی روشنی میں غائب ہو جاتے تھے۔ ان نوٹوں کا حال بھی ویسا ہی ہو گا لیکن ایک فائدہ بھی ہو گا، ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا اور یہ بڑے اطمینان کا بات ہو گی کیونکہ کوئی شخص بھی اس پر جعل سازی کا الزام نہیں لگا سکے گا۔ تاہم اس نے احتیاط برتی اور وہ ارادتاً کسی دور دراز کے شہر کی طرف چل پڑا۔ اس نے وہاں کے بازار سے دو وزنی کمبل، سیاہ اونی کپڑے کی پانچ چادریں، پشمینے کا تھان، میخوں کا ڈبا اور چار مربع چوبی تختیاں خریدیں۔ اس کے علاوہ چلتے چلتے پرانی کتابوں کی دکان میں اس کی نظر ایک ایسی کتاب پر پڑ گئی جس میں کھانے پکانے کی ترکیبیں درج تھیں۔ اس نے جھٹ پٹ وہ بھی خرید لی۔ باقی پیسوں سے اسے ایک کپ کافی مل گئی مگر یہ کافی کسی اعتبار سے بھی اس کافی سے بڑھیا نہیں تھی جس کی تصویر اس نے دیوار پر بنائی تھی۔ اسے اپنے آپ پر (کیوں؟) فخر تھا۔ ہاں، آخر میں اس نے ایک اخبار بھی خرید لیا۔

اس نے میخیں ٹھوک کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس پر کپڑے کی دو تہیں اور ایک کمبل ٹانک دیا۔ باقی اشیا سے اس نے کھڑکی ڈھانپ دی اور اس کے کناروں سے جو روشنی اندر داخل ہو رہی تھی، اس کا راستہ چوبی تختیوں سے بند کر دیا۔ اسے تحفظ کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اس کے دل پر بوجھ بن کر چھا گیا کہ وہ ابدیت کا اسیر ہو گیا ہے۔ آرگون کا دماغ بھٹکنے لگا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور چھوٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔

نیند اس کی مسرت میں نہ تو تخفیف کر سکی اور نہ اسے ذرا بھی غیر موثر بنا سکی۔ جب اس کی آنکھ کھلی، آہنی سپرنگ اس کے جسم میں بل کھا رہے تھے اور کچھ یوں لگ رہا تھا وہ جست لگانے کے لیے تیار ہیں جیسے ان میں جان پڑ گئی ہو۔ نیا دن، نیا زمانہ...... درخشاں طلائی سفوف کی دھند میں لپٹا لپٹا یا کل، کل کے بعد پرسوں، پرسوں کے بعد آنے والے دنوں کا پورے کا پورا گروہ، اس کی امیدوں کا پیام بر بن کر اس کے لیے چشم براہ تھا۔ آرگون کے چہرے پر تبسم بکھر گیا، وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ اب، اسی لمحے، کسی بھی رکاوٹ کے بغیر ہر چیز بے شمار امکانات کے ساتھ اس کے اپنے ہاتھ سے تخلیق کئے

جانے کی منتظر تھی۔ یہ بے حد زبردست لمحہ تھا لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ بے نام سی خلش کیا ہے؟ شاید یہ وہی خلش ہو جو خدا کو تخلیق کائنات سے عین پہلے محسوس ہوئی ہو گی۔ اپنے مسکراتے عضلات کے علاوہ اسے اپنے دیگر چھوٹے عضلات بھی قدرے پھڑ پھڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔

آرگون نے جسیم دیواری کلاک کی تصویر بنائی۔ کانپتے کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اس کی سوئیاں عین بارہ کے ہندسے پر ٹکا دیں۔ اس نے سوچ لیا کہ یہ لمحہ اس کے نئے مقدر کا نقطہ آغاز ہو گا۔

اسے خیال آیا کہ کمرے میں قدرے حبس ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے راہداری کے رخ دیوار پر کھڑکی کی تصویر بنا دی۔ ایں، یہ کیا؟ کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی، کھڑکی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ ایک آدھ منٹ وہ حیران پریشان کھڑا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ کھڑکی بنانے کے لیے جو لوازمات درکار ہیں، وہ اس نے پورے نہیں کیے تھے۔ کھڑکی تبھی نمودار ہو گی جب اس میں سے باہر کا کوئی منظر نظر آئے گا۔

''باہر نظر آنے والے کون سے مناظر بنائے جائیں؟ کون سا منظر بھلا لگے گا؟ ایلپس کے پہاڑ یا خلیج نیپلز؟ موزوں کیا ہو گا؟ پرسکون دیہاتی فضا کا منظر بھی برا نہیں دکھائی دے گا، یا پھر سائبیریا کے قدیمی جنگلات؟ وہ بھی خوبصورت معلوم ہوں گے۔ اس نے پوسٹ کارڈوں پر اور سفری کتابچوں میں جو دلاویز لینڈ سکیپ دیکھے تھے، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے، لیکن اسے ان سب اشیاء میں سے صرف ایک کا انتخاب کرنا تھا اور اسے کسی فیصلے تک پہنچنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔'' خیر چھوڑو، پہلے ذرا مزے دار اشیا بنانی چاہئیں'' اس نے سوچا۔ چنانچہ اس نے وسکی اور پنیر کے خاکے بنائے۔ جب وہ انہیں دھیرے دھیرے کھا پی رہا تھا تو وہ بیرونی مناظر کے بارے میں بھی سوچ بچار کرنے میں مستغرق تھا۔

وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا اتنا ہی کم اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

''یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ میں نے...... بلکہ کسی نے بھی...... کبھی اسے کرنے کا سوچا تک نہیں۔ اب جب کہ میں نے اس کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے، محض چند ندی نالے اور باغات، پہاڑ اور سمندر، یا اس قسم کی دوسری چیزیں، جو آنکھ کو

راحت پہنچاتی ہیں، بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ فرض کرو میں کوئی پہاڑ بنا دیتا ہوں، لیکن یہ محض پہاڑی ہی تو نہیں ہو گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس سے آگے کیا ہو گا؟ شہر؟ سمندر؟ صحرا؟ وہاں کس قسم کے لوگ رہائش پذیر ہوں گے؟ کس قسم کے جانور ہوں گے؟ (تصویر کشی کے دوران میں) میں غیر شعوری طور پر ان چیزوں کا فیصلہ کر رہا ہوں گا۔ نہیں، اس کھڑکی کو کھڑکی بنانا سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس میں تو ایک دنیا تخلیق کرنے کا مسئلہ شامل ہے۔ صرف چند خطوط کے ذریعے ایک دنیا دکھانا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھے موقع پر جو بات سوجھے، اسی کے مطابق عمل کروں؟ نہیں، باہر کے منظر کی تصویر اٹکل پچو نہیں بنائی جا سکتی۔ مجھے ایسے شاہکار تخلیق کرنا ہو گا جو کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا ہو گا۔''

آرگون گہری سوچ بچار میں کھو گیا۔

وسیع و عریض دنیا کی تصویر بنانے کے متعلق سوچتے ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اس کی تشفی نہ ہو سکی۔ ایک بار پھر کمرے میں کینوس ہی کینوس نظر آنے لگے اور اندرونی فضا میں تارپین کے تیل کی بو باس رچ بس گئی۔ اس نے درجنوں ابتدائی خاکے بنائے اور کمرے میں ان کا ڈھیر لگ گیا۔ تاہم وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا، وسعت کے اعتبار سے مسئلہ اتنا ہی بڑا اور گمبھیر ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ کام اس کی بساط سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ جرأت رندانہ کا مظاہرہ کرے اور وہی کرے جو اسے عین موقع پر سوجھے، لیکن اس صورت میں دنیا تخلیق کرنے کا نتیجہ صفر رہے گا۔ اگر وہ ناگزیر طور پر محض جزوی حقیقت پیش کر سکا تو اس حقیقت میں خلقی طور پر جو تضادات موجود ہوں گے، وہ اسے ماضی کی طرف دھکیل دیں گے اور یوں غالباً ایک بار پھر فاقہ کشی کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے علاوہ چاک بھی ہمیشہ باقی نہیں رہے گا، یہ جلد یا بدیر ختم ہو جائے گا۔ اسے کسی نہ کسی طور دنیا پیش کرنا ہے۔

دوسرا ہفتہ پرخوری اور بلانوشی میں گزر گیا۔

تیسرا ہفتہ مایوسی اور جھنجھلاہٹ میں، جو دیوانگی کو چھونے لگی تھی، گزر گیا۔ ایک بار پھر اس کے کینوس گرد میں اٹ گئے اور تیل کی بو تقریباً عنقا ہو گئی۔

آخر کار چوتھے ہفتے آرگون نے پختہ تہیہ کر لیا، یہ اس کی کامل مایوسی کا نتیجہ تھا۔ اب اس کے لیے مزید انتظار ناممکن ہو چلا تھا۔ اپنے ہاتھ سے کھڑکی کے باہر کے منظر کی

تصویر بنانے کی ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے کے ارادے سے اس نے خطرہ مول لینے اور ہر چیز اتفاق پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں دیوار پر دروازے کا خاکہ بناؤں گا اور اس کے باہر وہی ہو گا جو اس وقت وہاں موجود ہے۔ اس کا نتیجہ خواہ ناکامی کی صورت میں نکلے، خواہ وہی منظر بن جائے جو اس وقت فلیٹ کے باہر نظر آ رہا ہے، میرا کام بن جائے گا اور میں اس ذمے داری سے بچ جاؤں گا جس نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ کیا ہوتا ہے، مجھے اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں، بچ جانا ہی بہتر ہے۔''

آرگون نے بہت مدت کے بعد پہلی مرتبہ کوٹ پہنا۔ یہ اس نے دنیا کی تخلیق کے احترام میں رسم نبھانے کی خاطر پہنا تھا۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسراف کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے اکڑے ہوئے ہاتھ سے مقدر کا چاک نیچے کیا۔

دروازے کی تصویر! اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ کیا دروازے کے باہر کا منظر عظیم ترین راز نہیں جو انسان کے تصور میں آ سکتا ہے؟ شاید انعام کے طور پر موت اس کی منتظر ہے۔

اس نے چٹخنی پکڑی، ایک قدم پیچھے ہٹا اور دروازہ کھول دیا۔

ڈائنامیٹ کا دھماکہ ہوا اور اس کے ریزے اس کی آنکھوں میں گھسنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ہیبت ناک ویرانہ تھا جو دوپہر کے سورج کی روشنی میں اتنا چمک رہا تھا کہ نگاہیں خیرہ ہونے لگیں۔ جہاں تک اسکی نظر کام کرتی تھی، افق کے سوا کسی بھی چیز کا کہیں سایہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے آسمان پر دور دور تک دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے بادل کی ایک ٹکڑی تک نظر نہ آئی۔ گرم اور خشک ہوا چل رہی تھی اور وہ آندھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔

''آہ!............ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے میرے کسی ڈیزائن کا افقی خط بذات خود لینڈ سکیپ بن گیا ہو۔ آہ!......''

ساری حقیقت یہ تھی کہ چاک نے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا تھا۔ اسے شروع سے اب تک سب کچھ تخلیق کرنا تھا۔ اسے اس ویرانے کو پہاڑوں، پانیوں، بادلوں، پودوں، جانوروں اور مچھلیوں سے بھرنا تھا۔ اسے دنیا کا نئے سرے سے خاکہ بنانا تھا۔ اس کا دل

بیٹھ گیا اور وہ دھڑام سے بستر پر گر پڑا۔ اس کے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے، مسلسل بہے جا رہے تھے۔

اس کی جیب میں کوئی چیز سرسرائی۔ یہ وہی اخبار تھا جو اس نے پہلے روز خریدا تھا اور وہ اس کے متعلق بھول چکا تھا۔ پہلے صفحے کی شہ سرخی تھی: ''جنوبی کوریا پر حملہ!'' دوسرے صفحے پر مس جاپان کی تصویر تھی اور اس نے حملے کی خبر سے بھی زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ اس کے نیچے باریک حروف میں ''دفتر روزگار کے این وارڈ میں ہنگامہ'' اور ''یو فیکٹری کے بے شمار ملازمین کی چھانٹی'' کی خبریں چھپی تھیں۔

آرگون حیرت سے نگاہیں گاڑ کر خاصی دیر تک مس جاپان کی نیم برہنہ تصویر دیکھتا رہا۔ کیا شہوت ٹپک رہی ہے! کیا جسم ہے! شیشے کی مانند شفاف جلد ہے۔

''یہی چیز تو میں بھول گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی۔ وقت آ گیا ہے کہ ہر چیز کا آغاز آدم اور حوا سے کیا جائے۔ ہاں، یہ ہوئی نا بات............حوا! میں حوا کی تصویر بناؤں گا!''

آدھ گھنٹہ بعد حوا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ سرتاپا بے لباس تھی۔ وہ حیران پریشان نظر آ رہی تھی اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔

''ارے، کون ہو تم؟ ارے! میں تو بالکل بے لباس ہوں۔ یہ کیا ہوا؟''

''میں آدم ہوں، تم حوا ہو۔'' آرگون نے شرماتے شرماتے کہا۔

''کیا کہا، میں حوا ہوں؟ تبھی میں بے لباس ہوں۔ لیکن تم نے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟ آدم، مغربی لباس میں! بڑی انہونی بات ہے!

اچانک اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں حوا نہیں ہوں۔ میں مس جاپان ہوں۔''

''تم حوا ہو۔ تم حقیقتاً حوا ہو۔''

''تم مجھے باور کرانا چاہتے ہوں کہ تم آدم ہو............اس ملبوس میں!............ اس ٹوٹے پھوٹے فلیٹ میں؟ کیا بات کرتے ہو؟ جانے دو، مجھے میرے کپڑے لوٹا دو۔ ویسے میں یہاں کیا کر رہی ہوں؟ مجھے تو فوٹو مقابلے میں خصوصی ماڈل کی حیثیت سے پیش ہونا ہے۔''

''ارے نہیں۔تم سمجھ نہیں رہیں۔تم حوا ہو، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔''

''مجھے ذرا سنبھلنے کا موقع تو دو۔ دو گے؟ اچھا، سیب کہاں ہے؟ اور میرا خیال ہے یہ باغ عدن ہے؟ واہ! میری تو ہنسی چھوٹی جا رہی ہے۔ اب تو میرے کپڑے دے دو۔''

''خیر، کم از کم میری بات تو سنو۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔ پھر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے تم کہو تو میں تمہیں کچھ کھانے کو پیش کروں؟''

''ہاں، بالکل نیک کام میں دیر کیا۔ پر جلدی کرو اور میرے کپڑے مجھے لوٹا دو۔ ٹھیک؟ میرا جسم بہت قیمتی ہے۔''

''کیا پسند کرو گی؟ کھانوں کی اس کتاب سے جو جی چاہے، منتخب کر لو۔''

''خوب، بہت خوب! یہ جگہ تو بڑی گندی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس کھانے پینے کی اشیا کی کوئی کمی نہیں۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ممکن ہے تم واقعی آدم ہو۔ ویسے تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟ نقب زنی؟''

''نہیں۔ میں نقب زن نہیں، آدم ہوں۔ میں آرٹسٹ بھی ہوں اور میں دنیا کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''سمجھتا تو میں بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اتنا مضمحل ہوں۔''

جب وہ باتیں کرتا کرتا تیزی سے برش چلاتا کھانے پینے کی اشیاء کی تصویریں بنا رہا تھا تو وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی اور پھر اچانک بول پڑی: ''واہ، کیا بات ہے! تو یہی باغ عدن ہے؟ ٹھیک؟ اخاہ! خوب، بہت خوب! اچھا، میں حوا بن جاتی ہوں۔ مجھے حوا بننے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہم امیر ہو جائیں گے..........ٹھیک؟''

''حوا! ذرا میری بات سنو، مہربانی ہو گی۔''

غمگین آواز میں آرگون نے اسے اپنی ساری داستان سنا دی اور آخر میں کہنے لگا: ''تم سمجھ گئی ہو نا کہ تمہارے تعاون سے ہمیں یہ دنیا تخلیق کرنا ہے؟ روپے پیسے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ہمیں سب کچھ بالکل شروع سے کرنا ہو گا''

مس جاپان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''کیا کہا؟ روپے پیسے کا کوئی تعلق نہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔تم کہنا کیا

چاہتے ہو؟ میں بالکل سمجھ نہیں پائی۔''

''اگر تم اسی انداز سے گفتگو کرنا چاہتی ہو تو خیر۔ پھر دروازہ کھول کر باہر کیوں نہیں جھانک لیتیں؟''

اس نے اس دروازے میں سے، جو آرگون نے نیم وا رکھ چھوڑا تھا، باہر دیکھا۔

''اف، خدایا! کیا بھیانک منظر ہے!''

اس نے دھماکے سے دروازہ بند کر دیا اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''لیکن اس دروازے کے متعلق کیا خیال ہے؟'' اس نے اس کے اصلی، کمبل میں لپٹے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''مختلف! میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔''

''نہیں، ایسا نہ کہو۔ یہ بالکل بیکار ہے۔ یہ اس دنیا، کھانے پینے کی اشیاء، ڈیسک، پلنگ، سب کا بلکہ تمہارا اپنا وجود بھی مٹا دے گا۔تم نئی حوا ہو۔ اور ہم لازماً اپنی نئی دنیا کے جدِ اعلیٰ بنیں گے۔''

''اجی کیا بات کر رہے ہو۔ مجھے بچے وچے نہیں چاہئیں۔ بالکل نہیں۔ میں برتھ کنٹرول کے حق میں ہوں۔ میرا مطلب ہے بچے نری مصیبت ہیں۔ اور مزید بات یہ ہے میں غائب نہیں ہوں گی۔''

تم غائب ہو جاؤ گی۔

''میں بالکل نہیں ہوں گی۔ میں اپنے آپ کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں میں ہوں۔ یہ غائب ہونے کا چکر..............تم بالکل الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔''

''میری پیاری حوا، تم کچھ نہیں سمجھتیں۔ اگر ہم دنیا کی تخلیق تو نہیں کریں گے تو ہم جلد یا بدیر فاقہ کشی کا شکار ہو جائیں گے۔''

''تم مجھے ''پیاری'' کہہ رہے ہو؟ واقعی؟ کیا دیدہ دلیری ہے! اور تم کہتے ہو میں بھوکوں مر جاؤں گی؟ واہ کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو! تمہیں معلوم نہیں میرا جسم کتنا قیمتی ہے؟''

''نہیں، تم کچھ بھی نہیں۔ تم بالکل ویسی ہی ہو جیسا میرا چاک ہے۔ اگر تم نے

ہماری اپنی دنیا حاصل نہ کی تو تمہارا وجود محض افسانہ بن کر رہ جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔''

''بہت اچھا۔ فضول گفتگو بہت ہو چکی ہے۔ اب جانے دو، مجھے میرے کپڑے لوٹا دو، میں جا رہی ہوں۔ اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ میرا یہاں موجود ہونا ہی عجیب سی بات ہے۔ مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے۔ تم کوئی جادوگر یا اس سے ملتی جلتی چیز ہو۔ خیر، جلدی کرو۔ شاید میرا منیجر انتظار کرتے کرتے تنگ آ گیا ہو گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں کبھی کبھار یہاں آ جایا کروں اور تمہاری حوا بن جایا کروں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ جب تک تم چاک استعمال کر سکتے ہو، میں جو چاہوں مجھے دے دیا کرو۔''

''احمق مت بنو! تم یہ نہیں کر سکتیں۔''

آرگون کے غیر متوقع اور متشددانہ لہجے نے اسے چونکا دیا اور وہ اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگی۔ وہ ایک ثانیہ چپ چاپ ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کیا سوچ رہی تھی لیکن وہ پرسکون اور دھیمے لہجے میں بولی: ''بہت اچھا، میں یہیں ٹھہر جاتی ہوں لیکن اس کے عوض کیا تم میری ایک خواہش پوری کرو گے؟''

''وہ کیا؟ خیر، تم جو چاہو، میں پورا کروں گا۔''

''مجھے تمہارا آدھا چاک چاہیے۔''

''عقل کی بات کرو۔ فضول مطالبے مت کرو۔ مائی ڈیئر! تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تصویر کیسے بنائی جاتی ہے۔ چاک تمہارے کس کام آئے گا؟''

''مجھے معلوم ہے تصویر کیسے بنائی جاتی ہے۔ میری شکل وصورت سے بے شک ظاہر نہ ہوتا لیکن میں اتنا بتائے دیتی ہوں میں کبھی ڈیزائنر ہوا کرتی تھی۔ میں مساوی حقوق پر اصرار کرتی ہوں۔''

آرگون نے اپنا سر ذرا سا ایک طرف ڈھلکایا۔ پھر وہ دوبارہ سیدھا ہو گیا اور فیصلہ کن انداز سے بولا۔ ''بہت اچھا، مجھے تم پر اعتبار ہے۔''

اس نے بڑی احتیاط سے چاک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ایک ٹکڑا حوا کو دے دیا۔ جونہی اسے ٹکڑا ملا، اس نے دیوار کی طرف رخ کیا اور تصویر بنانے لگی۔

یہ پستول تھا۔

''بند کرو! تم اس چیز سے کیا کرنا چاہتی ہو؟''

''موت! میں موت بنانا چاہتی ہوں۔ ہمیں بعض چیزیں تقسیم کرنا ہیں۔ یہ دنیا بنانے کے لیے بہت اہم ہیں۔''

''نہیں۔ یہ تو انجام ہو گا۔ بند کرو۔ یہ انتہائی غیر ضروری چیز ہے۔''

لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ حوا کے ہاتھ میں ننھا منا پستول آ چکا تھا اور وہ اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئی تھی۔ اس نے اسے اوپر اٹھایا اور سیدھا اس کی چھاتی پر شست باندھ لی۔

''اگر تم اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ آدم! تم نرے احمق ہو۔ تمہیں معلوم ہی نہیں وعدہ جھوٹ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تم تھے جس نے مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا۔''

''کیا؟ اب تم کیا بنا رہی ہو؟''

''ہتھوڑا۔ اس دروازے کو توڑنے کے لیے۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں!''

''اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گی!''

جونہی وہ چھلانگ لگا کر آگے بڑھا، پستول چل گیا۔ ضعف سے اس کے گھٹنے لڑکھڑانے لگے۔ اس نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ عجیب بات یہ تھی کہ کہیں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔

''احمق آدم۔''

حوا کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ پھر اس نے ہتھوڑا اٹھایا اور پوری قوت سے دروازے پر دے مارا۔ روشنی اندر آنے لگی۔ یہ اتنی تیز تو نہیں تھی لیکن تھی اصلی۔ یہ سورج کی روشنی تھی۔ اچانک حوا اس میں دھند کی طرح تحلیل ہو گئی۔ ڈیسک، پلنگ، فرانسیسی کھانے، ''سب کچھ آناً فاناً غائب ہو گیا۔ آرگون، کھانے پکانے کی کتاب، جو فرش پر گر پڑی تھی اور کرسی کے سوا ہر چیز کی کایا پلٹ گئی اور تصویر کی شکل میں دوبارہ دیوار پر چپک گئی۔

آرگون لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا۔ اس کا چھاتی کا زخم مندمل ہو چکا تھا لیکن موت سے بھی کوئی توانا چیز اسے اپنی طرف بلا رہی تھی، اسے اپنی طرف کھینچ رہی

تھی............ یہ دیوار تھی۔ دیوار اسے آوازیں دے رہی تھی۔ اس کا جسم، مسلسل چار ہفتوں سے دیوار کی جو تصویریں چاٹ رہا تھا، انہوں نے اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ اب مدافعت ناممکن تھی۔ آرگون ڈگمگاتے قدموں سے دیوار کی جانب بڑھا اور حوا کی تصویر کے اوپر کی جانب کھنچ گیا۔

گولی چلنے اور دروازہ ٹوٹنے کی آوازیں عمارت کے دوسرے مکینوں کے کانوں تک پہنچ گئیں۔ جب وہ بھاگتے دوڑتے اندر پہنچے، آرگون مکمل طور پر دیوار میں جذب ہو چکا تھا۔ لوگوں کو کرسی، کھانے پکانے کی کتاب اور دیوار پر تیزی سے گھسیٹی ہوئی تصویروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ آخر انہوں نے اسے حوا کے اوپر لیٹے ہوئے دیکھا۔ کسی نے کہا: ''کسی عورت کی خاطر بھوک کاٹتا رہا اور آخر مر گیا''

''دیکھنے میں تو بالکل وہی نظر آتا ہے۔ کیا خیال ہے؟'' کسی دوسرے نے کہا۔

آخر وہ کر کیا رہا تھا؟ بھلا اس طرح بھی دروازے کا ستیا ناس مارا جاتا ہے! ذرا ادھر دیکھیں، ساری دیوار پر گھسیٹے مارے ہوئے ہیں۔ ہونہہ! وہ اس طرح تو نہیں بچ سکتا، اپنے کیئے کی لازماً سزا پائے گا۔ لیکن وہ گیا کہاں؟ اپنے آپ کو مصور کہتا تھا۔ ہونہہ!''

جو شخص آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا، وہ عمارت کا منیجر تھا۔

جب سب لوگ چلے گئے، دیوار سے آواز گنگناتی سنائی دی:

''چاک سے نئی دنیا نہیں بنائی جا سکتی۔''

دیوار سے واحد قطرہ ٹپکا اور تصویری آرگون کی آنکھ کے عین نیچے گر پڑا۔

مشیما یوکیو

انڈے

مشیما یوکیو (Mishima Yukio) (1925ء تا 1970ء) پہلے جاپانی ادیب تھے، جنھیں جب اپنے وطن میں شہرت نصیب ہوئی تو تقریباً اسی وقت ان کا بیرونی ممالک میں بھی ڈنکا بجنے لگا۔ ان کا اولین ناول ''لہروں کی آواز'' 1954ء میں شائع ہوا اور اس کے صرف دو سال بعد 1956ء میں اس کا انگریزی ترجمہ منظرِ عام پر آ گیا۔ اس وقت ان کے ادبی کیریئر کے آغاز کو محض سات برس بیتے تھے۔ ان کی زندگی کے بقیہ چودہ سالوں کے دوران میں ان کی مزید گیارہ کتابیں ترجمہ ہوئیں اور کوئی دوسرا مصنف ان کے اس ریکارڈ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ انھیں غیر ممالک میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھیں اعلیٰ درجے کی جاپانی جمالیات کو مغربی انداز کی ادبی روایت کے ساتھ مربوط کرنے کا گر آتا تھا۔ یوں مغرب کی نگاہوں میں ان کی تحریروں پر غیر ملکی رنگ بھی چڑھ جاتا تھا اور وہ ان کی سمجھ میں بھی آسانی سے آ جاتی تھیں۔ اس کتاب میں شامل کہانی ''انڈے'' (1953ء) میں بھی اسی رنگا رنگ خوشہ چینی کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اگرچہ میشیما کے اپنے الفاظ میں ''انڈے'' امریکی کہانی نویس ''ایڈگر ایلن پو کے انداز میں فارس (Farce)'' (ایک قسم کا مزاحیہ ڈراما یا کہانی جس میں کردار غیر امکانی صورتِ حال میں پھنسے نظر آتے ہیں) ہے، بیضی مخلوق سے جاپانی داستانوں کی بے چہرہ چڑیلیں بھی یاد آ جاتی ہیں۔

مشیما یوکیو نے 1970ء میں سیمورائی انداز سے خودکشی کر لی تھی۔ یہ خودکشی ان کے لیے ایک اور قسم کی شہرت کا باعث بنی۔ اب ان کی تصانیف کو موت و حیات کی گتھی سلجھانے کے لیے بطور نفسیاتی ہتھیار استعمال کیا جانے لگا۔ جاپان میں خودنوشت سوانح کے انداز میں ناول لکھنے کا رواج تھا۔ میشیما نے اس روایت کو پائے تحقیر سے ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی کی بات

ہے کہ ان ہی کی تحریروں کونفسیاتی موشگافیوں کے لیے بروئے کار لایا گیا۔ ان کی موت کو ستائیس سال بیت گئے ہیں لیکن ان کی تصانیف سے میشیما کا بطور انسان جائزہ لینے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور یہی چیز ان کی تحریروں کے معروضی جائزے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے۔ مغرب کی طرح جاپان کی نئی نسل بھی ان کی کتابوں کا مطالعہ تشکیکی انداز سے شروع کرتی ہے تاہم جب قارئین کو اپنے گھڑے گھڑائے تصورات کے نیچے بالکل مختلف قسم کے میشیما نظر آتے ہیں، تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ منضبط رومانیت، زبان کے لیے تقریباً مذہبی نوعیت کا احترام اور نفس انسانی کی تکلیف دہ حد تک صحیح چیر پھاڑ میشیما کی تحریروں کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں گی۔

میشیما کی تحریروں کا ایک اور وصف ان کا مزاحیہ پن ہے۔ ترجمے میں ان کا یہ وصف اکثر غطر بود ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کی کہانی ''انڈے'' میں یہ کسی حد تک برقرار ہے۔ یہ مصنف کی پسندیدہ کہانیوں میں شامل تھی۔ انہوں نے اس کے متعلق لکھا تھا: ''حکام طلباء کی تحریکوں پر جس طرح کی رائے زنی کرتے رہتے ہیں، اسے اس کی پیروڈی سمجھا جا سکتا ہے لیکن میرا مقصد طنز سے آگے بڑھ کر مہملیت (Nonsense) دکھانا تھا۔ میرے قلم نے سوچ کے عاری پن کی انتہائی صورت کو اس سے زیادہ شاید ہی کبھی اجاگر کیا ہو گا۔''

چوکیچی، جتارو، موسوکے، ست سویو اور انگورو موج میلا اڑانے پر تلے رہتے تھے۔ کالج کے پانچوں طالب علم لمبے تڑنگے، دبلے پتلے اور کڈھنگے تھے۔ وہ ہر وقت اودھم مچاتے رہتے تھے لیکن اتنے ست الوجود تھے کہ ان کے لیے کلاسوں میں جانا ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ سارے کشتی رانوں کی ایک ہی ٹیم کے رکن تھے اور اپنی زندگی یوں گزار رہے تھے جیسے وہ کسی تربیتی کیمپ میں شرکت کر رہے ہوں۔ وہ ایک پرائیویٹ بورڈنگ ہاؤس کے وسیع وعریض کمرے کے، جس کے فرش پر تیلیوں کی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، اخراجات مل کر برداشت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بورڈنگ ہاؤس کا مرحوم مالک ایک ایسے پرانے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا جس میں انسانی جسم کے متاثرہ حصے پھیلنے اور سخت ہونے لگتے ہیں اور جلد ہاتھی کی کھال کی طرح کھردری اور غیر ملائم ہو جاتی ہے اور اس نے یہ کمرا محض اس

لیے بنوایا تھا کیونکہ اسے اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا اس کا روز افزوں بڑھتا اور پھیلتا جسم عام جسامت کے کمرے میں نہیں سما سکے گا۔ پانچوں طالب علموں کا آپس میں مقابلہ ہوتا رہتا تھا کہ سب سے دیر میں کون سو کر اٹھے گا اور وہ اپنے اس بے لچک اصول پر سختی سے عمل کرتے تھے کہ وہ سونے کے بعد اپنے بستر کبھی تہہ نہیں کریں گے۔

چوکیچی کی بری عادت یہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں کی اشیا پر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا اور ظاہر یہ کرتا تھا کہ اس سے یہ سب کچھ نیم خوابیدگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ وہ جھپکی لے رہا ہے لیکن اگلے ہی لمحے پتا چلتا تھا کہ اس کے ہم جلیس کی ڈیسک کے نیچے اخروٹ کی مٹھائی کا وزنی ڈبا خالی ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ بڑے مزے کا واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ اس نے غلطی سے اپنے ایک دوست کی سکول یونیفارم پہن لی۔ جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے ایک بٹوا ملا جو غیر معمولی طور پر نوٹوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا شاید اس کے دوست نے نشے کی حالت میں کسی کا پرس کھسکا لیا ہے۔ اپنی طرف سے اس نے بڑی ایمانداری کا مظاہرہ کیا اور بٹوا دوست کو لوٹانے کی بجائے پولیس کے سپرد کر دیا۔

جتارو ناقابل اصلاح حد تک عورتوں کا شکاری تھا۔ اس سے بھی زیادہ متاثر کن بات یہ تھی کہ وہ انہیں بچ نکلنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ ایک شام وہ کسی دوشیزہ کا تعاقب کرتے کرتے شاہی محل کے باغات کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بدقسمتی سے محافظ نے اسے اندر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ خندق میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا تیرتا پتھر کی دیوار تک پہنچ گیا۔ جب وہ دیوار پر چڑھا تو اسے وہ دوشیزہ شاہی محل کی طرف جاتی دکھائی دی۔ وہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور پہلے سے بھی زیادہ عزم صمیم کے ساتھ اس کا پیچھا کرنے لگا۔ جب وہ آگے بڑھا، اسے ملکہ کی شکل نظر آئی۔ وہ شاہی محل کے اندر اپنی خواب گاہ میں پلنگ پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا سپید شاہی پاؤں آگے بڑھا رکھا تھا۔ نوخیز دوشیزہ نے اپنے پرس سے موچنا نکالا، بڑی مہارت اور ملائمت سے شاہی پاؤں سے پھانس نکالی اور یوں ملکہ نے درد سے نجات پا لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نوخیز دوشیزہ ملکہ کی خاص الخاص مصاحبہ تھی اور اسے بازار موچنا خریدنے بھیجا گیا تھا۔ جب وہ اپنے مکان کی طرف واپس آ رہی تھی، جتارہ جھاڑیوں میں

سے نکلا اور لپکتے ہی اس پر چھا ڈال دیا۔ لیکن دوشیزہ نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس نے جھٹ موچنا نکالا جو پودوں کی تراش خراش کرنے والی قینچی سے کسی طور چھوٹا نہیں تھا اور اس سے اسے ڈرانے دھمکانے لگی۔ جتارہ کی چیں بول گئی اور وہ بزدلوں کی طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

موسوکے بھولا بھالا بلکہ کوتاہ فہم نوجوان تھا۔ اسے جھوٹ تراشنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ اس کی دروغ گوئیاں بالکل ناقابل یقین ہوتی تھیں۔ ''سورج مشرق سے نکلتا ہے اور چاند.........تمہیں معلوم ہے یہ بالکل سچی بات ہے کیونکہ میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔'' وہ شگفتہ روئی سے دعویٰ کرتا۔ یا پھر وہ کہتا: ''آج مجھے ایک مردِ ضعیف نظر آیا.......... ذرا سوچو، وہ بوڑھا تھا! تمہیں معلوم ہے یہ بالکل سچی بات ہے کیونکہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' اس کے دوست اس کی باتوں کا اعتبار تو نہیں کرتے تھے لیکن وہ اس کی سنتے ضرور تھے اور جو کچھ وہ کہتا تھا، اس پر مسکرانے لگتے تھے اور ظاہر یہ کرتے تھے کہ وہ اس کی باتوں میں آ گئے ہیں۔ چند روز پہلے موسوکے ایک دلچسپ قصہ لے کر آ گیا۔ یہ اس نے یونانی مورخ پلوتارخوس (Plutarch) کی کتاب ''متوازی سیرتیں'' میں پڑھا تھا۔ اس نے بیان کیا: ''انطونی اور قلوپطرہ مچھلیوں کے شکار پر نکلے تھے۔ انطونی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ اسے ترکیب سوجھی۔ اس نے کسی مچھیرے کے ساتھ ساتھ گانٹھ کی۔ مچھیرا پانی میں کود گیا اور اس نے ایک مچھلی انطونی کی ڈور کے کانٹے میں پھانس دی۔ بدقسمتی سے انطونی سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے جھٹ پٹ ڈور کھینچ لی۔ قلوپطرہ اس کی چالاکی سمجھ گئی۔ اس وقت تو وہ انطونی کی ہنرمندی کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرتی رہی لیکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ اگلے روز اس نے چپکے سے کسی غوطہ خور کو ساتھ ملا لیا اور اس سے کہا کہ وہ انطونی کے کانٹے کے ساتھ اچار کی مچھلی باندھ دے۔ جب انطونی نے ڈور کھینچی، ہر شخص پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا'' تاہم موسوکے کے چاروں دوستوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آدمی بے شک پلوتارخوس کی کتاب پہلے سے آخری صفحے تک پڑھ جائے، اسے یہ کہانی کہیں نہیں ملے گی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے پر اکتفا کیا کہ وہ اصل حقیقت جانتے ہیں۔

ست سویو متشدد طبیعت کا نوجوان تھا۔ اسے ایسے جھگڑے پسند تھے جن میں ایک دوسرے کو کھینچا، گھسیٹا اور زمین پر گرایا جاتا ہے۔ جب وہ پرائمری سکول میں پڑھا کرتا تھا وہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا تھا اور اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔ وہاں اسے چاول کی کھچڑی کے سوا اور کچھ کھانے کو نہیں دیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ اس تاک میں رہتا کہ کب نرس گپ شپ لڑانے ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چپکے سے اٹھتا، رینگتا رینگتا کھڑکی کے پاس پہنچتا، پھرتی سے کسی چڑیا کو پکڑتا، اپنے ہی بخار سے جھلستے جسم کے ساتھ لگا کر بھونتا اور حلق سے نیچے اتار لیتا۔ جب وہ لگ بھگ دس بارہ چڑیاں کھا چکا تو اس کا بخار اتر گیا اور وہ صحت یاب ہو گیا۔ جب وہ مڈل سکول میں داخل ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ قریبی جنگل میں نکل جاتا، حیلوں بہانوں سے سانپ پکڑتا، اس کے قتلے بناتا، ان میں سبزیاں اور مصالحے ڈالتا اور جاپانی طریقے سے اتنی بڑھیا ہانڈی بناتا کہ دیکھنے والے کے منہ میں پانی بھر آئے۔ جب سانپ کھا کھا کر اس کے جسم میں خوب توانائی آ گئی تو اس نے سوچا بوڑھے اور چڑچڑے ہیڈ ماسٹر کو ذرا سبق سکھانا چاہئے۔ ایک رات جب ہیڈ ماسٹر اپنے گھر میں محو خواب تھا وہ یوں دبے پاؤں اس کی خوابگاہ میں داخل ہوا کہ کسی کو اس کی آمد کی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ اس نے ہیڈ ماسٹر کے گنجے سر پر بارود چھڑکا، اس کے دونوں بہرے کانوں میں موم بتیاں گھسیڑیں اور پلک جھپکنے میں انہیں تیلی دکھا دی۔ لوگ اب تک اس محیر العقول واقعے کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ شعلے سسکار رہے اور ہیڈ ماسٹر کے سر کے اوپر رقص کر رہے تھے۔ پھر اس کے کانوں سے پھل جھڑیاں پھوٹنے لگیں جو رنگ برنگے جسیم گلہائے داؤدی کی مانند نظر آ رہی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس ان گھڑت لیکن موثر علاج نے یہ اعجاز دکھایا کہ اس کے سر پر سیاہ بالوں کے گچھے پھوٹ آئے اور اس کا بہرا پن فوراً ہی جاتا رہا۔ ست سویو کی بڑی واہ واہ ہوئی اور انجام کار اسے سرٹیفکیٹ آف میرٹ کا مستحق گردانا گیا۔

انگورو بلانوش تھا۔ ابھی وہ پالنے میں ہی تھا کہ وہ خاندان کے شراب کشید کرنے کے کارخانے میں چاول کی شراب کے مٹکے میں گر پڑا۔ اس کے ڈوب جانے کا اندیشہ تھا مگر جب خود اسے خطرے کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ پٹ غٹا غٹ شراب پینا شروع کر دی۔ چند ہی سیکنڈ میں شراب کی سطح اس کے پیٹ تک رہ گئی اور وہ آسانی سے کھڑا ہونے

کے قابل ہو گیا۔ ڈوبنے پر پینے کو ترجیح دے کر بچے نے بڑی ہوشیاری سے اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔

جب یہ پانچوں اکٹھے رہ رہے ہوں گے تو پڑوس کے لوگوں کو جو غصہ آتا ہو گا اور وہ جس ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہوں گے، اس کا آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان پانچوں کو کسی چیز سے خوف نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس کمزوروں کی طرح خواب دیکھنے اور عقل مندوں کی طرح سوچنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ وہ پانچوں کے پانچوں اس بات پر تہہ دل سے ایمان رکھتے تھے کہ دنیا میں اصل چیزیں صرف دو کے پانچوں اس بات پر تہہ دل سے ایمان رکھتے تھے کہ دنیا میں اصل چیزیں صرف دو ہیں: ایک ان کے جسم اور دوسری کشتیاں، جن کو وہ کھینے کی اکثر مشق کرتے رہتے تھے۔ رہیں عورت اور کھانے پینے کی اشیاء تو ان کا خیال تھا کہ ان کا تعلق کسی اور اقلیم سے ہے۔ جس طرح آرڈر دینے پر دکاندار گھریلو استعمال کی اشیا لوگوں کے گھروں میں بھیج دیتے ہیں، انہیں بھی حسب ضرورت محض آرڈر پر منگوایا جا سکتا ہے۔ اس عقیدے سے ماورا ان کے نزدیک دنیا کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اگر یہ پانچوں خود اعتماد نوجوان نیلگوں آسمان کی طرف دیکھتے اور ہنستے ہنستے بیک وقت اپنے منہ کھول دیتے تو خود اعتمادی کی اس نمائش پر سورج لرز اٹھتا، صدمے کی تاب نہ لا کر ان میں سے کسی نہ کسی کے منہ میں آ گرتا اور اس کی زبان جھلس دیتا۔

یہی نہیں، اپنی پرلطف مسخرگیوں کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان کی جسمانی حالت نظر انداز نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ان کا دستور بن گیا تھا کہ وہ ہر روز ناشتے پر ایک ایک کچا انڈا ضرور کھاتے تھے۔

بورڈنگ ہاؤس کی مالکہ ان کا ناشتہ کمرے کے درمیان میں بہت بڑی میز پر، جس کی ٹانگیں نسبتاً چھوٹی تھیں، سجا دیتی تھی۔ وہ پانچوں کے پانچوں اپنے لحافوں اور چادروں کو ٹھوکر مار کر ایک طرف پھینک دیتے اور ہنستے کھلکھلاتے میز کے گرد جمع ہو جاتے۔ ناشتے کے سامنے بیٹھے ان کے تیوروں سے ٹپکتا جیسے وہ خود میز کو بھی چٹ کر کے ہی دم لیں گے۔

جب مالکہ ان کے پیالوں میں چاول ڈال رہی ہوتی تو چوکیچی اپنی کھانے کی تیلیوں کی نوکوں سے اپنی پیٹھ کھرچنے لگتا، جتارو اپنی شوربے میں ڈبو دیتا اور میز پر اشتعال

انگیز تحریریں گھسیٹنے لگتا ان گھڑت موسو کے اپنی منہ میں پھنسا کر باہر لٹکا دیتا اور کہتا یہ ہاتھی کے دانت ہیں، ست سویو ان سے مکھیاں مارنے کا کام لیتا، اور رہا انگورو تو وہ اپنی شکل کچھ اس طرح کی بنا لیتا جیسے اسے چاولوں میں نام کو بھی دلچسپی نہ ہو۔

ان سب نے عجیب وغریب روش اپنا لی تھی۔ وہ اپنی کرخت آوازوں میں رسمی انداز سے چلا کر ''پل پڑو'' کہتے اور بیک وقت اپنے سامنے رکھے انڈے اٹھاتے، اپنے اپنے پیالوں سے ٹکرا کر توڑتے اور ایک ہی ملبے میں انہیں حلق سے نیچے اتار لیتے لیکن پیشتر اس سے کہ ان کی یہ رسم شروع ہو، مالکہ، جس کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی اور جسے اپنے کانوں کے پردوں کی بڑی فکر رہتی تھی، جست لگا کر سیڑھیوں سے نیچے بھاگ جاتی تھی۔

اگرچہ اب پڑوسی ان باتوں کے اچھے خاصے عادی ہو چکے تھے لیکن شروع شروع میں جب ان پانچوں نے بورڈنگ ہاؤس میں اپنا ٹھکانہ بنایا تھا اور دوپہر سے ذرا پہلے ان کے دہشت انگیز قہقہوں اور بم پھٹنے والے ہاہا ہو ہو کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے بعض گھبرا کر اپنے گھروں سے باہر نکل آتے تھے۔ ہر روز اس انڈے توڑنے کی رسم کے دوران میں جو بھیانک شوروغل پیدا ہوتا تھا، اس کی گونج چاروں طرف میلوں تک سنائی دیتی تھی۔

چوکیچی ایک لفظ کہے بغیر اپنا انڈہ پی جاتا۔

جنارو اپنے ہونٹ چاٹتا اور آہ بھر کر کہتا: ''یہ عورت کی طرح نرم وگداز ہے!''

موسو کے موقعہ کے عین مطابق کہتا: ''چوزے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے یہ بالکل صحیح بات ہے۔''

ست سویو دبی دبی حقارت آمیز ہنسی ہنستا اور اعلان کرتا: ''جان دار اشیاء بڑی پرلطف ہوتی ہیں۔''

اور انگورو اپنا نچلا ہونٹ لٹکاتا اور غصے سے پھنکار کر کہتا: ''مجھے پھینٹے ہوئے انڈوں، دودھ اور شراب کا مسکچر چاہیے۔''

ان کے چہروں بشروں سے نظر آتا کہ وہ مطمئن ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے مونہوں کے، گودام جتنے بڑے کھڑکھڑاتے، دروازے کھولتے اور جتنا ممکن ہوتا، اتنا ناشتہ ان کے اندر دھکیلنے لگتے۔ اس کے بعد جہاں ان کا جی چاہتا، وہاں چھت کی طرف ٹانگیں

اٹھا کر لیٹ جاتے۔ جنہیں سگریٹ پینے کا شوق ہوتا، وہ اپنے قریب لیٹے ہوئے دوست کی پیشانی کو بطور ایش ٹرے استعمال کرتے۔

ایک شام وہ کشتی رانوں کی ٹیم کے ایک پرانے رکن کے گھر کھانے پر مدعو تھے۔ تلوں ے تیل میں پکائے گئے ہاتھیوں، کچی مچھلیوں، تلی ہوئی بلیوں، سیاہ دھاریوں والی گولڈفش کے اعلیٰ شوربے، سمندری کائی اور بھونروں کے پتلے شوربے اور شربت میں ابالی ہوئی زرافے کی گردن کی بوٹیوں جیسے نایاب لیکن لذیذ کھانے پیٹوں میں پھونسنے کے بعد وہ چاولوں کے دس دس پیالے بھی کھا گئے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ معمول سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر تانیں اڑاتے اپنے بورڈنگ ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ شراب ان کے اجسام میں بالکل اسی طرح کاملاً سرایت کر چکی تھی جس طرح زیتون کے درختوں کا رس پتوں کے عین کناروں تک پہنچ جاتا ہے، یا گوریلے اپنے دشمنوں کے عین صدر مقام میں ان کے بستروں میں گھس جاتے ہیں۔ اپنے چاروں دوستوں کی مدہوشی کی حالت تک پہنچنے کے لیے انگورو کو شراب کی خاصی بڑی مقدار اپنے پیٹ میں اتارنا پڑی تھی۔ اس نے آج رات ساڑے سات گیلن چاول کی شراب، اٹھائیس بوتل بیئر، پانچ گیلن سوچو شراب، تین بوتل فرانسیسی برانڈی اور پانچ بوتل وسکی پی اور یہ سب کچھ پانچ گھنٹے کے دوران میں ہوا۔ اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہ تھا کیوں نہ آئندہ ایسے موقعوں پر اپنے پیٹ میں کیل ٹھونک لیا جائے اور اس پر سرخ ربن میں لپٹا بوتلیں کھولنے کا آلہ لٹکا دیا جائے۔ پھر کسی قسم کا تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ بس پوری بوتل اپنے حلق کے اندر اتارتا جائے گا، ڈھکن پیٹ کے اندر کھولے گا اور یوں شراب اپنے آپ اندر داخل ہوتی رہے گی۔ پھر جس طرح سانپ انڈے کا محلول پینے کے بعد چھلکا باہر پھینک دیتا ہے، وہ بھی خالی بوتلوں کو باہر اگلتا رہے گا۔

انگورو جس قسم کی مابعد الطبیعیاتی قیاس آرائیوں میں مصروف تھا، اس کے ساتھیوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا کیونکہ اس کے ساتھیوں نے اچانک کشتی رانوں کا گیت الاپنا شروع کر دیا تھا اور اسے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ گاتا بھی جاتا اور ڈکار بھی مارتا جاتا:

ہماری کشتی پیدا ہوئی ہے

دیوتاؤں کے قہر سے
یہ سائرن سے مشابہ ہے
اس کا پینڈا ہموار ہے
صاف شفاف اور تاب ناک ہے،
یہ لہروں کو خاطر میں نہیں لاتی۔
چلو، تیز چلو! ہماری پیاری کشتی!
اس موقع پر انگورو نے کچھ اس طرح ڈکار لی جیسے وہ لے سے لے ملا رہا ہو۔ اس کے باقی ساتھی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور دوبارہ گانے لگے۔
بڑی سے بڑی حریف بھی
کبھی اسے ہرا نہیں سکے گی
کس میں جرأت ہے
اس کی صورت اور رفتار
اس کی قوت اور مہارت
کا مقابلہ کرے؟
چلو، تیز چلو! ہماری پیاری کشتی!
ہاں، ڈکار مارو، ڈکار مارو!

جب تھک جاتی ہے دوڑتے دوڑتے
وہ لگ جاتی ہے پرسکون کنارے کے ساتھ
نرم ولطیف دھوپ میں نہا کر
تازہ دم ہو کر، وہ گنگناتی ہے
''مجھے آدمیوں کی ضرورت نہیں''
چلو، تیز چلو! ہماری پیاری کشتی!
ہاں، ڈکار مار، ڈکار مرو!
قہقہے لگاتے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر گیت گاتے وہ کندھوں سے کندھے ملا کر ٹیڑھی

میڑھی پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ انہیں اپنے میزبان کے گھر سے روانہ ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور رات بھی کافی گزر چکی تھی۔ واحد روشنی یہاں وہاں کھڑے کھمبوں سے آ رہی اور سڑک کے دونوں طرف اونچی سنگی دیوار پر منعکس ہو رہی تھی۔ پہاڑی کی تلہٹی میں بڑی شاہراہ ہونا چاہیے تھی جس پر ٹرامیں چلتی تھیں لیکن کہیں بھی نہ تو ٹراموں کی کھڑکھڑاہٹ اور نہ کاروں کے ہارنوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

چونکہ آخری ٹرام کے گزرنے کے وقت سے دو گھنٹے اوپر بیت چکے تھے، ان پانچوں نے سوچا کہ وہ کسی گندی مندی پھٹیچر ٹیکسی کو روک لیں گے اور ڈرائیور کو ڈرا دھمکا کر کرایہ کم کرا لیں گے۔ تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے اگر انہوں نے کچھ زیادہ ہی دھونس جمانے کی کوشش کی تو ڈرائیور چالاکی سے انہیں تھانے لے جائے گا اور فساد کھڑا کر دے گا۔

لیکن جس شاہراہ پر ٹرام چلتی تھی، اس کا دور دور تک نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر جب وہ کسی ان جانی، تاریک اور قدرے گیلی گلی میں، جس کے دونوں جانب مکان کھڑے تھے، داخل ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول گئے ہیں۔ گلی اتنی تنگ تھی کہ پانچوں کا برابر برابر چلنا ناممکن ہو گیا، چنانچہ انہیں تین اور دو کی ٹولیوں میں تقسیم ہونا پڑا۔

''کوئی بات نہیں۔ اگر ہم چلتے جائیں، کہیں نہ کہیں شاہراہ مل ہی جائے گی'' ایک نے دوسروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ چنانچہ وہ حب سابق ناچتے، گاتے اور ہلا گلا کرتے چلتے رہے۔

گلی کی دونوں جانب کسی پیچیدہ بے ترتیبی سے بنے ہوئے مکان کھڑے تھے۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا اور کہیں سے پتا کھڑکنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ تنگ کھڑکیوں کے انجر جو جھلملاتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں، وہ دراصل دور دور واقع کھمبوں کی روشنیوں کے عکس تھے۔ یہاں وہاں مالشیوں اور نسوانی امراض کے ماہروں کے ناموں کی تختیاں دکھائی دے جاتی تھیں، لیکن تاریکی میں صحیح صحیح یہ معلوم کرنا کہ ان پر لکھا ہوا ہے، دشوار تھا۔ وہ مبہم انداز سے کچھ اس قسم کی عبارتیں پڑھ پاتے: ''ہم نئے مریضوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' یا ''اتوار کے سوا آپ ہر روز شام کو ہمیں اپنے گھر بلا سکتے ہیں۔'' جیسا کہ اس کی عادت تھی ست سویو کے دل میں انہیں اکھاڑ پھینکنے یا توڑنے پھوڑنے کی شدید خواہش منڈلانے لگی لیکن چونکہ وہ اپنے ساتھیوں کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا، اسے اپنی یہ خواہش پوری کرنے کا

موقع نہیں مل رہا تھا اور بالآخر وہ اس سے دست بردار ہو گیا۔

اب گلی کی ایک جانب ایک کوتاہ سنگی دیوار نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ دیوار مرطوب تھی۔ اس پر جگہ جگہ کائی اگ رہی تھی اور اس سے پھپھوندی کی بو آ رہی تھی۔ ان کے پیروں کے نیچے زمین غیر معمولی طور پر پھسلواں تھی۔

''ارے! یہ پولیس کی سیٹی کی آواز تو نہیں تھی؟'' ایک نے پوچھا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔''

انہیں یقیناً سیٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ محض ایک دو آوازیں نہیں تھیں بلکہ متعدد اور ملی جلی تھیں۔ وہ جوں جوں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں، وہ ایک دوسرے کو پکارتی بھی جا رہی تھیں۔ پھر انہیں نکڑ سے تیز تیز چلتے اور کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

پولیس کے متعدد جوانوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ اپنی ٹوپیاں آنکھوں پر جھکائے اور شبینہ لاٹھیاں مضبوطی سے پکڑے افسر پہاڑی کی طرف بڑھے۔ وہ قدم بہ قدم چلتے اور مونہوں سے ایک لفظ نکالے بغیر ان طالب علموں کے بالکل قریب پہنچ گئے۔

پانچوں طالب علم بڑے جی دار تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ مشکل صورت حال سے کس طرح بچا سکتا ہے۔ اب وہ جس مصیبت میں پھنس گئے تھے، اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ تیزی سے پچھلی جانب گھوم گئے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر بہت سٹپٹائے کہ ان کے عقب میں بھی پولیس کے جوانوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ان جوانوں نے بھی اپنی آنکھوں پر ٹوپیاں ڈھلکا رکھی تھیں اور وہ برق رفتاری سے ان کی جانب بڑھے آ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جانب سے ان کی تعداد میں بڑی سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ انہیں اپنے پیچھے مزید سپاہیوں کے، جن کے دم پھول چکے تھے، قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

''کوئی خاص بات ہے؟ ہم اپنے بورڈنگ ہاؤس کی طرف واپس جا رہے ہیں۔'' چوکیچی نے نیند سے مغلوب لیکن خوشگوار لہجے میں کہا۔

''تم سب زیر حراست ہو۔'' انچارج نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے کچھ عجیب قسم کی بزدلی ٹپک رہی تھی۔

''لیکن ہم نے تو کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''تم زیرحراست ہو۔'' پولیس مین نے دوبارہ کہا۔

چوکیچی نے جلدی جلدی نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی پانچوں جوشیلے طالب علموں نے یک بیک اکٹھے مل کر پولیس والوں پر ہلہ بول دیا جو ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ دھینگا مشتی کا منظر واقعی قابل دید تھا۔ ان پانچوں نے پہیے کی شکل بنا لی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے دشمنوں کو پکڑتے اور انہیں زمین پر پٹخ دیتے۔ اندھیرے میں جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ کبھی کبھار کسی سخت چیز کے چٹخنے یا ٹوٹنے سے پیدا ہوتی تھی۔ ان کے قدموں کے نیچے زمین پھسلواں سے پھسلواں تر ہوتی چلی گئی۔ اس پھسلن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور سارے کے سارے اکٹھے نیچے گر پڑے۔ ان کے پرہجوم مخالفوں کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ پٹ انہیں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

دو دو پولیس والوں نے ان میں سے ایک ایک کو اپنے بیچ میں کہا، انہیں بازوؤں سے پکڑا اور لے کر چلنے لگے۔ پہلے تو انہیں کچھ دشواری پیش آئی لیکن بہت جلد گلی اتنی کھل گئی کہ تین افراد بآسانی برابر برابر چل سکتے تھے۔ بتدریج چڑھائی پہاڑی کی چوٹ کی طرف شروع ہوگئی۔ چوکیچی سب سے آگے تھے۔ اس نے نکڑ کے کھمبے کی روشنی میں، اس شخص کے چہرے پر، جو اس کا بازو پکڑے ہوئے تھے، ایک جانب سے نظر ڈالی۔ جو کچھ اس نے دیکھا، اس پر اس کے سارے جسم سے خوف کی لہر دوڑ گئی اور وہ خواہش کرنے لگا: ''کاش میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا!'' دوسروں کی طرح اس افسر کے ہیٹ نے بھی اس کا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے خدوخال کہیں نظر ہی نہیں آرہے تھے۔

پولیس کے حصار میں وہ بڑی اطاعت شعاری سے آگے چلتے رہے۔ چوکیچی کے ذہن میں خیال آیا کہ اس کے ہنگامہ پرور اور اودھم مچانے والے ساتھیوں نے جو چپ سادھ رکھی ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی طرح انہوں نے بھی دریافت کر لیا ہے کہ پولیس والوں کے چہرے نہیں ہیں۔ اس نے سوچا کہیں یہ فریب نظر تو نہیں؟ چند ہی لمحے پہلے وہ جس طرح اچھل کود رہا اور لہک لہک کر گا رہا تھا، اسے اپنی وہ کیفیت یاد آئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بس اسے ہی یاد رکھے گا اور اس نئے فریب نظر کو اپنے دماغ سے باہر

نکال دے گا۔

تاہم اس سے رہا نہ گیا اور اس مرتبہ اس نے اپنے بائیں جانب کے سپاہی پر نظر ڈالی۔ چہرے پر آنکھیں تھیں نہ ناک، بلکہ وہ کاملاً اور خالصتاً سفیدی مائل بیضوی تھا۔ سفید جلد پر ابھار تھا جس پر رخسار کا گمان ہوتا تھا لیکن یہ انتہائی سخت تھا اور اس پر بجھی بجھی درخشندگی تھی۔

''میرے خدایا! یہ تو انڈے ہیں!'' چوکیچی کو احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ایک لخت اپنا سخت سر اس پر دے مارے تو شاید وہ اس بیضوی چہرے کا خول توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن بیضہ سپاہی نے اتنی پھرتی اور مہارت سے اپنا سر ایک طرف کر لیا کہ چوکیچی کا وار خالی گیا اور وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔

پہاڑی کی چوٹی پر عمودی چٹان کے اوپر ایک رعب دار عمارت کھڑی تھی۔ اگر چہ وہ اپنی ٹیم کے رکن کے گھر پہلی مرتبہ نہیں گئے تھے، ان میں سے کسی نے بھی اس علاقے میں اس قسم کی عمارت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس عمارت کی شکل، جس کی سفیدی آنکھوں میں چبھتی تھی، بیس بال کے سٹیڈیم سے مشابہ تھی اور جدید اسلوب کے مطابق اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ سٹیڈیم سے یہ اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس کے اوپر گنبد نما چھت تھی۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عمارت ساز اس دائرہ نما شکل سے بغاوت کرنے پر تل گئے ہوں۔ انہوں نے زمین سے پہرے داروں کے مینار کی طرح سینگ نما ڈھانچہ اٹھا دیا تھا اور یہ کسی سہارے کے بغیر پینتالیس درجے کا زاویہ بناتے آسمان کی جانب رخ کئے کھڑا تھا۔

پانچوں کو دھکے دے کر بھاری دروازوں کے اندر دھکیل دیا گیا۔ اندرونی حصہ کسی بہت بڑے ایمفی تھیٹر کی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا لیکن یہ تاریک اور بہت ٹھنڈا تھا۔ شروع میں انہیں نظر تو کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن انہیں خاصے بڑے ہجوم کی موجودگی کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ کی بجائے وہاں کچھ اس قسم کا شور ہو رہا تھا جیسا چینی کھیل ماہ جونگ (Mah-Jongg) کی ہاتھی دانت کی گوٹوں کے ادھر ادھر کرنے سے ہوتا ہے۔

ان سب کو دائرے کے عین مرکز میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں جا کر انہیں مدھم سا احساس ہونے لگا کہ ان کے سامنے شاہانہ سفید ڈائس بنا ہوا ہے۔ اس پر تین جج بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سیاہ گاؤنوں پر طلائی گوٹا جھلملا رہا تھا۔ ججوں کے چہرے چیچک زدہ، غیر صحت

مند حد تک سرخ، جہازی انڈے تھے۔ وکیل استغاثہ، وکیل صفائی، محرر، اہلمد اور چپڑاسی بھی جو ادھر ادھر منڈلاتے پھر رہے تھے، سبھی انڈے تھے۔ پانچوں طالب علموں کو، جن کی نگاہیں روشنی سے مانوس ہونے لگی تھیں، احساس ہوا کہ ہال میں موجود ہزاروں تماشائی بھی انڈے ہیں۔

کسی تمہید کے بغیر بیضہ وکیل استغاثہ اپنا مقدمہ پیش کرنے لگا۔ اس میں کلام نہیں کہ باتیں کرنے کے لیے اس کا کوئی منہ نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سہمی سہمی آواز کہیں اندر سے آ رہی ہے۔

''میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ ان پانچوں نافرمان ملزم طالب علموں............ چوکیچی، جتارو، موسوکے، ست سویو اور انگورو............ کو سزائے موت دی جائے۔ ملزموں نے انڈوں کی بے حرمتی کی ہے: وہ جان بوجھ کر ان کے ساتھ نہایت سنگ دلانہ اور وحشیانہ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ وہ انڈوں کو نہ صرف بطور خوراک استعمال کرتے رہے ہیں بلکہ وہ ہر صبح اکٹھے مل کر ارادتاً انہیں تڑخانے اور توڑتے بھی رہے ہیں۔ انڈے تڑخانے اور توڑنے سے جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں، ان کے ذریعے وہ یہ پراپیگنڈہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ انڈے کو کھانے کی چیزیں تصور کیا جانے لگا ہے، انہیں جو ذلت اور خواری اٹھانا پڑی ہے، اس کی تاریخ بہت طویل ہے لیکن اتنی ڈھٹائی اور بے شرمی سے انڈے پینے کے بھیانک جرم کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔''

وکیل صفائی بیضہ اٹھا۔ وہ قدرے کمزور اور غیر اشتہا انگیز نمونہ تھا۔

''وکیل استغاثہ کے بیان کے جواب میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ انڈے کا خول مدعا علیہان کی جلد سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ جن کی اپنی جلد اتنی نرم و نازک ہے، وہ اگر انڈے تڑخانے اور توڑتے ہیں تو ان کے اس فعل کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طاقتور کمزور کا شکار کر رہا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا رویہ شائستگی کی حدود سے باہر ہے۔''

''جو چیز زیادہ سخت ہوتی ہے، وہ ٹوٹ بھی اتنی ہی آسانی سے جاتی ہے۔''

وکیل استغاثہ نے شدت جذبات سے چلا کر کہا۔'' شکل کے اعتبار سے ہم ان ملزمان سے برتر ہو سکتے ہیں لیکن ان کا نظریہ ہمارے نظریے کی نسبت کہیں زیادہ ترقی یافتہ

ہے۔ نظریہ خواہ کوئی بھی صورت اختیار کر لے، اس میں تشدد کے عناصر لازماً در آتے ہیں۔

''تاہم جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، مدعا علیہان کشتی رانوں کی ٹیم کے ارکان ہیں۔ سارا معاشرہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس قسم کے لوگ کسی بھی نظریے کی پابندی کرنے کے نااہل ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ مجسم وحشیانہ قوت ہیں۔

''بالکل یہی وہ وحشیانہ قوت ہے جو تمام نظریے کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اگر وحشیانہ قوت نے پہلے انڈے کا خول نہ توڑا ہوتا تو انڈے کھانے کا خیال ہی کس کے دل میں آیا ہوتا؟ یا اگر آپ چاہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے یہ متشددرانہ افعال اس لیے سرانجام دیئے کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ انڈے کھائے جانا چاہئیں۔''وکیل استغاثہ اتنے جوش میں آ گیا کہ اس کے خول کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا جیسے اس کے اندر آگ لگ گئی ہو۔

''استغاثہ ان پانچوں مدعا علیہان کے لئے سزائے موت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ چوکیچی کو آملیٹ، جتارہ کو خاگینہ، موسوکے کو ابلے ہوئے انڈے، ست سویو کو تلے ہوئے انڈے اور انگورو کو پھینٹے ہوئے انڈوں اور شراب کا ملا جلا مشروب پلا پلا کر ہلاک کیا جائے۔''

استغاثے کے اس بیان پر تماشائی عش عش کر اٹھے اور خوشی سے جھومنے لگے۔ وہ اتنے جوش وخروش میں آ گئے کہ ان کے آپس میں ٹکرانے کے باعث ان کی قطاروں کی قطاریں کھٹکھٹانے لگیں۔ ان کے خولوں کے اندر زردیاں اتنی نہال ہوئی جا رہی تھیں کہ ان کے اندر موجوں جیسی حرکت پیدا ہو گئی۔ پریشانی سے طلباء کے منہ لٹک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سزا کی تجویز سن کر صرف انگورو کو قدرے خوشی ہوئی ہے۔

''استغاثہ اس نوعیت کی سزا کا مطالبہ کر سکتا ہے لیکن میں جاننا چاہوں گا کہ اس کے پاس اس بیضہ نما سزا پر عمل درآمد کا منصوبہ کیا ہے۔'' وکیل صفائی نے کمزور انداز سے جواب دیا'' کیا وہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھ رہا ہے کہ انسانی جسم میں بیضہ نما پروٹین اتنی کافی مقدار میں موجود ہے جو آملیٹ کے آملیٹ بنانے کے لیے موزوں قرار دی جا سکے؟''

''بالکل!'' وکیل استغاثہ نے بڑی استقامت سے جواب دیا۔''یہ سائنسی حقیقت ہے کہ جو انسان روزانہ ہم میں سے ایک انڈہ کھاتے ہیں، وہ پکائے جانے پر خود آملیٹ میں تبدیل ہو جائیں گے۔''

''پھر آپ اس امکان کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو انڈے انسانی جسم کے اندر ٹوٹتے ہیں، انہیں دوبارہ انڈوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟''

''بالکل فطری بات ہے۔ چنانچہ بیضہ نما سزا کی تکمیل سے کیمیائی امکان پیدا ہو جاتا ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر اس سزا پر عمل کرنے کا نتیجہ خود انڈوں کے ہاتھوں نو تشکیل انڈوں کے دوسرے قتل عام کی صورت میں برآمد ہو گا۔ ہم خود انڈوں کے پکوان بنانے کے، جو انسانی پیٹ پوجا کے لئے استعمال ہوتے ہیں، مجرم قرار پائیں گے اور ہمارا یہ فعل ایک قسم کا تضاد ہو گا۔ سزائے موت دینے کی بجائے ہمیں ان پانچوں مدعا علیہان کے اندر کے انڈوں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہیے اور ان کے پس ماندگان کو خوش خبری سنانا چاہئے۔''

''یہ سراسر مضحکہ خیز تجویز ہے۔'' وکیل استغاثہ نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ غصے کے عالم میں اس کا سر ایک ستون سے جا ٹکرایا اور اس کا خول بمشکل ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ ''ہمارا مطالبہ انتقام ہے! ہمیں آملیت چاہئیں! ہمیں ابلے ہوئے انڈے......''

پانچویں طالب علم، جو اس بے معنی بحث سے بالکل تنگ آ چکے تھے، بالآخر پرسکون ہو گئے اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لینے لگے۔ ان کا نشہ کافور ہونے لگا تھا۔ جتارو نے تماشائیوں میں کوئی خوبصورت دوشیزہ تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس سے آنکھ لڑا سکے لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ اگرچہ بیضہ لڑکیاں جسامت کے اعتبار سے ایک دوسری سے قدرے مختلف تھیں، لیکن ان میں انفرادیت کا فقدان تھا۔ بظاہر انڈیاں اپنی شخصیتوں کا اظہار اپنے ملبوسات کے ذریعے کر رہی تھیں اور ان کے رنگ برنگے ملبوسات کی بوقلمونی حیرت انگیز تھی۔ ایک انڈی نے تو کلاسیکی طرز کا بارہ تہوں والا کمونو اور زنانہ ہیٹ پہن رکھا تھا۔ موسو کے اکتاہٹ کے عالم میں اپنے پاؤں پٹخنے لگا اور وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ اس کے پاؤں جونہی فرش کو چھوتے ہیں، ان سے کھناکے کی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔

''یہ فرش فولاد کا بنا ہوا ہے۔'' اس نے اپنے دوستوں سے سرگوشیوں میں کہا۔ وہ سب اس کی بات سن کر حقارت سے مسکرانے لگے۔ کسی کو بھی اس کی بات کا یقین نہ آیا اور نہ کسی نے خود اپنا پاؤں فرش پر پٹخنے کی کوشش کی۔ تاہم جب موسوکے نے ہیجان کے عالم

میں اپنے اردگرد دیکھا، اسے احساس ہوا کہ انہوں نے عمارت کے سامنے جو تنگ، آگے کو نکلا ہوا، مینار نما حصہ دیکھا تھا، وہ دراصل راہداری تھی جو اس دائرہ نما کمرے سے، جہاں وہ کھڑے تھے، عمودی زاویہ بناتے ہوئے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ بالکل کسی ہینڈل کی طرح نظر آ رہی تھی جسے دائرے کے کنارے سے منسلک کر دیا گیا ہو۔ موسو کے پر ایک راز منکشف ہو گیا۔ اس نے اسی ہشاش بشاش لہجے سے، جو وہ ہمیشہ جھوٹی کہانیاں سناتے ہوئے اپناتا تھا، اپنے دوستوں سے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا:

''ارے دیکھو! یہ عمارت تو فرائی پین ہے۔'' چاروں نے مبہم انداز سے مینار پر چھچھلتی نظر ڈالی۔ لیکن جب اندر سے دیکھا جائے تو یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ فرائی پین فرائی پین ہی ہے یا کچھ اور۔ چاروں کو یقین تھا کہ ناقابل اصلاح موسو کے حسب معمول بے پر کی اڑانے لگا ہے۔

نیم تاریک سفید ڈائس پر چیف جسٹس بیضہ تھوڑا تھوڑا دائیں بائیں جھولنے لگا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے ججوں کے ساتھ صلاح مشورے میں مصروف ہے۔ آخر کار چیف جسٹس فیصلہ سنانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تماشائیوں کے اعصاب تن گئے اور سارے ہال میں خوف کا احساس واضح طور پر نظر آنے لگا ہے۔ چیف جسٹس نے اپنے فیصلے کا اعلان اسی خوف زدہ لہجے سے کیا تاہم دھیرے دھیرے اس کا لہجہ سنجیدہ اور پروقار ہو گیا۔

''وکیل صفائی کی رائے انڈوں کی اخلاقیات سے انحراف کر رہی ہے اور اس کی غلطی یہ ہے کہ وہ انسانیت پرستی کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ جیسا کہ وکیل استغاثہ نے مطالبہ کیا ہے، میں ان پانچوں مدعا علیہان کو سزائے موت دیتا ہوں۔ ان کی سزا پر بیضہ تعزیرات کی دفعہ نمبر 82 کے تحت فوری عمل ہو گا۔''

تالیاں بجانے اور نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے کی بجائے تماشائی ایک دوسرے کے ساتھ اپنے خول ٹکرا کر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شوروغل بپا کرنے لگے۔ پولیس کے دس افسر اور سپاہی طلبا کے قریب پہنچے۔

''انتظار کس بات کا؟ آؤ، ان پر ہلہ بول دیں!'' موسو کے نے دھیمے لیکن توانائی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ باقی چاروں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ موسو کے کے جھوٹ کو سچ مان لیں اور وہ ہتھکڑیاں پہنے مینار کی طرف دوڑ پڑے۔ ملحقہ

راہداری واقعی کھانچے جیسی فولادی نالی تھی............ اس میں کوئی شک نہیں یہ فرائی پین کا ہینڈل تھی۔ پانچوں کے پانچوں چوٹی کی جانب بھاگے۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک کا اوسط وزن اڑھائی سو پاؤنڈ تھا، چنانچہ ان کا ایک ہزار پاؤنڈ سے زیادہ کا مجموعی وزن ہینڈل پر زبردست دباؤ ڈالنے اور اسے نیچے دبانے لگا۔ جب فرائی پین الٹ پلٹ ہو رہا تھا تو عام افراتفری پھیل گئی اور ہزاروں انڈے بھیانک شوروغل مچاتے دھم اڑا اڑدھوں ٹوٹنے پھوٹنے اور نیچے گرنے لگے۔ غل غپاڑے کی گونج چاروں طرف سینکڑوں میل دور تک سنائی دی جانے لگی۔ ہر کس و ناکس کی آنکھ کھل گئی اور لوگ بانگ صبح کاذب کے وقت اپنے گھروں سے گلیوں میں نکل آئے۔ لاتعداد انڈے آپس میں ٹکراتے، زمین پر گرتے اور پاش پاش ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی سفیدیاں اور زردیاں آپس میں یوں گھل مل گئیں جیسے انہیں انڈے پھینٹنے کے برتن میں پھینٹ دیا گیا ہو اور انہوں نے ذخیرہ آب جتنا بڑا سیال کا تالاب بنا دیا۔ عین اسی لمحے ایک چمچماتا نیلگوں ٹرک ادھر سے گزرا۔ چونکہ اتفاق سے ٹرک خالی تھا، ان پانچوں طالب علموں نے انڈوں کے اس عظیم ذخیرے کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اسے جلد جلد ٹرک میں لاد لیا اور اسے اپنے بورڈنگ ہاؤس لے گئے۔

اس دن کے بعد ہر صبح چوکیچی، جتارو، موسوکے، ست سویو اور انگورو کو ناشتے میں آملیٹ ملنے لگے۔ اگرچہ وہ گدوں جتنے بڑے بڑے آملیٹ اپنے پیٹوں میں اتارتے رہے لیکن رسد ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ان کے ہمسایوں کو باقاعدگی کے ساتھ ان کے شوروغوغا کی آوازیں سننا پڑتیں لیکن انہیں ایک فائدہ بھی ہوا کیونکہ اب انڈوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ان کے کانوں کو چھیدتی نہیں تھیں، اگرچہ یہ حال مست نوجوان ہر صبح انڈے توڑنے کے شغل سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا کہ جب آدمی بیک وقت اتنی زیادہ تعداد میں انڈے توڑ ڈالتا ہے تو پھر اسے اس کی کچھ نہ کچھ قیمت چکانا ہی پڑتی ہے۔

کوجیما نبواء

ستارے

کوجیما نبواؔ (Kojima Nobuo) 1915ء میں جاپان کے شہر گیفو (Gifu) میں، جو ٹوکیو کے مغرب میں واقع ہے، پیدا ہوئے۔ انہیں خلوت پسند کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ دوسروں سے کم ہی میل جول رکھتے ہیں۔

کوجیما اپنی تحریروں میں خود اپنے آپ کو اور اپنے معاصرین کو بھی طنز کی تلخ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ سب کے سب ''جزوی طور پر اپاہج'' ہیں۔ اپنے ناولوں اور افسانوں میں وہ جو کردار پیش کرتے ہیں، ان کے متعلق ان کا نقطہ نظر قنوطی ہے کیونکہ وہ بھی ایک لحاظ سے ''اپاہج'' ہوتے ہیں۔ وہ انہیں اضافیت (Relativism) اور تضادات کیب ھنور میں پھنسا دیتے ہیں یوں وہ کچھ کرنے کے اہل نہیں رہتے۔

کوجیما بنیادی طور پر روس کے عظیم طنز نگار گوگول سے متاثر ہیں۔ گوگول کی تحریروں سے ان کا واسطہ ٹوکیو یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی تعلیم کے دوران میں پڑا تھا۔ خود اپنی زندگی میں انہیں جن تجربات میں سے گزرنا پڑا، انہوں نے ان کے اس نقطہ نظر کو مزید مستحکم کر دیا کہ انسانی زندگی فضولیات سے عبارت ہے۔ کوجیما کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ سکول میں انگریزی پڑھانے کے لئے استاد مقرر ہوئے لیکن ابھی آٹھ ہی ماہ گزرے تھے کہ جاپان نے انگریزی بولنے والی بڑی اقوام کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ خود انہیں لازمی فوجی بھرتی کے قانون کے تحت بھرتی کر لیا گیا۔ وہ چلے تو تھے افسر بننے لیکن افسری کا امتحان پاس کرنے میں ناکام رہے اور یوں عام سپاہی کے طور پر انہیں مانچوریا بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کا کام ایشیا میں تعینات امریکی فضائیہ کے دستوں کے خفیہ پیغامات کو ریڈیو پر سننا اور انہیں غیر مرموز (Decode) کرنا تھا۔

جب جنگ ختم ہوئی، کوجیما نے اپنی توجہ فکشن لکھنے پر مرکوز کر دی۔ 1948ء میں ان کا ناول ''گاڑی میں'' شائع ہوا اور اس نے ان کی بطور ادیب حیثیت منوا دی۔ جنگ کے بعد کے ابتدائی ایام میں جاپان میں جو افراتفری مچی ہوئی تھی، اس ناول میں اس کا بیان علامتی انداز سے کیا گیا ہے۔ 1952ء میں ان کا ناول ''رائفل'' منظر عام پر آیا۔ اس میں ایک دو جذبی (Ambivalent) فوجی سپاہی کی عشقیہ زندگی بیان کی گئی ہے۔ کوجیما جس قسم کے اخلاقی اعتبار سے اپاہج افراد کو، جو اپنی روز مرہ زندگی میں معنی تلاش کرتے تو رہتے ہیں لیکن پاتے کبھی نہیں، پیش کرتے رہے تھے، ان کا سلسلہ اس ناول میں بھی جاری ہے۔

1965ء میں ان کا معرکتہ الارا ناول ''Embracing Family'' شائع ہوا۔ اسے تانی زا کی انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اس کا شمار جاپان کے انتہائی کرب ناک ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس میں ایک نقاہت زدہ دانش ور کو کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے برعکس ان کے ناول ''امریکی سکول'' (1954) کی اس لیے تعریف کی جاتی ہے کیونکہ اس میں مقبوضہ جاپان کے ایک ناگوار حد تک خوددار لیکن تحفظ سے محروم استاد کی زندگی کا بیان بڑے مزاحیہ انداز سے کیا گیا ہے۔

کوجیما کا تازہ ترین ناول ''Reasons for Parting'' ہے۔ یہ ضخیم ناول چودہ سو صفحات پر مشتمل ہے اور نقادوں نے اسے جدید جاپانی ناول کے ارتقا میں سنگ میل قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں شامل ان کی کہانی ''ستارے'' (Hoshi) 1954ء میں شائع ہوئی تھی۔ جنگ عظیم دوم کی تلخ یادوں نے جن کہانیوں کو جنم دیا ہے، اس کا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار دو جذبی جارج سوگی ہارا ہے۔ اس نے تعلیم تو امریکہ میں پائی لیکن اس کی بدقسمتی اسے جاپان کے اعلان جنگ کرنے سے ذرا قبل جاپان لے آئی اور اسے زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ جنگ کے دوران میں کوجیما جس قسم کی دو جذبیت محسوس کرتے رہے، اس کا بیشتر حصہ انہوں نے اپنے اس کردار میں سمو دیا ہے۔ کہانی کا تعلق ان مختلف ''ستاروں'' سے ہے جن کے ذریعے فوجی جوان اپنی زندگی میں استحکام اور رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جب جارج سوگی ہارا فوج میں شامل ہوا تھا، وہ ژولیدگی فکر کا شکار تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کوئی قابلِ اعتبار ستارہ حاصل نہیں کر پائے گا لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی بہرحال اس دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کی جانب انکل پچو کسی یونیفارم کا کالر، جس پر واحد سرخ ستارہ چسپاں ہو، پھینک دیا جائے، کون ہے جو اسے دیکھنے کے بعد اپنے جذبات میں ہلچل نہ محسوس کرے گا؟ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو اس لمحے بالکل ہی بھونچکا رہ گیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں جاپانی امریکی تھا جسے رتی برابر فوجی تربیت نہیں ملی تھی اور جسے اپنی باقی ماندہ زندگی فوجی جوان کی حیثیت سے گزارنا تھی۔ ذلت کا یہ نشان............ معمولی، گھسا پٹا، داغ دار ستارہ جو کسی تار تار سرخ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا............ ہمیشہ میرے کالر کے ساتھ چمٹا رہے گا۔ خود مجھے تو یہ نظر نہیں آئے گا لیکن باقی دنیا کو یہ صاف دکھائی دیتا رہے گا۔ خدا اس شخص کو غارت کرے جسے اس قسم کا عیارانہ نشان سوجھا تھا! اگر میں یہ یاد رکھنے کی شعوری کوشش نہ کروں کہ یہ منحوس نشان میرے کندھے پر موجود ہے تو اپنی فطرت کے مطابق یہ مجھ پر کہیں کم اثر انداز ہو گا لیکن یہ ستارہ میرے کندھے پر موجود ہے اور یہ ادنیٰ ترین درجے کا ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کو نظر آتا رہتا ہے اور ہر روز مجھے اس کی موجودگی کا احساس دلایا جاتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ مجھے اب تک فوج کے متعلق کچھ علم ہی نہیں تھا۔ جب میں نے ادنیٰ سپاہی سے جرنیل اور فیلڈ مارشل تک طویل سلسلے کے متعلق سوچا، میری نگاہیں یوں گھومنے لگیں، جیسے میں انسانوں کو نہیں بلکہ کسی چوبی سیڑھی کو دیکھ رہا ہوں جو آسمان کی جانب جا رہی ہے۔ نچلی ترین اور بلند ترین سطح کے مابین فاصلہ ناقابل یقین تھا۔ آدمی اوپر کے تقریباً بیس قدموں میں سے ایک پر بھی پاؤں رکھے بغیر چوٹی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اکیلے اکیلے ستاروں کا پورا جھرمٹ سمندر کی طرح میرا گھیراؤ کئے ہوئے تھا۔ مزید برآں معلوم ہوتا تھا کہ گھٹیا واحد ستارہ جب دو، پھر تین ستاروں میں تبدیل ہوتا ہے تو اسے نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اچانک اگلی سطح پر پٹی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ تب روپہلی پٹی کے ساتھ روپہلی ستارہ مل جاتا تھا۔ پھر ڈیزائن تبدیل ہو جاتا اور چمکتے دمکتے حاشیے نمودار ہو جاتے اور اس کے بعد آپ جتنا اوپر اٹھتے جاتے تھے، آپ کی وردی اتنی ہی زیبائشی اور بھڑکیلی ہوتی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ان تمام چیزوں کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی کانفرنس منعقد ہوئی ہو گی۔ میرا اندازہ ہے کہ کانفرنس کے نمائندوں کو اس تصور سے تحریک ملی ہو گی کہ بڑوں کی

مناسب انداز سے سج دھج کا اہتمام ہونا چاہیے۔''نہیں، یہ کچھ زیادہ ہی جاذب نظر ہو گئی ہے۔'' ''توازن بگڑ گیا ہے۔'' ''نہیں، اسے ذرا کم چمکیلا بنا دو............موجودہ صورت سے امتیاز کافی واضح نہیں ہو رہا۔''

چنانچہ جب میں فوج میں شامل ہوا تو جب بھی میں کسی شخص کو اپنی جانب تکتے دیکھتا، میں جواباً اسے گھور گھور کر دیکھنے لگتا۔ مجھے محسوس ہونے لگتا کہ اس طرح میں لوگوں کو جتا سکوں گا کہ میرا مقام کیا ہے۔ تاہم بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ سینئر نان کمشنڈ افسروں نے مجھے بطور کھلونا منتخب کر لیا ہے۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ نفرت کی نگاہ کتنی کمزور ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر فلک شگاف قہقہے لگاتے کیونکہ میرے جسم کی ساخت امریکیوں جیسی تھی، کیونکہ میں بہت پھرتیلا نہیں تھا اور میرے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پھر وہ دوستانہ انداز سے مجھے مشورہ دیتے کہ مجھے اپنی شکل آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ جب میں ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش کرتا تو وہ میری خوب خبر لیتے۔ جب وہ مجھے طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے تو وہ مجھے ''مغربی انداز کی طباخی'' اور ''امریکی سیر سپاٹے'' کے حوالے دینے لگتے۔ مجھے کیلی فورنیا اور امریکی عورتوں کے متعلق ہر قسم کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے۔ ''کچھ انگریزی بول کر دکھاؤ نا!'' وہ میرا تمسخر اڑاتے۔ ''جاز کے ایک دو بول سناؤ!'' اگر میں ان کی تسلی کے مطابق کارکردگی دکھا سکتا، تو وہ شاید اپنے مطالبوں سے دست بردار ہو جاتے لیکن مجھے اس سبزی خور قوم کی کینہ پروری پر سخت غصہ آ جاتا اور میں انہیں جواب دینے سے صاف انکار کر دیتا۔ جب ایک مرتبہ میں یہ رویہ اختیار کر لیتا تو وہ اپنی باز پرس کا رخ تبدیل کر دیتے۔ اب وہ میرے ساتھ بطور مسخرہ سلوک نہیں کرتے تھے بلکہ میری پٹائی کرنے کے بہانے تلاش کرنے لگتے تھے۔ جب وہ ''مغربی طباخی'' کہتے اس کا مطلب مجھے زندہ بھون دینا ہوتا تھا اور ''امریکی سیر سپاٹے'' کا مفہوم مجھے درد سے دوہرا ہوتے دیکھنا بن گیا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے آئینہ دیکھنے سے نفرت ہو گئی۔ میں جب شیو بناتا، تب بھی اس کا استعمال نہ کرتا۔

ایک سپاہی، جس کا نام ہکیدا تھا، میرے ساتھ والے بستر پر سوتا تھا۔ اسے بھی سنگ دلانہ انداز سے مارا پیٹا اور گالیاں دی جاتی تھیں۔ جب کبھی اس کی دھنائی ہوتی، میں

قریب کھڑا دیکھتا رہتا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی کہ میں اس کی پٹائی پر خوش ہوتا ہوں۔ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہوتی تھی کہ وہ اس سلوک کا مستحق ہوتا۔ سچ پوچھیں اسے پٹتا دیکھ کر مجھے بہت لطف آتا تھا، کیونکہ مجھ سے اس کی بدصورتی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس شخص کے ساتھ ذرا بھی لگاؤ نہیں اور یہ کہ میں اپنے خاص انداز سے اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتا رہتا ہوں۔

وہ اپنی جسم قسم کی کڈھب ہیئت بنائے رکھتا تھا، اس کا اس کی بدصورتی سے ذرا بھی تعلق نہیں تھا اور نہ اس حقیقت سے کہ اس کی وردی سدا میلی کچیلی اور بے قرینہ پائی جاتی تھی کیونکہ اس کے فرصت کے اوقات اپنی کاہلی کی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ کھانے میں گزر جاتے تھے۔ بلکہ مجھے تو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے کالر پر جو واحد حقیر ستارہ چسپاں ہے، وہ اس کی مہین آنکھوں اور تین تلوں سمیت لمبوترے، زرد، پژمردہ چہرے سے بہتر چہرے کا مستحق ہے۔ حقیقتاً اس کی شکل صورت اس ستارے کی توہین تھی۔ ایک ستارہ بھی اس کے معیار سے اتنا ارفع و اعلیٰ تھا کہ وہ اسے زیب نہیں دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں خواہش پیدا ہونے لگتی تھی کاش کسی نے اس سے بھی گھٹیا نشان وضع کیا ہوتا۔

جس انداز سے دوسرے مجھے دیکھتے تھے، اس کے متعلق سوچنا بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھا لیکن مبہم انداز سے مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں بھی اپنے ستارے کے لیے باعث توہین ہوں۔ میں ایک ستارے کی توہین کر کے باقی تمام ستاروں کی توہین کا مرتکب ہو رہا تھا۔

ایک مرتبہ ہماری بیرک میں سویا بین کی چٹنی کی بوتل پہنچ گئی۔ دراصل ہم اسے باورچی خانے سے لائے تھے۔ ہکیدا نے مجھ سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ میں نے جواب دیا: ''اسے نیچے انڈیل دو۔'' میرا خیال تھا کہ بوتل میں جو چٹنی باقی بچ گئی ہے، اگر ہم نے اسے واپس لوٹا دیا تو وہ ہمیں دھمکی دیں گے اور آئندہ ہمیں کچھ نہیں ملے گا............ یہ وہ عسکری سوجھ بوجھ تھی جو میرے دماغ میں بھی آ سکتی تھی۔ ہکیدا نے میرے مشورے پر عمل کیا اور اس نے چٹنی بیت الخلاء میں بہا دی۔ پھر ہم دوسری رکابیوں کے ساتھ بوتل بھی باورچی خانے میں لے گئے۔ باورچی ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ نہ کچھ چٹنی ضرور بچ گئی ہوگی اور ہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم نے اس کا کیا کیا۔ صاف

معلوم ہو رہا تھا کہ بیرکوں کے دوسرے جوان فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے اپنی بچی کھچی چٹنی واپس لے آئے تھے۔

''تم نے ضرور اسے بدرو میں بہا دیا ہوگا۔'' اس نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے ساری کی ساری کھا لی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''جھوٹا! تم نے اسے کہاں پھینکا تھا؟'' اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''اے امریکی! تم نے اسے بدرو میں بہانے کو کہا ہوگا۔'' اسے اپنے باورچی خانے میں کام کرنا تھا اور ہمیں اپنے فرائض سر انجام دینا تھے لیکن اس نے ہمیں روک لیا اور خوب صلواتیں سنائیں۔ عام طور پر اس کے حملوں کا ہدف میں ہی بنتا تھا لیکن پتا نہیں کیسے اس کی نگاہ ہکیدا پر پڑ گئی اور اسے دیکھ کر وہ یوں اپنے پاؤں پٹخنے لگا جیسے وہ درد میں مبتلا ہو۔ اس کے چہرے مہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ہکیدا پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہ سکے گا۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اپنے دانت کٹکٹانے لگا۔ ہکیدا کا مار کھانے کا اپنا انوکھا طریقہ تھا۔ اس نے بچوں کی طرح اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کے سر پر جو ضرب پڑے، کسی طرح اس کا رخ بدل دے۔ یہ درست ہے کہ اگر آدمی مکے کھا کر بل کھانے لگے، تو یہ بات بالکل فطری اور موثر ہو گی۔ ہکیدا کی خوبی یہ تھی کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ اس کی پٹائی کرنے کو جی للچانے لگتا تھا اور یہ بالکل واضح تھا کہ وہ جس قسم کا اطاعت شعارانہ رویہ اپنائے رکھتا تھا، وہ محض اس کے حملہ آور کو مزید طیش دلاتا تھا۔ جب باورچی ہکیدا کی ٹھکائی کر رہا تھا، وہ اتنا تاؤ میں آ چکا تھا کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔

مجھ پر منکشف ہوا کہ اگر میں ہکیدا کے ساتھ جڑا رہوں تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے میں نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو اور اب میں کسی کو نظر نہیں آؤں گا۔ بہرحال اس امر میں مطلق شک کی گنجائش نہیں کہ ہکیدا مجھ سے کہتر تھا۔

ذہنی طور پر میں کسی مبہم، غیر واضح مرتبے کی طرف ایک قدم بڑھا چکا تھا۔ میں نے صرف ایک ہی مثال پیش کی ہے لیکن بتدریج میرا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔

آپ کو شاید یہ بات احمقانہ معلوم ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں گھوڑوں سے

خوف کھاتا تھا۔ ہماری سگنل کور میں متعدد گھوڑے تھے۔ ہمیں انہیں چارا اور دانہ کھلانا، ان کی لید صاف کرنا اور ان کے جسم پر کھرکھرا کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں ان فرائض کو اپنے ہتھیاروں اور دوسرے ساز و سامان کی صفائی اور دیکھ بھال سے بھی زیادہ دیانت، محنت اور احتیاط سے نبھانا پڑتا تھا۔ بہرحال گھوڑے جاندار مخلوق تھے۔ اس بات کا ہر دم خطرہ رہتا تھا کہ وہ ہمیں کہیں دولتی نہ مار دیں یا ہمیں ان سے کوئی بیماری نہ لاحق ہو جائے۔ ویسے بھی مجھے ان کی آنکھوں سے کہیں زیادہ خوف آتا تھا۔ فوج میں یہ کہاوت مشہور ہے: ''گھوڑے مرتبہ پہچانتے ہیں۔''

ہمارے آنے سے بہت پہلے ہی یہ بٹالین کا حصہ تھے اور انہوں نے ہی ہمارے کمانڈنگ افسر اور ہمارے سامان کو یہاں پہنچایا تھا۔ امکانی طور پر وہ ہم سے کیسے فروتر ہو سکتے تھے؟ سچ پوچھیں تو مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا تھا۔'' کیا تم کمانڈر کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر بھاگ سکتے ہو؟ اگر تم بھاگ بھی سکو تو کمانڈر تم پر سوار ہونے سے انکار کر دے گا۔ امریکی! تم سمجھتے ہو تم یہ سارا سامان اٹھا کر لے جا سکتے ہو؟ اسے محض اٹھانے کے لیے چار آدمی.......... اور تمہارے جیسے تو پانچ درکار ہیں۔ پھر بہتر کون ہوا، تم یا گھوڑا؟'' بار بار اس قسم کے سوالوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے یقین ہو گیا (حالانکہ یہ بات ابھی کچھ عجیب معلوم ہوتی تھی) کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔ گھوڑا واقعی کہیں برتر تھا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ سوجھی۔ لیکن فوجی جوانوں کو کسی مسئلے پر تفصیل سے غور و فکر کرنے کی فرصت میسر نہیں آتی تھی اور اپنے دل کی گہرائیوں سے مجھے یہ ماننے میں تامل تھا کہ گھوڑا اتنا رافع و اعلیٰ ہو سکتا ہے۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے بھی ملتا تھا کہ گھوڑوں کے پاس ستارے نہیں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارا ان کے ساتھ سخت مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کا مقام و مرتبہ یقیناً فروتر تھا۔ تاہم ہم خود ایک قسم کے پالتو جانور ہی تھے اور جانوروں کی حیثیت سے وہ یقیناً اپنا سر اونچا رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ جب میں سوچتا کہ وہ اپنی پرسکون آنکھوں سے میرے ستارے کو دیکھ رہے ہیں تو مجھے اس فوجی کہاوت کی چوٹ یوں محسوس ہوتی جیسے میری جسم پر کوڑے برسائے جا رہے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے انسانی افسروں کی موجودگی سے اتنا خوف نہیں آتا تھا جتنا کہ ان کی موجودگی سے۔ خوف صرف اس بات کا نہیں تھا کہ وہ میرا ستارہ پہچان جائیں

گے اور مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے، بلکہ اس سے بھی بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں وہ میرے اورا پنے مقام کا موازنہ نہ شروع کر دیں اور دولتی جھاڑ کر یا مجھے کاٹ کر اپنی برتری نہ ظاہر کرنے لگیں۔ اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میں اپنے کالر کا نشان چھپا کر رکھتا تھا تو آپ ہنس پڑیں گے؟ خیر، سچ یہی ہے۔

تاہم آپ پوچھیں گے آدمی اپنا ستارہ گھوڑوں کی نگاہوں سے کیسے بچا سکتا ہے؟ ان کی گردنیں اتنی لمبی ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی وقت تو اسے لازماً دیکھ ہی لیں گے۔

ہمیں کمانڈر کے گھوڑے کی نگہداشت کرانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ایک صبح ہم نے ہکیدا کو چاروں شنے چت پڑے دیکھا۔ اسے کسی گھوڑے نے ٹھوڑی پر دولتی ماری تھی اور تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ کمانڈر کے گھوڑے نے سرانجام دیا ہے۔ اس کمیت کا نام گوروتھا۔ اس نے ہکیدا کا ملیدہ کر دیا تھا۔ اسے للکارنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ دولتی مارنے کے بعد پریڈ گراؤنڈ کی طرف بھاگ گیا تھا اور وہاں وہ اتنا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا کہ رشک آتا تھا۔ جس شخص نے ہکیدا کو اس گھوڑے کا کھرکھرا کرنے کا حکم دیا تھا، وہ لازماً اس کی یہ گت بنوانا چاہتا ہوگا۔ اب آپ سے کیا پردہ، یہ شخص میں ہی تھا جس نے احکام میں ردوبدل کیا تھا اور اسے اس کی نگہداشت کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ اتنا احمق تھا کہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کمانڈر کا اسپ تازی ہے۔ دراصل خیال یہ تھا کہ وہ ملحقہ اصطبل کے گھوڑے کا کھرکھرا کرے گا لیکن میں نے اسے کمانڈر کے گھوڑے کے اصطبل میں بھیج دیا۔ یہ درست ہے کہ بعد میں میری زبردست پٹائی ہوئی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن مجھے پٹائی سے خوف نہیں آتا تھا، مجھے خوف صرف اس بات کر رہا تھا کہ میری کوئی تذلیل نہ کر دے۔

اب تو اگر آدھی رات کو بھی میری پٹائی کا احتمال ہوتا تو مجھے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا بشرطیکہ اس میں تذلیل کا کوئی پہلو شامل نہ ہو۔ جب میں امریکا میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، میں ایک مرتبہ کشتی رانوں کی ٹیم کا رکن بن گیا تھا اور مجھے یہ تجربہ اچھی طرح یاد تھا۔ ہم کشتی کے عقبی حصے میں بیٹھ جاتے اور ہمیں چپوؤں کو گھمانے پھرانے کی ہزاروں بار مشق کرائی جاتی۔ مثلاً جب ہم پانچ ہزار مرتبہ چپو گھما پھرا چکتے تو حوصلہ افزائی کے نعرے ہم اذیت زدہ کشتی رانوں کا تعاقب کرنے لگتے۔ یہاں بھی جب میرے چہرے پر گھونسوں اور

تھپڑوں کی بارش ہوتی، میرے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔ ہر دس گھونسوں کے بعد تماشائی فوجیوں کے تضحیک آمیز نعروں اور قہقہوں کی، جن کی گونج ہر دم مجھے اپنے کانوں میں سنائی دیتی رہتی، شدت میں اضافہ ہوتا محسوس ہونیل گنتا اور یہ سلسلہ تب تک جاری رہتا جب تک ہم اپنی منزل مقصود.......... تیس، چالیس یا پچاس گھونسے، جن کا انحصار جرم کی نوعیت پر ہوتا تھا.......... پر نہ پہنچ جاتے۔ مجھے سزا ملنے پر اتنی اذیت نہیں ہوتی تھی جتنی تماشائیوں کے ہاتھوں اپنی تذلیل پر ہوتی تھی۔

میں اکثر اوقات عین آدھی رات کے وقت اپنے حصے کی کچھ بین جیلی (Bean Jelly) ہکیدا کو دے دیتا تھا۔ اس مقصد کی خاطر مجھے اپنا راشن بچانے کے لئے بڑے دل گردے سے کام لینا پڑتا تھا۔ اس کی محض قربت ہی سے مجھے متلی آنے لگتی تھی۔ تاہم جب وہ کمبل میں گھس جاتا، وہ لیٹتے ہی زور زور سے پاد چھوڑنے لگتا۔ میں اپنے پیٹ کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتا اور اپنے حصے کا راشن محض اس لیے بچا لیتا کیونکہ میں ان کڑاکے دار آوازوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں اسے اپنے چاولوں کا کچھ حصہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ ہم جو کچھ کرتے تھے، محض اسی کی بنا پر دوسروں نے ہمیں اپنی نفرت کا نشانہ بنانے کے لیے چن لیا تھا لیکن اس سے مجھے اس پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس پر ہی نہیں بلکہ اپنے ایذا رسانوں پر بھی۔ جب گھوڑے کے واقعے کے بعد ہکیدا بستر سے لگ گیا، میں نے اس سے اس وقت کی نسبت کم ہمدردی جتائی جب ماضی میں کسی سر پھرے نوجوان نے اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں دلیا اس کے حلق میں انڈیل دیتا اور ملی ہوئی مٹھائیاں اس کے منہ میں ٹھونس دیتا۔ کسی انسان کا منہ اتنا کریہہ بھی ہوسکتا ہے، مجھے اس سے پہلے اس کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے کھلانے پلانے جیسے کام کر کے میں اپنی زندگی کی واحد تفریح حاصل کرتا تھا۔

جس گاؤں میں ہم مقیم تھے، اس کے شمال مغرب کا علاقہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہمیں ان پر بار بار چڑھائی کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اگر دشمن کبھی ہمارا رخ کرتا تو وہ یقیناً انہی پہاڑیوں میں سے طوفان بن کر نکلتا۔ وہ جون جو نام کمانے کے شوقین تھے، ان پہاڑیوں پر چڑھنا اپنا اولین فریضہ گردانتے تھے۔ اگرچہ ہم نے کبھی ایک بھی لڑائی نہیں لڑی تھی لیکن جو لوگ اپنی پشت پر وزنی تھیلا باندھ کر سب سے پہلے کوئی چوٹی سر کرنے چل

پڑتے، وہ یقیناً دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ مجھے ان پہاڑیوں سے نفرت تھی۔ درحقیقت میں جسمانی اعتبار سے دوسروں سے کمزور نہیں تھا لیکن مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تھا کہ میں ان فوجیوں سے مقابلہ کروں جو فوجی زندگی اختیار کرنے سے پہلے درخت کاٹا کرتے تھے یا بھٹیوں میں کوئلہ جھونکا کرتے تھے۔ میں نے اس مہم میں ہکیدا کو اپنا ساتھی بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

ہم ایک روز آدھی رات چل پڑے۔ اگلے روز دوپہر ہوتے ہوتے ہم تین خاصی اونچی اور بے آب وگیاہ پہاڑیاں عبور کر چکے تھے۔ پھر ہماری جماعت بکھر گئی اور توقع کے عین مطابق اپنی چھوٹی اور لاغر ٹانگوں کے ساتھ ہکیدا باقیوں سے پیچھے رہ گیا۔ میں نے اس کا ساتھ دینا مناسب خیال کیا۔ ہماری رفتار چونکہ سست تھی، کچھ یوں نظر آنے لگا جیسے ہم دونوں نے ایک قسم کا عقبی دستہ بنا لیا ہو، اس کی رونی صورت پر ایک ہی نظر ڈالتے میرے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ میں اس کے کالر کا ستارہ نوچ لوں۔ یہ آکاس بیل کی طرح بالکل زرد اور زہریلا دکھائی دے رہا تھا۔ میں گننے لگا کہ اس نے چٹانوں سے کتنی بار ٹھوکر کھائی ہے۔ میں نے اس کی رائفل چھین لی اور اپنی رائفل کے ساتھ اسے بھی کندھے پر لٹکا لیا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ اپنا ہتھیار دوسروں کے حوالے کرنا کیا معنی رکھتا ہے لیکن اس نے بہرحال کوئی تعرض نہ کیا اور اپنی رائفل مجھے پکڑ لینے دی۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہکیدا ایک عمودی چٹان پر لٹک رہا تھا۔

جو لوگ ہم سے آگے نکل کر چلے گئے تھے، وہ کبھی کے چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور ہماری ٹھکائی کرنے کے لیے وہاں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن جب سورج غروب ہو گیا اور ہم پھر بھی وہاں نہ پہنچ پائے تو وہ ہماری تلاش میں واپس آ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہکیدا مجھ سے بیس تیس گز پیچھے ٹھوکریں کھا رہا ہے اور چٹان سے نیچے گرا ہی چاہتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ بار بار مجھے میرا نام لے لے کر پکار رہا تھا۔ ''اجی سوگی ہارا، اجی سوگی ہارا!!'' اگر مجھے اس کی بھلائی مقصود ہوتی تو میں اس کی چیخ پکار نظر انداز نہ کرسکتا لیکن مجھے اپنی فکر کھائے جا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سے تو تقریباً تیس گز آگے لیکن یونٹ کے باقی لوگوں سے پھر بھی کہیں پیچھے کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے نپٹنے سے پہلے وہ ہکیدا کی پٹائی کریں گے۔ پھر اس کی رائفل بھی تو میں ہی اٹھائے

ہوئے تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے ہتھیار سے دست بردار ہو چکا ہے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے افسروں کی............ بلکہ ان کے شاہانہ ستاروں کی جو وہ اپنے شانوں پر پہنے ہوئے تھے............ اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہوسکتی تھی۔ اس کی بزدلی کے انعام کے طور پر دو سینئر افسروں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور بڑی سنگ دلی سے اسے چٹان پر لٹکا دیا۔

ہکیدا کی دل خراش چیخیں سنی جاتی تھیں۔ پھر کسی کو رحم آ گیا، اسے چٹان سے اتار لیا اور کمانڈر کے گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ اس کا حکم دراصل خود کمانڈر نے دیا تھا۔ فطری طور پر یہ گھوڑا ہمارا پرانا بیلی گورو تھا۔ ہکیدا نے اپنی گردن جھکا لی اور کبھی کبھار اس امید میں کہ میں اس کی مدد کروں گا، مجھ پر دزدیدہ نگاہ ڈال لیتا۔

راستے میں ایک چھوٹی سی جھڑپ ہوگئی جس میں دشمن کے دو آدمی مارے گئے۔ ہمارے کسی ساتھی کو خراش تک نہ آئی۔ ہکیدا گھوڑے پر ہی بیٹھا رہا۔ وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

دشمن کا ایک ہلاک شدہ سپاہی، جس نے نیلے رنگ کی وردی پہن رکھی تھی، راستے کی ایک جانب منہ کے بل پڑا تھا۔ ہمارے ایک آدمی نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور نگاہیں گاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ ہماری طرح مردہ سپاہی کے سیاہ کالر پر صرف ایک ستارہ چسپاں تھا اور اس کا رنگ سفید تھا۔ دشمن سپاہی کے ستارے کی کم مائیگی کو دیکھ کر............ حالانکہ یہ اتنا کم مایہ بھی نہیں تھا............ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں مرحوم کے بہت قریب ہوں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب محض لاش تھا؟ جب میں امریکا میں رہتا تھا، میں ایک جاپانی واقف کار کے کریا کرم میں شریک ہوا تھا۔ جب آگ میں ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور انہیں برتن میں اکٹھا کر لیا گیا تو ایک امریکی نے تبصرہ کیا: ''جاپانی ہونے کے باوجود خاصا تگڑا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے آنجہانی دوست کی ہڈیاں چھوٹی اور آسانی سے ٹوٹ جانے والی ہوتیں تو مجھے اس پر کوئی رشک نہ آتا۔''

ہکیدا کمانڈر کے گھوڑے پر سوار جس شاہانہ انداز سے کیمپ میں واپس آیا تھا، اس کی تلافی تو یوں ہونا چاہیے تھی کہ جوان اس کی پہلی سے بھی زیادہ ٹھکائی کرتے لیکن اس کی بجائے اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا کیونکہ اسے نمونیا ہو گیا تھا۔ میرا انجام یہ ہوا کہ

اسے کھانا پہنچانے کی ذمے داری میرے سر مڑھ دی گئی۔

فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے ہکیدا آرٹسٹ ہوا کرتا تھا............ اس قسم کا آرٹسٹ جو چھتریوں پر مختلف قسم کے مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے۔ جب ہم اکیلے ہوتے، وہ مجھے اپنی تصویریں دکھایا کرتا تھا جو وہ ٹشو (Tissu) پیپر پر بناتا رہتا تھا۔

وہ ان پر اپنی ناک سڑکتا اور مجھ سے کہتا کہ میں انہیں کہیں پھینک دوں۔ وہ عام طور پر گلاب کے پھولوں اور چڑھتے سورج کے حسین نظاروں کی تصویر کشی کرتا تھا۔ یہ تصویں زیادہ تر پھیکی اور بے جان ہوتی تھیں۔ لیکن جب وہ انہیں بنا رہا ہوتا تو اس کے چہرے پر جو تاثرات ابھرتے، وہ اپنی مثال آپ ہوتے۔ جب اس کی یہ حالت ہوتی تو میری کوشش ہوتی کہ میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔ مجھے اس کے ہسپتال کے گاؤن دھونا پڑتے۔ جب میں انہیں اس کے جسم سے اتارتا تو کچھ یوں نظر آتا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ میرا شکریہ کن الفاظ میں ادا کرے۔ میرے لیے یہ چیز بہت اہم تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح نظر آتا رہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ہے تو بری بات لیکن مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ اس کا کوئی کنبہ بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے اس نے کبھی ذکر کیا ہوا اور مجھے یاد نہ رہا ہو کیونکہ جب اس نے کہا کہ میں اس کے خانے سے اس کی بیوی اور بچوں کی تصویر لیتا آؤں، میں بھونچکا رہ گیا۔ تب مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ عیال دار ہے۔ اس نے مجھے تصویر دکھانے کی کوشش کی لیکن میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور کہا کہ میں یہ پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ یہ تسلیم کرنا کہ ہکیدا کا بھی ابھی کوئی خاندان ہوسکتا ہے، اس بات کے مترادف تھا کہ اسے بطور انسان بھی دیکھا جا سکتا ہے، جب کہ میں اسے محض پالتو جانور بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

چنانچہ جب میں نے اسے اطلاع دی کہ وہ واحد سپاہی ہے جسے ادنیٰ ترین درجے سے اوپر ترقی کے قابل نہیں سمجھا گیا، تو میرے آنسو چھلکنے لگے۔ وہ بالکل سمجھ نہ پایا کہ میں کیا ڈرامہ کر رہا ہوں۔

آخر مزید ستارہ حاصل کرنے میں کیا کشش ہے کہ ہر جوان اسی کے چکر میں پھنسا رہتا ہے؟ محض ایک اور گھٹیا غیر ولولہ انگیز ستارہ پانے کا مطلب کیا ہے؟ تمام دوسری رسوم کی طرح ترقی کی رسم بھی بڑے رکھ رکھاؤ، وقار اور سنجیدگی سے ادا کی جاتی ہے۔ اس

کے بعد جوان پہلے کی نسبت کہیں زیادہ محنت اور مستعدی سے اپنے فرائض سرانجام دینے لگتے ہیں۔ وہ دنیا میں گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔ وہ چھپ چھپا کر دشمن کے علاقے میں جانا، اس پر گھات لگا کر حملہ کرنا یا اس کی رسد اور دوسروں کے سامنے اپنی ترقی کی نمائش کرنے کے خواہشمند ہو جاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے: اس قسم کے کاموں کی نمائش سے وہ متاثر کسے کرنا چاہتے ہیں؟

میں نے سپاہی درجہ اول (PFC= پرائیویٹ فرسٹ کلاس) بننے کے بعد پہلی مرتبہ دوبارہ آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ میں صرف ایک ستارے کا مستحق تھا۔ اب میں نظام کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ اپنا عکس دیکھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔

اپنے ہسپتال کے کمرے میں ہکیدا مجھ سے ''محترم پرائیویٹ'' کے الفاظ سے مخاطب ہوتا تھا۔ اسے عنقریب چھٹی ملنے والی تھی اور وہ میرے ساتھ چند معاملات کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا: ''یہاں مجھے کچھ آرام کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ لیکن اگر مجھے یونٹ میں ہی واپس جانا ہے تو میں اس بات کو ترجیح دیتا کہ میری ایذا رسانی کا سلسلہ بلاروک ٹوک جاری رہتا اور مجھے یہاں داخل کر کے اس میں کوئی وقفہ نہ آنے دیا جاتا۔'' میں نے اسے بتایا ''اب مجھے سنتری کے فرائض سونپ دیئے گئے ہیں۔ ہم دونوں اکٹھے یہ ڈیوٹی سرانجام دیا کریں گے اور کوئی تیسرا شخص ہمارے ساتھ نہیں ہوا کرے گا۔'' حوصلہ افزائی کے یہ کلمات سن کر اس نے اپنا منہ چادر میں چھپا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے خائف ہے۔

''ہکیدا! خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، تمہیں آئندہ خودکشی کی کوششوں سے باز رہنا ہوگا۔''

اس نے چادر سے منہ نکالا اور بولا: ''واقعی؟ کاش جب میں پیدا ہوا تھا، میں لڑکا نہ ہوتا، لڑکی ہوتا۔ کسی عورت کو اس قسم کے لوگوں کو برداشت نہ کرنا پڑتا۔ آخر یہ میرے ہی پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں؟'' اس نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ہسپتال میں اپنے فرض کے لمحات اپنے خاندان اور موت کے متعلق سوچنے میں گزارے ہیں۔ میرے سارے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اب تک ہمارے یونٹ میں خودکشی کے واقعات صرف جوانوں تک محدود رہے تھے جن کے پاس صرف ایک ستارہ تھا۔ بلااستثنا

ان سب نے کسی چیز کے ساتھ لٹک کر اپنے آپ کو ہلاک کیا تھا۔

ہکیدا ایک ایسا شخص بن چکا تھا جس کے بغیر میرا گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ میرے نزدیک انسان کم اور ایک قسم کا ستارہ زیادہ تھا۔ سینئر افسروں کے لیے اس کا وجود اور بھی ضروری تھا۔ یہ بالکل صاف ظاہر تھا کیونکہ جب اسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا، سارے یونٹ پر اداسی کی کیفیت طاری ہوگئی جیسے ان کی کوئی عزیز شے کھوگئی ہو۔ جوانوں نے مجھے اپنا پنچ بیگ (Punch bag) بنانے کی کوشش کی لیکن انہیں ناکامی ہوئی اور اس کے بعد وہ اکثر مجھ سے اس کی حالت کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔

بہرحال انجام کار ہکیدا اور میں شہر کے دروازوں پر پہرا دینے لگے۔ شہر ایک فصیل کے اندر محصور تھا جس کا محیط ڈھائی میل تھا۔ یہ دیوار پندرہویں یا سولہویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی اور ابھی تک صحیح سلامت کھڑی تھی۔ قطب نما کے ہر نقطے پر ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ ہمیں ہر صبح ساڑھے پانچ بجے وزنی زنگ خوردہ دروازوں کو کھولنا اور شام ساڑھے پانچ بجے بند کرنا ہوتا تھا۔ جب دروازے مقفل ہو جاتے، آمدورفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ جب چاروں اوڑ خاموشی چھا جاتی، ہم فصیل کے ساتھ ساتھ گشت کرنے لگتے۔ جب ہماری ڈیوٹی ختم ہو جاتی، ہمیں اکثر خربوزے اور تربوز چرانے کے لیے شہر سے باہر بھیج دیا جاتا۔ اگرچہ مجھے اس کا احساس نہیں ہو پایا تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میں ہکیدا پر حکم چلانے لگا تھا۔ جب وہ بیل سے خربوزہ یا تربوز توڑ رہا ہوتا، میں اپنا جسم اکڑا کر اس کے سر پر کھڑا ہو جاتا اور کہتا کہ وہ اسے جلدی جلدی توڑے۔ اتنے میں مجھے کوئی اور پکا ہوا خربوزہ یا اچھا تربوز نظر آ جاتا اور اسے توڑنے کے لیے میں اسے ادھر بھیج دیتا۔ میرا حکم سن کر وہ بزدلوں کی طرح میرا منہ تکنے لگتا۔ اس پر میرا پارہ چڑھ جاتا اور میں اسے چیخ چیخ کر ڈانٹنے لگتا۔ مجھ سے اس قسم کی حرکت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جب ہکیدا چل پڑتا، تو میں بھی چل پڑتا۔ ان سب باتوں کا مطلب کیا تھا؟ ان کا آغاز کب ہوا تھا؟

سنتریوں کی حیثیت سے ہمیں ہر چینی باشندے کے، جو دروازوں سے شہر کے اندر آتے یا باہر جاتے تھے، کاغذات کی جانچ پڑتال کرنا اور دیکھنا ہوتا تھا کہ کہیں یہ جعلی تو نہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہم یہاں اپنی مرضی کے مختار تھے، بلکہ ہمارے سروں پر آہنی خود اور ہاتھوں میں سنگینیں دیکھ کر کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ ہمارا مضحکہ اڑاتا۔ کسی کو اتنا بھی معلوم

نہیں تھا کہ میں جاپانی امریکی ہوں۔ میں سوچا کرتا کہ اگر میں یہی فرائض ادا کرتا رہا تو میں ایک دن ان مقامی باشندوں کو پسند کرنے لگوں گا۔

''تمہارا نام؟ جائے پیدائش؟ عمر؟''

''بچے؟ کتنے؟''

''کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟''

''وہ گاؤں کتنا دور ہے؟''

''جب تمہاری بیٹی جوان ہو گی، وہ ملکہ حسن کہلائے گی!''

مجھے جو چند ایک چینی جملے یا ترکیبیں یاد تھیں، وہ میں نے ازبر کر لی تھیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ میں اس قسم کے سوالات بھی پوچھنے اور ان چیزوں پر بھی، جن کا میرے فرائض سے کوئی تعلق نہیں تھا، تبصرے کرنے لگا۔ جب (عیسائی) مبلغ (مشنری) گزرتا، میں اس سے انگریزی میں علیک سلیک کرتا۔ مجھے احساس ہوا کہ ہکیدا میری نقالی کرنے لگا ہے اور ہر قسم کے سوال پوچھتا پھرتا ہے۔ تجارت کے بارے میں اس کی معلومات مجھ سے کہیں زیادہ اور بہت سی باتیں ایسی تھیں جنھیں صرف وہ جاننا چاہتا تھا۔ مقامی باشندے سوتی کپڑا، آٹا، گھریلو سامان اور ہر قسم کی دیگر اشیا اپنی پیٹھ پر باندھ کر یا خچروں پر لاد کر لاتے لے جاتے رہتے تھے۔ بظاہر ہمارا ظالمانہ فرض یہی تھا کہ ہم اپنی سنگینوں سے ان کی گٹھڑیاں ٹٹولیں یا بعض اوقات انہیں کھول کر دیکھیں کہ کہیں انہوں نے ان میں ہتھیار تو چھپا کر نہیں رکھے۔ ہم یہ کام تو شاذونادر ہی کرتے، اس کی بجائے ہم محض اپنی شان بڑھانے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوال کر کے اپنا وقت صرف کرتے رہتے۔

چونکہ ہم جیسے عجیب وغریب انسپکٹر چینیوں کی کوئی چیز اپنے قبضے میں نہیں لیتے تھے، وہ دروازے میں سے گزرتے وقت ہمیشہ اپنی زبان میں Hesieh-hesieh کہہ کر ہمارا شکریہ ادا کرتے تھے۔ تاہم ایک شام ایک سینئر افسر دبے پاؤں ہمارے پیچھے آ کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس نے اتنے زور سے مجھے ٹھوکر ماری کہ میں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا۔ میں کسی کچلے ہوئے مینڈک کی طرح منہ کے بل لیٹا ہوا تھا لیکن ابھی تک مضبوطی سے اپنی سنگین پکڑے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس سلوک کے لیے مجھے ہی کیوں منتخب کیا گیا ہے لیکن شاید مجھے اس کی توقع کرنا چاہیے تھی

کیونکہ میں پرائیویٹ فرسٹ کلاس تھا اور اپنے اور ہکیدا کے افعال کا ذمے دار تھا۔ جب میں اٹھ کر کھڑا ہوا، مجھے ایک بار پھر بوٹ کی ٹھوکر سے نوازا گیا اور میں دوبارہ نیچے گر پڑا۔ میرے قریب جو چینی کھڑا تھا، وہ یک بیک میرے افسر کی تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔ جو لوگ ابھی دروازے میں سے گزرنے کے منتظر تھے، وہ میری طرف دیکھ کر کھیسیں نکالنے لگے۔ انہیں یہ بات بہت دلچسپ لگی ہوگی کہ میری عینک کی کمانی ٹوٹ گئی تھی اور ایک شیشہ نیچے گر پڑا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا یہ بے مروت لوگ ہیں، میرا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں، میرے دشمن ہیں اور میرے افسروں سے ملے ہوئے ہیں۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ اس وقت اپنے رویوں سے ایک، دو اور تین ستاروں کے مابین امتیاز کا واضح انداز سے اظہار کر رہے تھے۔ یہی ایک بات ٹھٹھا اڑانے کے لیے کافی تھی۔

اس مختصر لمحے کے دوران میں میرے تمام خواب چکنا چور ہو گئے۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں جن سرابوں میں گھر گیا تھا، انہیں فنا کرنے کا ذمے دار ہکیدا تھا۔ میں سمجھا کرتا تھا کہ جو چینی میرے سامنے گزرتے ہیں، وہ میرے بھائی بند ہیں لیکن اس کے بعد میرا یہ احساس ختم ہو گیا۔ میں جب ہکیدا کو کسی چینی مرد کی طرف، جو کسی حاملہ عورت کی معیت میں گزر رہا ہوتا، شہوت بھری نگاہوں سے دیکھتے پکڑ لیتا تو میں اسے فوراً اشاروں ہی اشاروں میں بتا دیتا کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز رہے۔ لیکن وہ محض میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا اور دانت نکوسنے لگتا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ گزشتہ چند دنوں سے اس کا وتیرہ بن چکا ہے کہ وہ میرے احکام کو نہ صرف بلاچون و چرا تسلیم کر لیتا ہے بلکہ ان کی تعمیر کر کے ایک قسم کی لذت بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ مجھ پر اعتبار اور اپنے تحفظ کے لیے مجھ پر انحصار کرتا تھا۔ پھر کیا بات تھی کہ اس کے چہرے پر جو ہر دم شگفتگی جھلکتی رہتی تھی، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتی تھی؟ جب آدمی مدارج کی سیڑھی پر ایک قدم اوپر رکھتا ہے، تو کیا یہی کچھ ہوتا ہے؟

شہر کی فصیل پر تین چار گز چوڑا راستہ بنا ہوا تھا۔ ایک رات گھپ اندھیرے میں ہم وہاں گشت کر رہے تھے۔ عام طور پر دیوار کے چار میں سے دو حصوں کا گشت ایک سپاہی کرتا تھا مگر چونکہ ہم ابھی تک تربیت کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہے تھے، ہکیدا اور میں اکٹھے پہرا دینے لگے۔

دن کی روشنی کے اوقات کے دوران میں میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ میں ہکیدا کا گلا گھونٹنے کی حرکت سے باز رہوں۔ تاہم جب ڈیوٹی پر ہوتے تھے، ہکیدا معمول کے مطابق میرے پیچھے پیچھے بھاگتا اور نیچے مکانوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو مرتبہ دیوار پر پھسلنے اور نیچے گرنے سے بال بال بچا۔ اس پر مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے قسم کھالی کہ اگر اس نے تیسری مرتبہ یہ حرکت کی تو وہ آسانی سے سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

چنانچہ جب اگلی بار وہ احمق کنارے سے پھسلنے لگا تو میں نے اس کے کالر پر جھپٹا مارا اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر میں اسے گھسیٹتے گھسیٹتے دوسری جانب کنگنی کے پاس لے گیا اور اسے اپنے اور کنگنی کے مابین کچھ اس طرح پھنسا دیا کہ وہ ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوسکتا تھا۔ میں اپنے سنتری کے فرائض بھول گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا: ''تم اچھی طرح جانتے ہوں تم فوجی ہو، کوئی عام آدمی نہیں!'' پھر میں اس کی زبردست پٹائی کرنے لگا۔ چوٹ کھا کر اسے جو درد ہوتا تھا، وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں سرسراتا محسوس ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اس قسم کا درد ہے جس کی کسک وہی محسوس کرسکتا ہے، خود جس کی اپنی مسلسل دھنائی ہوتی رہی ہو۔ حقیقتاً میں جو کچھ اس سے کہنا چاہتا تھا، وہ یہ تھا: ''تم جانتے ہو تم پست ترین ستارے ہو!''

ہکیدا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر مزاحمت کی کوشش کی۔ اپنی حالیہ پٹائیوں کے دوران میں اسے سبق ملا تھا کہ اسے کسی صورت میں بھی اپنے ہاتھ اپنے چہرے سے نہیں ہٹانا چاہئیں۔ میرے ساتھ جب اس نے دوبارہ یہی حرکت کی میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ ہٹا دیئے اور اس کی مزید پٹائی کرنے لگا۔

''جوجی! خدا کے لیے بس کرو............تم جو کہو گے میں وہی کیا کروں گا! میں تمہارے کپڑے دھوؤں گا۔ سب کچھ کروں گا!''

''تمہارا خیال ہے میں تمہارے جیسے شخص کی لیڑ چٹائی سے متاثر ہو جاؤں گا؟''

میں نے کچھ اس قسم کی بات کہی ہو گی۔ میری ذہنی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو گی کہ میرا غیظ وغضب مجھ پر حاوی ہو گیا۔ ہکیدا نے اپنے چپٹے، آنسوؤں سے داغ دار اور جذبات سے مغلوب چہرے کا رخ شہر کی جانب سے ہٹا لیا اور درد ناک آواز میں رونے لگا۔ پھر اس نے کنگنی پر چڑھنے اور تیس فٹ بلند دیوار سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔

جب مجھے یاد آیا کہ اپنے ہسپتال کے کمرے میں وہ خودکشی پر کتنا آمادہ نظر آ رہا تھا تو مجھ پر دہشت کا اتنا غلبہ ہوا کہ میرے لیے اپنی جگہ سے ہلنا ناممکن ہو گیا۔ تاہم میں آگے بڑھا اور اسے دیوار سے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

آخر میں نے دیوار پر کیا کیا تھا؟ شہر کے اندر خچروں نے غیر مختتم ڈھینچوں ڈھینچوں شروع کر دی تھی۔ یہ اتنی بلند تھی کہ دیوار کی دوسری طرف بھی صاف سنائی دینے لگی تھی۔ ہمارے نیچے جو مکان تھا، اس میں سے بدھ مت کے سوتروں کے خوش الحانی سے پڑھنے کی آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ جس قسم کی زندگی یہ چینی گزار رہے تھے، وہ بالکل قابل رحم تھی لیکن ہماری حالت ان سے بھی بدتر تھی۔ مجھے جس اذیت کو بھگتنا پڑ رہا تھا، اس نے مجھے پاگل پن کے قریب پہنچا دیا تھا اور جب میں نے شہر پناہ کے خنک قدیم پتھروں کو اپنی گرفت میں لیا، مجھے ستاروں کا گجرا دکھائی دیا جو مجھ سے ایک درجہ نیچے شروع ہو کر آسمان کی جانب اٹھ رہا تھا۔ اس نے آسمان کے گرد حلقہ بنا لیا اور پھر میری مخالف سمت دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ مدتیں ہوئیں، میں بھول چکا تھا کہ آسمان پر ستارے بھی ہوتے ہیں۔

مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور میرا آزردگی اور اکیلے پن کا احساس بڑھنے لگا۔ ہکیدا ابھی تک سمٹا سمٹایا بیٹھا تھا اور تنگ مزاجی سے بڑبڑا رہا تھا: ''تم جاپانی نہیں ہو! نہیں ہو! نہیں ہو!''

پھر ناپسندیدہ ہکیدا کا تبادلہ جنوب مشرقی ایشیا میں مقیم کسی یونٹ میں ہو گیا اور مجھے حکم ملا کہ میں ضلعی کمان کے کیپٹن آئینوما کے اردلی کی حیثیت سے رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر میں حاضر ہو جاؤں۔ اس کی عمر بائیس تیئیس برس تھی اور اس میں کوئی قابل تعریف خوبی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ افسر تھا۔ اس کی شہرت کا زیادہ تر سبب اس کی وہ کلیاں تھیں جو وہ میرے ہر صبح پانی لے کر حاضر ہونے پر غرغراہٹ کی آوازیں پیدا کر کے کھڑکی کے باہر کرتا تھا یا پھر یہ کہ وہ سیاہی مائل چینی چائے پی سکتا تھا۔ قصہ مختصر، وہ ماڈل افسر تھا۔ جب وہ اپنے جسم پر ستارے سجا لیتا تو وہ کم از کم تیس سال کا دکھائی دینے لگتا۔ کتنی عجیب بات ہے جب آدمی کو دو ستارے مل جاتے ہیں تو معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس کی عمر بھی بڑھ گئی ہے جیسے اس کے سن و سال ستاروں کی حکومت کے تابع ہوں۔

چنانچہ جب پہنچ سے باہر ان ستاروں سے میرا واسطہ پڑا تو مجھے ان سے نفرت نہیں

ہوئی بلکہ میں ان کا ایک طرح سے گرویدہ ہو گیا۔ میں سوچتا ادنیٰ ستاروں کے مابین جو مجھے اذیت برداشت کرنا پڑتی تھی کہیں اس کی وجہ سے میں یہ تو نہیں سمجھنے لگا تھا کہ اگر میں سٹار سسٹم کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں اور اپنے آپ کو بے مصرف گرداننے لگوں تو زندگی زیادہ بامعنی ہو جائے گی؟ میں واقعی یقین کرنے لگا تھا کہ ستاروں کی اپنی جبلی اور خلقی اہمیت ہوتی ہے.......... یہ کہ پرائیویٹ فرسٹ کلاس عام سپاہی سے، لانس کارپورل پرائیویٹ فرسٹ کلاس سے، نان کمشنڈ افسر عام پیادہ سپاہی سے اور کمشنڈ افسر نان کمشنڈ افسر سے کہیں برتر ہوتا ہے۔ مجھے واقعی یقین ہو چکا تھا کہ جو لوگ مجھ سے مرتبے میں برتر ہیں، وہ خلقی طور پر مختلف قسم کی مخلوق ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب آدمی افسر ہو، وہ خلقی طور پر مختلف قسم کی مخلوق ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب آدمی افسر ہو، وہ خلقی طور پر مختلف قسم کی مخلوق ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب آدمی افسر ہو، پھر تو بات ہی نرالی ہے! میں یہ کیسے تصور کر سکتا تھا کہ کیپٹن آئینوما کا.......... اس بلند و برتر شخص کا جس کے میں ہر روز کپڑے دھوتا تھا، کھانا کھلاتا اور چائے پلاتا تھا.......... تعلق انسانوں کی اسی نوع سے ہے جس سے میرا تھا۔ پھر ایک مختصر وقت ایسا آیا جب میرے ذہن میں یہ عجیب خیال گردن کرنے لگا کہ وہ مجھ سے اس لیے برتر ہے کیونکہ اس کا تعلق سبزی خوروں کی نسل سے ہے۔ میں شاید اونچا مرتبہ حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہا تھا کیونکہ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر عرصہ امریکا میں گزارا تھا اور گوشت خوری نے مجھے اخلاقی اعتبار سے قعرِ مذلت میں گرا دیا تھا۔

تاہم اس سے بھی اہم تر بات یہ تھی کہ میری دو ستاروں تک ترقی نے خود ستاروں پر میرے یقین میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ ڈویژن کمانڈر ہماری رجمنٹ کا معائنہ کرنے آ گیا۔ جب کمانڈر آئینوما نے گلا پھاڑ کر کہا: ''نگاہیں دائیں طرف!'' تو جو سپاہی بالکل میرے بالمقابل کھڑا تھا، اس نے اپنا سر کمانڈر کی جانب گھما دیا۔ اس لمحے میری خوف زدہ نگاہوں کو یوں محسوس ہوا جیسے اس سپاہی کا چہرہ پھیل کر بالکل بے شکل ہو گیا ہو۔ کمانڈر تیز تیز قدموں سے چلتا سپاہی کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا، غصے سے غرایا اور آگے نکل گیا۔ سپاہی نے اپنا لمبوترا چہرہ اور بھی سخت کر لیا اور بے خوف و خطر اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ افسر اعلیٰ نے سپاہی کا جبڑا، جو اپنی جگہ سے ہل گیا تھا، درست کر دیا تھا۔ حیرت سے میری زبان گنگ ہو گئی۔ تاہم بعد ازاں ساری رجمنٹ نے

تشکر کے آنسو بہائے۔ پتا نہیں کیسے لیکن حقیقت یہی ہے کہ کمانڈر نے جس انداز سے اپنے جسم کو متوازن اور باوقار بنا رکھا تھا اور اس نے جس عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ ستاروں کی اس تعداد کے عین مطابق تھا جو اس نے پہن رکھے تھے۔ اب جب میں اس جذباتی لیکن بے معنی منظر کو یاد کرتا ہوں، تو مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی ممکن ہے کہ جو جبڑے اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں، انہیں درست کرنے میں اسے مہارت تامہ حاصل ہو۔

کیپٹن آئینوما کے اردلی کی حیثیت سے مجھے جو خدمات سر انجام دینا پڑتی تھیں وہ عین مین وہی تھیں جو کمروں کی صفائی اور سجاوٹ کے کام پر مامور ہوٹل کی خادمہ بجا لاتی ہے۔ اگر میں بالکل اسی وقت دو کالر لے آؤں، جن میں سے ایک پر کیپٹن کا اور دوسرے پر پرائیویٹ فرسٹ کلاس کا نشان ثبت ہو اور کسی بچے سے پوچھوں کہ ان میں سے بہتر کون سا ہے، تو وہ لاریب کیپٹن کے کالر کو ترجیح دے گا۔ ہمارے عہدوں کے مابین جو فرق تھا، میں اسے اچھی طرح سمجھتا تھا اور ہمیشہ جھک کر کیپٹن کو تسلیمات کرتا تھا۔

چونکہ میرے پاس ادنیٰ ترین ستارے تھے، مجھے ان تمام لوگوں کی نمائندگی کرنے کے لیے رجمنٹ کے ہیڈ کوارٹر میں بھیج دیا گیا تھا جن کے نام حاضری کے رجسٹر میں درج تھے۔ تاہم مجھے سب سے پہلے جو کام کرنا پڑتے تھے، وہ یہ تھے کہ کمرے میں جو پانچ سٹوو تھے، میں ان میں سوختنی لکڑی بھروں، جھاڑن سے بیس گز لمبی راہداری اور زینے کی صفائی کروں اور انہیں خوب چمکاؤں اور پھر کیپٹن کا ناشتہ اس کی خدمت میں پیش کروں لیکن ناشتے سے پہلے مجھے اس کی چلمچی اس کے پاس لے جانا اور اس کا بستر لپیٹنا ہوتا تھا۔ تاہم ان سب کاموں سے پہلے مجھے ہر شخص کا ناشتہ بھی اس کے پاس پہنچانا پڑتا تھا۔ میں جب تک باورچی خانے سے کچھ کوئلہ چرا کر نہ لے آتا، سٹوو میں لکڑیاں نہیں جلا سکتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ ہر صبح مجھے جو فرائض سر انجام دینا پڑتے تھے وہ بے شک ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے، میں ان سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ جب میں فرشوں کی رگڑ رگڑ کر صفائی کر رہا ہوتا تو میں جس انداز سے جھاڑن نچوڑتا تھا، مجھے اس میں بھی مزہ آتا تھا اور فرشوں کے تختوں میں جو کیلیں اور میخیں جڑی ہوئی تھیں، ان سے بچنا تو میرے لیے چیلنج ہوتا تھا۔ جب میں مختلف لوگوں کے ناشتے اٹھائے ہوئے گزر رہا ہوتا اور اس تگ و دو میں مصروف ہوتا کہ کہیں میرے سلیپر پھسل کر دور نہ جا گریں اور شوربا پیالیوں سے اچھل نہ

جائے، تو بلا ناغہ کوئی نہ کوئی سینئر افسر کچھ فاصلے پر لازماً نمودار ہو جاتا اور مجھے کوشش کر کے اسے سلام کرنا پڑتا لیکن اس کے بعد میرا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا۔ اسے میں اپنی آزمائشوں کا قدرتی نتیجہ قرار دیتا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں جھاڑن پکڑ کر فرش پر اس کے ساتھ ساتھ رینگنے، پھر اچانک رجمنٹ کے علم کے سامنے کھڑے ہونے، سنتری کو سلام کرنے اور اس کے بعد دوبارہ فرش کو چمکانے کے کام بہرحال کسی نہ کسی طور ولولہ انگیز معلوم ہوتے تھے۔ ہمارا گرد آلود علم ایک چوکی پر کھڑا تھا۔ اس کی حفاظت کی ذمے داری ایک جاندار سپاہی کے سپرد تھی اور میں اسی علم کو سیلوٹ کرتا تھا۔

جب کیپٹن آئینوما سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے رائرے کیشو (Rirekisho) لکھوانا چاہتا تھا۔ بظاہر وہ اس بات سے خوش نظر نہیں آتا تھا کہ اس کے اردلی کے کالر پر صرف دو ستارے چسپاں ہیں اور مزید برآں اسے اردلی بھی وہ ملا تا جو دوسری نسل کا جاپانی امریکی تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس وقت مجھے رائرے کیشو کا مطلب معلوم نہیں تھا۔

''رائرے کیشو، رائرے کیشو؟'' میں اس لفظ کی جگالی کرتا رہا تا آنکہ وہ مجھے سمجھانے لگا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ''آپ کا مطلب ذاتی کوائف ہیں؟'' میرے منہ سے بے اختیار انگریزی میں نکلا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ انگریزی لفظ استعمال کرنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ وہ میرے ردعمل پر واقعی جھنجھلا گیا تھا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا اردلی خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، وہ اسے قبول کرنا اور اسے اول درجے کے سپاہی کے قابل میں ڈھالنا اپنا فرض منصبی گردانتا ہے۔ اپنے ذاتی کوائف بیان کرتے ہوئے میں نے لکھا کہ جب میں مڈل سکول میں داخلے کی عمر کو پہنچا تو مجھے واپس کیلی فورنیا بھیج دیا گیا تاکہ میں اپنے والدین کی نگرانی میں رہ سکوں۔ جب امریکا میں قیام کے دوران میری کالج کی تعلیم مکمل ہوگئی تو میں اپنے دادا جان سے ملنے جاپان چلا آیا اور یہاں مجھے جبری لام بندی کے قانون کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ جب کیپٹن نے یہ سب کچھ پڑھا تو وہ مجھے یوں گھور گھور کر دیکھنے لگا جیسے میں کوئی دلچسپ پردیسی جانور ہوں۔ اس نے اعتراف کیا کہ میں اسے مکمل جاپانی نظر نہیں آیا تھا اور اس نے اتنی مروت برتی کہ مجھ سے کیلی فورنیا کے متعلق طرح طرح کے سوال پوچھنے لگا۔ موقع کے مطابق مجھ میں گرم جوشی آتی گئی اور میں

اس خطے کے متعلق اپنی تمام خوشگوار یادیں بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ میری باتیں سنتے سنتے تنگ آ گیا۔ اس نے جھپٹ کر وہ سارے کاغذات چھین لئے جن پر میں نے اپنے کوائف لکھے تھے، انہیں پرزے پرزے کیا اور سٹوو میں جھونک دیا۔

''پرائیویٹ فرسٹ کلاس سوگی ہارا! تمہیں جاپانی سپاہی بننے کے لئے بڑی مشقت کرنا پڑے گی۔ تمہیں یہ بات اپنے دل میں نقش کر لینا ہو گی کہ تمہارا ماضی وہ جیسا بھی تھا، آج سے ختم ہو گیا ہے۔ اب تم اسے کاملاً فراموش کر دو گے۔'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ اس کے علاوہ اس نے حکم دیا کہ مجھے بلاناغہ ''خود احتسابی کا روزنامچہ'' لکھنا ہو گا۔ اس کے پڑھنے کے بعد ہی وہ فیصلہ کر سکے گا کہ میں نے سچا جاپانی سپاہی بننے کے سلسلے میں کوئی پیش رفت کی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے چینی شاعری گنگنانے کے نفیس آرٹ کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ بعد ازاں اس نے دو مرتبہ مجھ سے میرے ذاتی کوائف از سر نو لکھوائے لیکن اس نے انہیں بھی پھاڑ ڈالا۔ میں نے ان حقائق کو مناسب انداز سے اپنے روزنامچے میں بیان کر دیا۔

اگرچہ میں اپنے مشاہدہ باطن کے لئے روزانہ مواد تلاش کرتے کرتے عاجز آ گیا تھا، تاہم کیپٹن آئینوما نے اتنی مہربانی ضرور فرمائی کہ وہ میری خامیوں کی نشان دہی کرنے لگا۔ اسے کسی بات میں اتنی خوشی نہیں ملتی تھی جتنی کہ مجھ سے ''خود احتسابی'' کے سلسلے میں صفحے لکھوا کر حاصل ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں یک شک پختہ ہو چکا ہے کہ میں اپنے باطن میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ چنانچہ اسے یہ جتانے کے لیے کہ میں اس کا تہہ دل سے احترام کرتا ہوں، میں اس کی تعریف میں لمبی لمبی عبارتیں لکھتا رہتا تھا۔ تاہم آخر کار اسے میری وفاداری جانچنے کا انوکھا طریقہ سوجھ گیا۔ اس نے مجھ سے کیپٹن کے درجے کے افسر کے کالر پر لگانے کے تین مختلف نشان بنوائے۔ جب رات کو وہ سو رہا ہوتا تو مجھے گاہے بگاہے یہ نشانات باری باری اس کی وردیوں پر چسپاں کرنا ہوتے تھے۔ تاہم اس قسم کا کام کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ میں خواب میں بھی نہیں بھول پاتا تھا کہ وہ کیپٹن ہے اور پھر اس حقیقت کو یاد دلانے کے لیے فطری طور پر میرا روزنامچہ بھی موجود تھا۔

اس کے نشانات کو باری باری چسپاں کر کے میں جو کفارہ ادا کر رہا تھا، اسے

چونکہ میں اپنی تذلیل سمجھتا تھا، لہٰذا میں اپنے دماغ میں اس خیال کی آبیاری کرنے لگا کہ کیپٹن خود بھی ایک ستارہ ہے اور یہ کہ ستاروں کی اپنی خلقی شان و شوکت ہوتی ہے۔ میں نے اس طرح پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

اپنے موجودہ تناظر سے میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ کبھی میں اس طرح بھی سوچا کرتا تھا۔ لیکن جب کیپٹن آئینوما ٹہلتے ٹہلتے میری طرف آتا، میرا دماغ اس کی ذات پر نہیں بلکہ اس کے تمام ستاروں پر، جن میں سے ہر ایک کو دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آتا تھا، مرکوز رہتا تھا۔ ان تینوں جانے پہچانے ستاروں کے چہروں سے جو تاثرات جھلکتے رہتے تھے، وہ میرے دل پر نقش ہو چکے تھے۔ ذرا تصور کریں، میں نے اپنے نہاں خانہ دل میں ان تینوں کے نام بھی رکھ چھوڑے تھے۔ میں انہیں اپنے دو بھائیوں اور اپنی چھوٹی بہن کے ناموں پر ٹام، فرینک اور کیٹ (Kate) کہتا تھا۔ جب یہ ستارے میری طرف آ رہے ہوتے، میں دل ہی دل میں ان کا خیر مقدم کرتا اور: ''فرینک، کیسے ہو؟'' جیسے کلمات کہتا۔

ایک مرتبہ جب میں کیپٹن آئینوما کو سیلوٹ کر رہا تھا، مجھے یاد ہے میں نے اسے کرختگی سے کہتے سنا تھا:

''پرائیویٹ سوگی ہارا! سچ سچ بتاؤ یہ تم سیلوٹ کسے کر رہے ہو؟''

''جی جناب، آپ کو جناب، کیپٹن صاحب کو جناب!''

''آئندہ تم مجھے سیلوٹ نہیں کرو گے، میری آنکھوں کو سیلوٹ کیا کرو گے۔ اپنے روزنامچے میں لکھ لو۔''

جس روز بارش ہوتی، مجھے کیٹ پر ترس آ جاتا۔

فرینک بھائی ڈسپلن کی پابندی نہیں کرتا تھا اور ہمیشہ گندا ہو جاتا تھا۔

ٹام بھائی ہمیشہ تقریبات کے مواقع پر اپنی چمک دمک دکھاتا تھا۔

تاہم اس قسم کے خیالات کو روزنامچے میں قلم بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کیپٹن آئینوما کے پاس یہ معلوم کرنے کا قطعاً کوئی طریقہ نہیں تھا جس سے وہ معلوم کر سکتا کہ درحقیقت میرا دماغ سوچ کیا رہا ہے۔

ایک روز جب میں باتھ روم میں کیپٹن کو نہانے میں مدد دے رہا تھا تو وہ ٹب

سے باہر نکلا اور دھڑام سے میرے سامنے فرش پر گر پڑا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کو بجلی کا زبردست جھٹکا لگا ہو۔ میں اس عجیب وغریب احساس کو جھٹکنے میں ناکام رہا کہ کیٹ ابھی تک اس کی گردن سے چمٹی ہوئی ہے۔ میں کیپٹن کو وردی کے بغیر اور برہنہ دیکھ کر اتنا گم صم کیوں ہو گیا ہوں؟ درحقیقت میرے سامنے یہ برہنہ شخص کون ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا جسم گٹھیلا اور طاقت ور ہے اور اس کے ڈولے دیکھنے کے لائق ہیں کیا اس شخص میں، جس کے بال بہت باریک کٹے ہوئے ہیں اور مجھ میں اتنا ہی بڑا فرق ہے جب ہم دونوں برہنہ ہوں؟ جب وہ دوبارہ ٹب میں بیٹھ گیا، وہ کوئی چینی گیت گنگنانے لگا۔ میں اس کا تولیہ اور صابن پکڑے اپنے ہی خیالوں میں کھویا بیٹھا رہا۔ اس کی گنگناہٹ نے مجھے از سر نو اس حقیقت کا احساس دلایا کہ میرے سامنے واقعی کیپٹن آئینوما ہی ہے اور میں اپنے حواس میں آ گیا۔ تاہم مجھے کچھ اس قسم کا کاہلانہ اور بے چین کر دینے والا احساس ستانے لگا جیسے کوئی مشین کا پرزہ اپنی جگہ پر ڈھیلا ہو گیا ہو۔ میں خواہش کرنے لگا کاش میں اور کیپٹن دونوں ہی جلد از جلد اپنی اپنی وردیاں پہن لیں۔

اس کے ساتھ غسل خانے میں جانے کا یہ میرے لیے پہلا موقع تھا۔ اس دن مجھے حکم ملا کہ آئندہ میں غسل کرنے میں اس کی باقاعدہ مدد کیا کروں گا لیکن ہر تجربہ مجھے مزید ہتھے سے اکھاڑ دیتا تھا۔ سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ وہ جس انداز سے جلدی جلدی چائے سڑکتا ہے، جس انداز سے اپنا چاول کا پیالہ دوبارہ بھرتا ہے، جس انداز سے نیند میں خراٹے لیتا ہے اور جس انداز سے ہر صبح کھڑکی کے باہر کلی کرتا ہے، اس میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے۔ میں اپنی سوچوں میں مستغرق رہنے لگا اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی بھی فوجی سپاہی اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تاوقتیکہ اسے زخمی ہونے یا کوئی بھیانک کارروائی پیش آنے کی توقع نہ ہونے لگے۔ مجھے پریشانی لاحق ہونے لگی کہ مجھ سے ضرور کوئی حماقت سرزد ہو جائے گی۔

ایک روز جب میں کیپٹن آئینوما کے ساتھ پیکنگ جا رہا تھا، مجھے راستے میں ہاتھوں کی زنجیر نظر آئی جو اسے سلیوٹ کرنے کے لیے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میرا ہاتھ بھی خود بخود اوپر اٹھ گیا۔ ہمارے آگے ایک موٹر گاڑی تھی، وہ اچانک رک گئی۔ کیپٹن اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ میں نے بھی اس کی مثال پر عمل کیا۔ میں فوجی

سپاہیوں کی طرح اپنا جسم اکڑا کر کھڑا ہو گیا اور بغور دیکھنے لگا۔ موٹر گاڑی کا دروازہ کھلا اور چیف آف سٹاف ناوا باہر نکلا۔ کیپٹن جھٹ پٹ پوری قوت سے چلایا: ''سیلوٹ!'' اور میں نے اپنا ہاتھ سر تک اٹھا لیا۔ لیکن میں یہ دیکھنے کے لیے برقرار ہو رہا تھا کہ موٹر گاڑی میں سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ چنانچہ میں اپنا ہاتھ فضا ہی میں بلند رکھ کر کیپٹن کے عقب سے جھانکنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے کیا نظر آیا؟ پوری کہکشاں! یہ عام قسم کے دس لاکھ ستاروں سے بھی زیادہ پرشکوہ اور خیرہ کن تھی! میں نے اتنے قریب سے اتنی ٹھاٹھیں مارتی درخشندگی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں ان چمکتے دمکتے ستاروں کے جھرمٹ کا کس چیز سے موازنہ کروں؟ جن بہن بھائیوں پر میں جان چھڑکتا تھا، وہ اب مناسب استعارے معلوم نہیں ہوتے تھے.......... اتنے جسیم ستاروں کے سامنے وہ ستارے، جنہیں میں روز مرہ دیکھا کرتا تھا، نقلی دھاتوں کی اشیا معلوم ہونے لگے۔ یہ افسر اس ملکہ کی مانند نظر آ رہا تھا جو کمال شفقت سے کام لے کر اپنی موجودگی سے کسی شہر کو رونق بخشتی ہے۔ میں اپنے دائیں ہاتھ کو بالکل بھول چکا تھا۔ جب ملکہ کا جلوس شروع ہوا، میں اضطرابی کیفیت میں اسے دیکھنے لگا۔ چیف آف سٹاف ناوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ میں بھی اس کی طرف چل پڑا لیکن ابھی میں نے ایک دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ اچانک چیختے چنگھاڑتے الفاظ میرے کانوں سے ٹکرانے لگے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ چیف آف سٹاف کے ساتھ میرا رویہ بے ادبانہ تھا۔ مجھے یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی، لیکن جب کیپٹن مجھے گھسیٹتا گھسیٹتا واپس یونٹ میں لے گیا، تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد میں پہلی مرتبہ کیپٹن کا چہرہ پوری طرح دیکھ سکا۔ اگرچہ کیپٹن بڑے ٹھسے سے دعویٰ کر رہا تھا کہ گزشتہ کچھ مدت سے ہم دونوں نے ایک ایک دن اکٹھے گزارا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میں نے حالیہ ایام میں ایک مرتبہ بھی اس کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ناک کا پینڈا موٹا تھا۔ اس کی آنکھیں مہین لیکن چمکتی دمکتی تھیں۔ اس کی ٹھوڑی نوکیلی اور منہ بھنچا ہوا تھا.......... ویسے گزشتہ چند منٹوں سے وہ بے قراری سے بار بار کھلتا اور بند ہوتا رہا تھا۔ میرے حواس ابھی ٹھکانے نہیں آئے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔

''یہ تم ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ کر جرنیل کو کیوں دیکھ رہے تھے، جیسے تم

جرنیل کونہیں محدب شیشے سے کوئی ننگی تصویر دیکھ رہے تھے؟ تمہاری یہ حرکت اور بھی ناقابل معافی ہے کیونکہ یہ تم نے چیف آف سٹاف کے سامنے کی تھی! میں اپنی تلوار سے تمہارا سر قلم کر دوں گا۔''

اس نے اپنی دھمکی بار بار دہرائی لیکن میں اسے محض دم بخود بیٹھا دیکھتا رہا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حواس باختہ ہو رہا تھا کہ یہ الفاظ، جن کا میری زندگی کے ساتھ اتنا گہرا تعلق ہے، اس کے منہ سے یوں نکل رہے ہیں جیسے یہ کوئی بالکل معمولی بات ہو۔ میں صرف اتنا فیصلہ کر سکا کہ آج مجھے اس کی وردی سے کیٹ کو اتار دینا اور اس کی جگہ فرینک کو چسپاں کر دینا چاہیے۔ اس کے ستارے ٹیڑھے میڑھے تھے۔ میرا منصوبہ قابل عمل نہیں تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا، اس کے متعلق میری یادداشت دھندلی پڑ گئی ہے۔ تاہم مجھے اتنا یاد ہے کہ کیپٹن آئینوما اس خاص چیف آف سٹاف کا کلاس فیلو تھا لیکن جب انہیں کمیشن ملا، وہ اس سے دو درجے نیچے رہ گیا تھا۔ اپنے دونوں کے مابین اس میں واضح فرق کو کم کرنے کی کوشش میں آئینوما نے میدان جنگ میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ہر مرتبہ جب اسے ترقی یا تمغہ ملتا، اس کا حریف اس سے دو درجے اور اوپر چلا جاتا اور کیپٹن ٹاپتا ہی رہ جاتا۔

معلوم ہوتا تھا کہ کیپٹن نے اپنے اوپر غیظ وغضب طاری کرنے کے لئے سخت محنت کی ہے۔ اس نے میرے کپڑے نوچ لیے اور مجھے الف ننگا کر دیا۔ پھر اس نے بڑی پھرتی سے اپنا کوٹ بھی اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے میرا مشرق کی طرف منہ کر کے مجھے نیچے بٹھایا، اپنی تلوار نکالی، اس کے پھل کو میری قمیص میں لپیٹا اور پھر میری طرف بڑھا۔

''تیار ہو؟ بزدل مت بنو۔ اب اپنا پیٹ خود ہی چاک کر دو۔ پھر تمہاری خاطر میں تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

میرے دل میں اس قسم کا کوئی شک پیدا نہ ہوا کہ وہ مذاق کر رہا ہے لیکن یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے پاس تو اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ میں کچھ غمگین ہی ہو لیتا۔ میں نے ٹکٹکی باندھ کر اپنے پیٹ کی طرف دیکھا۔ میری ناف

کتنی تنہا، کتنی اداس نظر آ رہی تھی! جب میں اپنی ناف دیکھ رہا تھا، یک بیک میرے منہ سے نکلا:

''دیکھیں..................ستارہ!''

''کیا؟ سوگی ہارا! کیا ہے؟'' وہ جھانکنے کے لیے آگے بڑھا۔

''ستارہ! یہ ستارہ ہے!''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری ناف واقعی ستارے کی مانند نظر آ رہی ہے! واہ، کیا..........'' کیپٹن نے اتنا فلک شگاف قہقہہ لگایا کہ میں بھونچکا رہ گیا۔

اگر یہ مضحکہ خیز واقعہ بالکل ہی ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے تو قصور میرا ہے کیونکہ میں اسے مناسب انداز سے پیش کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ جب آدمی کا تعلق ایک ایسی فوج سے ہو جس کا واحد مقصد دوسرے انسانوں کو نیست و نابود کرنا ہو، پھر بچاؤ کے لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مضحکہ خیز اور احمقانہ باتوں کا احساس پیدا کرے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان باتوں کی سچائی پر شک کا اظہار کر سکتے ہیں!

میں نے جو کچھ کہا تھا، رنج و الم کے عالم میں کہا تھا۔ غم مجھے اس بات کا تھا کہ جس ادنیٰ ترین ستارے، اکلوتے ستارے کے متعلق میرا خیال تھا کہ میں نے بالآخر اس سے چھٹکارا حاصل کر ہی لیا ہے، وہ کہیں اور نہیں، خود میرے اپنے پیٹ کے عین وسط میں چھپا ہوا تھا۔ میں ناقابل برداشت حد تک شرمندہ ہو گیا کہ میرے جذبات کسی اور شخص پر منکشف ہو گئے ہیں۔ کیپٹن آئینوما کے فلک شگاف قہقہوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور اب مجھے پاگل تصور کرنے لگا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ میرے انتہائی باطنی خیالات اس کی نگاہوں کے سامنے واشگاف ہو گئے تھے۔ اب مجھے مزید زندہ رہنے سے خوف آنے لگا تھا۔

میں اپنے پیٹ کو چھپانے کے لئے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اپنی قمیص پہن لی جس میں تلوار لپٹی ہوئی تھی۔ کیپٹن آئینوما، جس کی طبیعت بظاہر ابھی تک جولانی پر تھی، ایک کوٹ کی طرف بڑھا، اس نے اسے اٹھایا اور زیب تن کر لیا لیکن جب اس نے میری طرف دیکھا میرے منہ سے بے یقینی کی چیخ نکل گئی۔ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا، وہ کیپٹن آئینوما نہیں، بلکہ ''معمولی سپاہی'' آئینوما تھا۔ میرے دل میں کبھی

بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ کیپٹن آئینو ما عام سپاہی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ مجھے ژولیدہ دماغ اور مجبوب ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی بجائے میرے سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ اس کی لاپروائی تھی کہ اس نے میرا کوٹ پہن لیا تھا حالانکہ اس کو ہاتھ لگانے سے ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کا کپڑا اور باقی تمام چیزیں اس کے اپنے کوٹ سے بالکل مختلف تھیں۔ شاید اس کا اپنا دماغ ٹھکانے نہیں رہا تھا۔

اسے میرے تیوروں سے اندازہ ہوا کہ کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے اور وہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ جب اسے اصل بات کا اندازہ ہوا، اس کے چہرے کا رنگ قدرے سرخ ہو گیا۔ اس نے میرا کواٹ اتار دیا اور اسے میری طرف پھینک دیا۔ اب نشان بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمھیں اپنے کوارٹر میں نظر بند کیا جاتا ہے۔ اپنے رویے کے متعلق سنجیدگی سے غور وفکر کرو۔'' اس نے یہ الفاظ کہے اور دھپ دھپ پاؤں اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے ہیڈ کوارٹر اطلاع بھیج دی کہ میں ضعفِ اعصاب کا شکار ہو گیا ہوں اور مجھے دس دن کے لیے اپنے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کیپٹن آئینو ما خود پاگل نہیں تھا کیونکہ اس نے محض اس لیے میرا سر قلم کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ جب میں نے جرنیل کو سیلوٹ کیا تھا، میں چند درجے ٹیڑھا کھڑا تھا؟ جب مجھے یاد آتا کہ جب میں نے کیپٹن آئینو ما کو عام سپاہی میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا تو میں کتنا خوش ہوا تھا، میں ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا۔ خیر، اب میں کیٹ کو اس کے کالر سے نوچ لوں گا!............

اس موقع کی تاک میں کہ وہ کب ٹب میں بیٹھا ہے، میں چوری چھپے غسل خانے میں گھس گیا۔ یہ بات نہیں کہ مجھے غسل خانے میں اس کا خدمتگار بنے رہنے کا کوئی شوق تھا لیکن میں یہ ڈیوٹی اتنے عرصے سے سرانجام دیتا چلا آیا تھا کہ جب میرے دل میں یہ خیال آتا کہ مجھے شاید اس ذمے داری سے سبکدوش کر دیا جائے گا تو کچھ عجیب قسم کی اداسی مجھ پر غالب آ جاتی۔ پہلے میرا یہ معمول ہوتا تھا کہ میں ایندھن کے سوراخ میں سے آواز دیتا، ''جناب، درجہ حرارت ٹھیک ہے؟'' اب جب میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا، مجھے ضمیر کی کسک محسوس ہوئی لیکن میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور اپنی نگاہیں اس کے کوٹ کے کالر پر جما دیں۔

جونہی میں غسل خانے کے اندر داخل ہوا، مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کیپٹن آئینوما مجھے چیخ چیخ کر ڈانٹ رہا ہے اور میں دم دبا کر بھاگ گیا ہوں۔ تاہم جب میں اپنے حواس میں آیا، مجھے احساس ہوا کہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا نشانہ میں نہیں تھا بلکہ وہ تو اپنے معمول کے مطابق کوئی گیت گنگنا رہا ہے۔ جب وہ یہ شعر لہک لہک کر پڑھ رہا تھا، تو ساتھ ساتھ باتھ ٹب کی سطح پر لہریں بھی بناتا جا رہا تھا:

فطرت اور بھی زیادہ ویران ہو گئی ہے
ایک اور میدان جنگ میں لہو کی بو پھیل گئی ہے

اس کی محویت سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس کے کپڑوں سے کیٹ اتاری، اس کی جگہ اپنا نشان چسپاں کیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

میں نے کیپٹن کے کمرے کے دوہرے دروازے کھولے اور ان کے پیچھے دبک گیا۔ پھر میں نے دروازوں کو اسی طرح بند کر دیا جس طرح کہ وہ پہلے تھے۔ اندر میں نے چٹکی بجاتے میں ایک خاص کام کیا اور دم سادھ کر بے چینی سے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے اس کے کاغذی سلائیڈنگ (Sliding) دروازے کی جھری میں سے اس کی شکل دکھائی دی۔ وہ اتنا تیز بھاگا آ رہا تھا کہ اس کا دم پھولنے لگا تھا۔ وہ صرف جانگیا پہنے تھا اور اپنے ہاتھ میں کوٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ دھماکے سے کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی کوٹ ایک طرف پھینک دیا۔ جب میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا، وہ کسی چڑچڑے نابالغ بچے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جب اس کی پشت دروازے سے ٹکرائی، وہ تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور چلا کر کہنے لگا: ''حرام زادے! کیا وہ میری سرکاری وردی کا کوٹ نہیں؟''

میں خاموش رہا۔

میرا اندازہ ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس نے بہرحال ایک مرتبہ مجھے یہی کرنے کا حکم دیا تھا۔ میں چاہتا تو بھی اس کے کالر کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کے جسم پر جانگیے کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔

میں واقعی اس کا سرکاری کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ (ضمناً یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں نے اس کے کالر پر ٹام چسپاں کر دیا تھا۔) اپنی ہئیت دیکھ کر میں خود بھی بھونچکا ہو رہا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس مختصر لمحے کے دوران میں اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا ہے۔ اچانک اس کا جسم خطرناک انداز سے میرے اوپر منڈلانے لگا۔ اس نے میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔

''ذلیل! پاگل کے بچے! تم نے مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔ پاگل کہیں کا! اگر تم جیسے چند اور لوگ یہاں آ جائیں، پھر کوئی بھی افسر امن چین کی نیند نہیں سو سکے گا۔ ساری فوج کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ جب مجھے موقع ملا تھا، مجھے تمہیں جان سے مار ڈالنا چاہیے تھا۔ پتا ہے تم نے کیا کیا ہے؟ ذلیل امریکی!''

میں چپ رہا۔

''ذرا سوچو، تم نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟ تمہیں معلوم ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمہیں معلوم نہیں۔''

میں نے کچھ نہ کہا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری تعلیم و تربیت لبرل ملک میں ہوئی ہے۔ کون جانتا ہے............ تمہارے جیسا کوئی شخص تو جرنیل کے ستاروں میں بھی ادل بدل کر سکتا ہے اور اگر یہ حرکت تم نے کی، میں کبھی میجر نہیں بن سکوں گا!''

اس کے بعد اس نے یہ ناانصافی کی کہ مجھے رسیوں میں باندھا اور اس تنگ کمرے میں مقفل کر دیا جہاں یونٹ کی وردیاں رکھی جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ اس نے مجھے مقید کرنے کے لیے اس قسم کی جگہ کیوں منتخب کی ہے یا یہ کہ وہ مجھے کتنے دن وہاں رکھنا چاہتا ہے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں چپ چاپ کچھ اس طرح اپنے جسم کو دائیں بائیں جنبش دیتا رہا کہ میں بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ پھر میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت تک مجھے شاید ہی کبھی پوری رات سکون کی نیند سونے کا موقع ملا ہو گا لیکن اب جب کہ میں ستاروں کے ڈھیر میں سمٹ مٹا کر بیٹھ چکا تھا، مجھے کسی کوشش کے بغیر نیند آ گئی۔

لیکن ان دنوں جب میں اس زمانے کی یادداشتوں میں کوئی ترتیب پیدا کرنے

کی کوشش کرتا ہوں، مجھے کچھ یوں یاد آتا ہے جیسے میں کسی خاص وقت اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا، کھسکتا کھسکتا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا تھا، کسی شکستہ شیشے سے ان رسیوں کو کاٹ ڈالا تھا جن میں میرا جسم بندھا ہوا تھا، کھڑکی کھول لی اور باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جب میں بچنے کی کوشش میں وہاں بھاگ رہا تھا، میں منہ ہی منہ میں کچھ اس طرح بڑبڑا رہا تھا:

''اگلی صبح چیف آف سٹاف ہیڈ کوارٹر گیا اور تمام افسر اسے سلام عرض کرنے حاضر ہوئے۔ میرے خدایا! ان کی شکل سے نظر آ رہا ہے یہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر کے آئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟ ارے.......... یہ جرنیل تو نہیں، یہ تو کوئی ناپختہ عام سپاہی ہے!، یہ سپاہی یہاں کیوں اینٹھتا پھر رہا ہے؟ لیکن، خیر..........مناسب یہی ہے اس معاملے میں زبان بند ہی رکھی جائے، چنانچہ ہیڈ کوارٹر میں ہر شخص نے اپنی زبان پر تالا لگا لیا۔ دوسرے دن جرنیل نے..........''

فرض کریں میں واقعی دن میں اس طرح کے خواب دیکھتا ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا، پھر اس کا لازماً یہ مطلب ہو گا کہ میں کیپٹن آئینوما کی پیش گوئی کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں گا۔ عین اسی لمحے کسی نے میرے پیچھے چلا کر کہا: ''جاز کی دھن گنگنا رہے ہو؟ ہونہہ؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اتنا زبردست جھانپڑ رسید کیا کہ میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ پھر اس نے مجھے یوں دبوچ لیا کہ میں ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہل سکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ چینی گیت گنگنانا ایک بات ہے لیکن اگر کوئی سپاہی جاز کی دھن گنگنانے کی کوشش کرے تو یہ دوسری بات ہو جاتی ہے۔ میں غصے سے آگ بگولا ہو گیا، حالانکہ جو کچھ میں نے کیا اس کی کوئی توضیح نہیں پیش کی جا سکتی۔ میں نے اپنے حملہ آور کے ہاتھ میں اپنے دانت گاڑ دیئے اور جھٹکے سے اس کا بازو پرے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے بالائی ہونٹ کو کاٹ لیا۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا، مجھے احساس ہوا کہ میرا حملہ آور آئینوما ہے۔

وہ پاگل کی وحشیانہ قوت کے بارے میں چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے اسی حالت میں زمین پر پڑا رہنے دیا، جنونی کیفیت میں تاروں کی باڑ کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور کسی سڑک پر پہنچ گیا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں واقعی سیارے سے

بالکل نیچے آ گرا ہوں۔ میں زمین پر گر پڑا اور رونے لگا: ''آرمی پرائیویٹ سوگی ہارا! تم کہاں ہو؟ مجھے یہاں سے نکال لو!''

جب جنگ ختم ہوگئی، کیپٹن آئینوما نے اعلان کیا ''کوئی وجہ نظر نہیں آتی، آخر جنگی کارروائیاں کیوں بند کر دی جائیں؟'' یقیناً اس میں اتنی پہل کاری تھی کہ وہ اکیلا ہی لڑائی جاری رکھ سکتا تھا۔ اگر کیپٹن ہتھیار اٹھائے رکھنے پر تلا ہوا ہو، پھر میں، جو اس کا اردلی تھا، اس کا ساتھ دینے سے کیسے انکار کر سکتا تھا؟ تاہم کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے بانگِ دہل اعلان کر دیا کہ وہ خودکشی کا ارادہ کر رہا ہے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ چینی کمیونسٹ فوج میں بھرتی ہو رہا ہے اور اس نے مجھے بھی اپنی پیروی کرنے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب آدمی کمیونسٹ فوج میں بھرتی ہوتا ہے، اس کی تین درجے اوپر ترقی ہو جاتی ہے............وہ خود تو کیپٹن سے کرنل اور میں سپاہی سے نان کمشنڈ افسر بن جاؤں گا اس کی دعوت بڑی ترغیب انگیز تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اگر مجھے تین درجے اوپر ترقی مل جاتی تو میں سرخوں کے ساتھ اپنا مقدر وابستہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ شکست کے بعد مجھے جاپانی اور امریکی افواج کے مابین رابطہ قائم کرنے والے محکمے میں بھیج دیا گیا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ اندرونی علاقوں سے جو اطلاعات موصول ہوں، ان کا انگریزی ترجمہ کروں تاکہ انہیں امریکی افواج کو ارسال کیا جا سکے۔ چنانچہ مجھے معلوم تھا کہ بعض دستوں نے چینی قوم پرستوں کی فوج کی شمال کی جانب پیش قدمی کا انتظار کرنے کی بجائے کمیونسٹ فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور انہوں نے یہ حرکت اس لیے کی تھی کیونکہ وہ اس قسم کی ترقیاں حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ جن دستوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تھا، ان کا صفایا کر دیا گیا تھا۔

''آپ واقعی سمجھتے ہیں نان کمشنڈ افسر بن جاؤں گا؟'' میں نے کیپٹن آئینوما سے پوچھا، کیونکہ مجھے فکر کھائے جا رہی تھی کہ کیپٹن تو کرنل بن جائے گا لیکن میں ٹاپتا ہی رہ جاؤں گا اور کبھی عام سپاہی کے درجے سے اوپر نہیں اٹھ سکوں گا۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے اسے میرے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ''اگر انہوں نے تمہیں فی الفور ترقی نہ دی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے۔''

اس مرحلے پر میں دو ستارے پہنا کرتا تھا لیکن اب جب کہ جنگ ختم ہو چکی تھی،

میرے لیے یہ دو ستارے اتنے ہی اہم تھے جتنا کیپٹن کے لیے اس کا اپنا نشان تھا۔ ان (ستاروں) میں میری یادیں، میرے تجربے رچے بسے تھے۔ ان معنوں میں میں شاید ان کی زیادہ قدر کرتا تھا جتنی کیپٹن اپنے ستاروں کی کرتا تھا اور چونکہ وہ میرے لیے اتنے اہم تھے، میرے دل میں عجیب خیال سر اٹھانے لگا کہ میں شاید اس قسم کی زندگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا ہوں جس میں ستارے کردار ادا کرتے ہیں۔

میرا انگریزی کے ساتھ جو دوبارہ رابطہ قائم ہوا، اس کے لیے کیپٹن آئینوما براہ راست ذمے دار تھا۔ ایک روز اس نے غصے سے دہاڑتے ہوئے مجھ سے کہا: ''آج سے تمھیں اپنی ساری انگریزی یاد کرنا ہوگی۔ سمجھے؟ تمھیں خواہ کتنا ہی تردد کرنا پڑے، تمھیں اس کا ایک ایک لفظ اپنے حافظے میں محفوظ رکھنا ہوگا۔ اگر آدمی ارادہ کر لے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''جناب! مجھے اسے یاد کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟'' آخر یہ کیپٹن آئینوما ہی تو تھا جو دن رات میرے ذہن میں بٹھاتا رہتا تھا کہ مجھے اپنے امریکی تجربے کی ایک ایک نشانی اپنے دماغ سے کھرچنا ہوگی۔ اب یہ نیا حکم اسی آئینوما سے ملا تھا جس نے محض چند روز پیشتر دشمن کے خلاف اکیلے ہی ڈٹ جانے کا ارادہ باندھا تھا، پھر وہ خودکشی کا اعلان کرنے لگا تھا اور شاید اب بھی فوج سے مفرور ہونے کے امکان پر غور و فکر کر رہا تھا۔

ترجمان اور مترجم کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ میرے ذمے یہ عظیم فریضہ بھی لگا دیا گیا کہ جو افسر انگریزی میں گفتگو کرنے کے شائق ہیں، میں انہیں پڑھایا کروں۔ مجھے کیپٹن آئینوما کی طرف سے حکم ملا کہ اس پر فضیلت کام کی انجام دہی کے دوران میں مجھے وردی پہننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر مجھے وردی نہ پہننا پڑے، پھر میں بہت خوش رہوں گا۔ لیکن اس حکم پر مجھے جو تذلیل محسوس ہوئی، اس کی شدت اس سے کہیں زیادہ تھی جو مجھے ناتجربہ کار سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہونے پر ہوئی تھی۔ مجھے توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ کیپٹن آئینوما میری تذلیل سمجھ سکتا ہے۔ وہ (مثلاً چیف آف سٹاف) تو بے شک اپنی وردیاں پہنتے پھریں، لیکن مجھ سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ میں سویلین لباس پہنوں۔ اگر وہ مجھے اپنے کالر پر دو ستارے چسپاں کرنے کی اجازت دیتے، پھر شرمندگی کا بار ان کے ستاروں کو اٹھانا پڑتا۔ پھر پوچھنے کی یہ بات بھی تھی: آخر وہ انگریزی کیوں سیکھنا چاہتے ہیں؟...... حالانکہ یہ وہ زبان تھی جو میرا جیسا شخص بھی محسوس کرتا تھا کہ اس کا بھلا دینا ہی

بہتر ہے۔

جب کیپٹن آئینوما نے ایک مرتبہ انگریزی پڑھنا شروع کر دی، اس نے کمیونسٹ فوج میں بھرتی ہونے کا منصوبہ طاق نسیاں پر رکھ دیا۔

بہرحال انہوں نے مجھے سویلین سوٹ پہنا دیا۔ وہ مجھے مسلسل کئی کئی گھنٹے بٹھائے رکھتے اور یہ سلسلہ کئی کئی دن چلتا رہتا۔ اپنی کھڑکی سے میں جرنیلوں، کرنیلوں، کپتانوں اور لیفٹیننٹوں کو قطار بنائے خیابان کے کنارے کنارے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف جاتے اور کانفرنس روم میں داخل ہوتے دیکھتا رہتا۔ ان سب کے ہاتھوں میں کتابچے یا اوراق ہوتے تھے جو میں ان کے لیے چھپواتا رہتا تھا۔ وہ اب بھی اپنی تلواریں پہنے رہتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں کیپٹن آئینوما مجھے کانفرنس روم میں لے جانے کے لیے پہنچ جاتا۔ مجھے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کوئی قیدی ہوں جسے وہ اپنی نگرانی میں کہیں لے جا رہا ہے۔ فوجی ملازمت کے چار سالوں کے دوران میں پہلی بار میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہونے لگیں۔

''میں سپاہی سوگی ہارا جو جی ہوں۔ آپ کو انگریزی زبان میں گفتگو کرنا سکھانا میرے لیے بڑا اعزاز ہے۔''

تاہم کلاس کے اختتام پر کیپٹن آئینوما مجھے ایک طرف لے گیا اور جس انداز سے میں نے اپنا تعارف کرایا تھا، اس میں مین میکھ نکالنے لگا۔ ''یہ تم نے سپاہی کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟ تمہیں صرف اتنا بتانے پر اکتفا کرنا چاہیے کہ تمہارے باپ نے تمہارا کیا نام رکھا تھا............ یعنی سوگی ہارا جو جی اور سچ پوچھو تو صرف جو جی ہی کافی ہے۔''

مگر جب میں نے سوچا کہ ایک طرف تو بعض دستے ریڈیو کے ذریعے پیغام بھیج رہے ہیں کہ وہ سرخ فوج کے گھیرے میں آ چکے ہیں اور دوسری طرف یہ ستاروں سے مزین جرنیل، جن کے ہاتھوں میں شمالی چین میں ہزاروں سپاہیوں کا مقدر ہے، میرے سامنے عہدوں کے نشانوں کے فرشی نمونوں کی طرح بیٹھے ہیں، تو ناقابل برداشت اداسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

کیپٹن آئینوما کی مشاورت سے (بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ جاپانی متن اسی نے تحریر کیا تھا) میں نے مندرجہ ذیل باتیں انگریزی میں چھپوا دیں:

.... ہفتے کے ایام، مہینوں کے نام، فوجی عہدے، ہتھیاروں کے نام۔

............''تم امریکی سپاہی ہو، ٹھیک؟ میں جاپانی فوج کا کیپٹن آئینوما گوروکو ہوں۔''

............''یہ صحیح نہیں ہے۔ میں اسے نہیں مان سکتا۔''

............''یہ تم نے کس سے سنا؟''

............''خوش آمدید۔ میرے لائق خدمت؟''

............''میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

............''ہماری سپاہ بہت بہادر تھی۔ آپ کی بھی بہت بہادر تھیں۔ سارا قصور میرا ہے۔''

............''فلاں فلاں قصور وار ہے۔''

............''فلاں دستے کے اتنے سپاہی فلاں پوزیشن پر ڈٹے رہے۔''

............''ہمارے پاس رسد ہے۔'' ''ہمارے پاس رسد نہیں۔''

............''آپ چاول کی شراب پینا پسند فرمائیں گے؟''

............''آپ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

............''میں جنگی قیدی جرائم کا مجرم نہیں۔''

اس وقت مجھے صرف یہی جملے یاد آ سکے ہیں۔ میں ان سے یہ فقرے بار بار کہلواتا تھا اور ان کا تلفظ درست کرتا تھا لیکن آپ ایسے لوگوں سے صحیح تلفظ کی توقع نہیں کر سکتے جنہیں ہر بات افسرانہ لہجے سے چلا کر کہنے کی عادت پڑ چکی ہو۔ میں ان کے ساتھ فرداً فرداً کام کرتا تھا (یہ بھی کیپٹن آئینوما کے حکم پر) اور ان کے نام او عہدے انگریزی میں پکار کر انہیں انگریزی جملے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن چیف آف سٹاف کی خواہ جان چلی جاتی، اس سے فوجی عہدوں کے انگریزی مترادفات یاد ہوتے ہی نہیں تھے۔

کیپٹن آئینوما رونی صورت بنا کر کہتا: ''میں کسی کو بھی گرامر میں اپنے سے آگے نہیں نکلنے دوں گا۔'' اور وہ اس ضمن میں کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت کہیں زیادہ محنت کرتا تھا۔ جہاں تک زبان میں مہارت کا تعلق ہے، وہ واقعی سب پر سبقت لے گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں ٹائپ رائٹر رکھ لیا جو اس نے کئی سال پہلے کسی امریکی تاجر سے ہتھیا لیا تھا۔ وہ مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں اسے سمجھاؤں کہ یہ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ وہ ٹائپ رائٹر

کی کلید پر بھدے انداز سے انگلیاں مارتا رہتا تھا۔ چہ خوب! ان سب باتوں کے باوجود جونہی کلاس روم سے محض ایک قدم باہر دھرتا، وہ فوجی قواعد کا سختی سے پابند ہو جاتا۔ اگرچہ وہ میرا طالب علم بن چکا تھا، وہ میرا قطعاً لحاظ نہیں کرتا تھا اور مجھ سے یہی توقع کرتا رہتا تھا کہ میں سیلوٹ کرتا رہوں۔ جب کبھی میں پس و پیش کرتا، وہ میرے سینے پر انگلی رکھتا اور مجھے ڈانٹ پلانے لگتا۔ مجھے صرف اسی وقت صاف صاف بات کہنے کا شوق چراتا، جب میں باہر گھومنے پھرنے کے کپڑوں میں ملبوس ہوتا اور صرف اس محدود مدت کے دوران میں اس پر میرے ڈسپلن کا خیال رکھنے کا دورہ نہ پڑتا۔ کلاس روم میں اس کا وقت ان باتوں کو ہضم کرنے میں صرف ہوتا جو میں انہیں بتا سکتا تھا۔

ہم سب کو اکٹھے ایک ایک درجہ اوپر ترقی مل گئی۔ بالکل بھاگتے چوروں کی طرح۔ جب آدمی اس کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے ذہن میں اس کی صرف ایک ہی توجیہ آ سکتی ہے۔ ہائی کمان نے یہ کام غالباً اس لیے کیا تھا کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ ہم چینی فوج کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکیں گے اور الماریوں میں جو نشان پڑے ہیں، وہ ضبط ہو جائیں گے۔ میں ''پوسڈیم'' پرائیویٹ فرسٹ کلاس بن گیا۔ اب بھی اس نام سے ایک خاص نوع کی مردم بیزاری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ہمیں یہ اقدام اس لیے سنکی نظر آتا تھا کیونکہ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کے زمانے میں ترقیوں کے پیچھے کون سا احمقانہ محرک کام کر رہا ہے۔ ہم ان ترقیوں پر خوش ہوئے تھے حالانکہ ہم اس ریاکارانہ فعل کی نوعیت خوب سمجھتے تھے۔ کیپٹن آئینوما میجر آئینوما بن گیا۔ اس نے اپنا نشان خود ہی تبدیل کیا۔ مجھے اس کے اردلی کے فرائض انجام دینے کی ذمے داری سے فارغ کر دیا گیا تھا لیکن باقی سب کچھ ویسے کا ویسے ہی تھا۔ میجر آئینوما اور پرائیویٹ فرسٹ کلاس سوگی ہارا کو آپس میں ننھی کرنے سے زیادہ کڈھب بات اور کوئی نہ ہوتی۔

جب میں اپنی ترقی کی خبر دینے آئینوما کے کمرے میں گیا، اس نے کہا: ''یہ ہم دونوں کے لیے بہت اچھی خبر ہے۔'' اور پھر مجھ سے پوچھنے لگا: ''کیا تم میرے لیے کوئی ملازمت تلاش کر سکتے ہو؟ یا پھر اتنا ہی کرو کہ امریکا میں اپنے باپ کے فارم پر مجھے زرعی مزدور ہی رکھوا دو............ بشرطیکہ حکومت نے ضبط نہ کر لیا ہو۔''

''جناب! خدا کے لیے مجھ سے اس قسم کا مطالبہ نہ کریں۔ میں آپ کو ہمیشہ میجر ہی سمجھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میرے باپ کے فارم پر مزدور بن گئے، مجھے ہمیشہ خفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''تمہارے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں؟ اگر ممکن ہوا، تو میں یقیناً موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے کو ترجیح دوں گا۔ بہت اچھا، میں تم سے مدد نہیں مانگوں گا۔ پرائیویٹ سوگی ہارا! میری کافی تذلیل ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے مجھے خودکشی ہی کر لینی چاہیے تھی۔ جو جی، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

میجر آئینوما نے یہ کہا اور ہتھیلی سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔

پیکنگ کے وسیع و عریض آسمان سے دھوپ درختوں کے بیچ سے چھن چھن کر آ رہی اور میجر کے پلاٹینم کے ستاروں کو جھلملا رہی تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ایک چیز............ کرسمس کے درخت پر ستارے اور گھنٹیاں............ یاد آ گئی جو میں مدت ہوئی، بھول چکا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کہیں سے ''کرسمس مبارک'' کی صدائیں آ رہی ہوں۔'' کیسا عجیب تلازم خیال ہے!'' میں نے سوچا۔

اس جذباتی منظر کے باوجود میجر کو بعد میں جب بھی موقع ملتا، وہ میری منت سماجت کرنے سے نہ چوکتا۔ جب اگلے سال کے آغاز میں ہم جاپان جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہوئے، تو اس کی التجاؤں میں مزید شدت آ گئی۔

میں نے شروع میں جس یونٹ میں خدمات سرانجام دی تھیں، وہ شانسی صوبے میں چینی کمیونسٹ فوج کی ایک ڈویژن سے مل گئی تھی اور ایک مشہور چینی جرنیل کے زیر کمان آ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چین سے روانگی کا وقت آیا، مجھے اور میجر آئینوما کو کسی بالکل ہی مختلف رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ جس جہاز میں ہم نے سفر کرنا تھا، وہ باربرداری کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس پر ٹینک لدے ہوئے تھے۔ یہ ٹینک عرشے کے نیچے سامان خانے میں رکھے ہوئے تھے اور وہیں ہم ایک ہزار اشخاص کو بھر دیا گیا تھا۔ ہم جہاز کے اگلے حصے میں تھے۔ بوائلر ہم سے خاصا دور تھا۔ چنانچہ جب سمندر کی متلاطم موجیں جہاز سے ٹکراتیں، ان کی پرشور آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ جاتیں اور اس کے ساتھ ہی پانی

کا تقریباً اتنا بڑا ریلا ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا جو جہاز کو ڈبونے کے لیے کافی ہوسکتا تھا۔ میں ترجمان اور ایک قسم کا غیر سرکاری افسر تھا، لیکن اب جبکہ میں افسروں کے کمروں سے دور جہاز کے سامان خانے میں دبکا پڑا تھا، مجھے یہ ماننے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی کہ یہ ایک ہزار آدمی، جو جگہ کی قلت کے باعث اپنے اپنے سفری تھیلوں کے آس پاس ٹانگیں سینوں سے لگائے لیٹے ہوئے ہیں، شکست کھانے کے بعد واپس جاپان بھیجے جا رہے ہیں۔ میں اس خیال سے اپنے آپ کو فریب دے رہا تھا کہ ہم جاپان جنگ کرنے جا رہے ہیں۔ ہماری روانگی سے پہلے ان اشخاص نے، جو عہدوں کے نشانوں کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں، وردوں کے کمرے سے بہترین نمونے اٹھا لیے اور اپنے کالروں پر چسپاں کر لیے تھے۔ یہ بالکل فطری رویہ تھا کیونکہ جو کچھ پیچھے رہ جانا تھا، وہ بالآخر چینیوں کے قبضے میں چلا جانا تھا۔

ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی شخص بھی اپنی وردی اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

ہر شخص اپنا نشان پہن کر اپنے آبائی شہر لوٹنا چاہتا تھا۔

ان باتوں کا مطلب کیا تھا؟

وہ جن رویوں کا اظہار کر رہے تھے، اسے دیکھ کر آدمی کے دل میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہوتے تھے اور ان سے گھن بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔ تاہم ان سے الگ تھلگ نہیں تھا، میرے بھی وہی جذبات تھے جو ان کے تھے۔ میں بھی جاپان اور پھر امریکا میں اپنے والدین کے گھر وردی پہن کر ہی جانا چاہتا تھا۔

جب میں ان خیالات میں مستغرق تھا، کسی شخص نے میری بائیں آستین کو جھٹکے سے کھینچ لیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میرے سامنے ایک انتہائی دبلا پتلا ناٹا شخص کھڑا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت نام کو بھی نہیں تھا اور اس کے کالر پر کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ ''میرے ساتھ آئیں، میں آپ سے ایک منٹ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ جونہی میری نظر اس کے چہرے پر پڑی، مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے ہکیدا یاد آ گیا تھا۔ ویسے وہ ہکیدا نہیں تھا۔ ہکیدا ایک ایسا سپاہی تھا جس کی اپنی کوئی یونٹ نہیں تھی۔ اس کا غالباً سارے جنوب مشرقی ایشیا میں ایک ڈویژن سے دوسرے ڈویژن میں تبادلہ ہوتا رہا ہوگا اور اسی طرح وہ کہیں مرکھپ گیا ہوگا۔ بہرحال وہ آدمی تھا ہی

اس قسم کا کہ اسے دیکھتے ہی خواہ مخواہ اس کی پٹائی کرنے کو جی للچانے لگتا تھا اور تو اور، خود خدا نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر شروع میں میرے دل میں جو یہ خیال آیا تھا کہ اس کی شکل ہکیدا سے ملتی جلتی ہے تو اس کی وجہ اس کا سانولا اور قدرے احمقانہ چہرہ تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے عرشے پر چلا گیا۔ وہاں وہ ایسے پرزور لہجے سے باتیں کرنے لگا جس کی اس کے جسمانی ڈھانچے سے کوئی مطابقت نہیں تھی۔

''آپ ترجمان ہیں نا؟''

''بالکل ہوں۔''

''دیکھیں، جہاز پر جتنے افسر ہیں، ہم ان کی پٹائی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں جب ہم اس کام میں مصروف ہوں، کوئی امریکی سپاہی یا افسر ادھر نہ آنے پائے۔ آپ کو صرف اتنا کرنا ہوگا یا تو ہمیں ان سے اس کی اجازت دلوا دیں یا پھر انہیں باتوں میں مشغول رکھیں۔''

''تم بندرگاہ پر جہاز کے پہنچنے اور اپنے وہاں اترنے تک انتظار کیوں نہیں کر لیتے؟''

''ہم نے یہ کام اسی عرصے کے دوران کرنا ہے جب وہ ستارے پہنے ہوئے ہوں۔ اگر ہم نے وطن پہنچ کر لیا، پھر کوئی مزہ نہیں آئے گا۔ آپ کو کیا معلوم ہم کیا محسوس کرتے ہیں، آپ نے بھی تو ستارے پہن رکھے ہیں۔''

''اگر تم لوگوں نے ڈسپلن میں گڑبڑ کی، ہم سب گھاٹے میں رہیں گے۔''

''جب ہم جاپان پہنچ جائیں گے، ہر شخص کو اپنے گھر جانے کی جلدی ہوگی اور کوئی شخص بھی انہیں مارنے پیٹنے کو تیار نہیں ہوگا۔''

''اس میں خرابی کیا ہے؟''

وہ اتنا جھنجھلایا ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے مزید مزاحمت کی تو یہ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دے گا۔ چنانچہ میں نے اس کی ناز برداری کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے بتایا: ''میں ابھی ٹرانسپورٹ رجمنٹ کے سٹاف سارجنٹ کے پاس جاتا ہوں۔''

میں نے ابھی اس سمت میں ایک دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ اس نے عجیب

وغریب انداز سے قہقہہ لگایا۔

میں نے ابھی اس سمت میں ایک دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ اس نے عجیب وغریب انداز سے قہقہہ لگایا۔

میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ شخص قید خانے کے گارڈ کی حیثیت سے فرائض سر انجام دیتا یا اس قسم کا کوئی دوسرا کام کرتا رہا ہو گا، جبھی تو وہ اپنے کالر پر ستارہ چسپاں کرنے کے اعزاز سے محروم رہا ہو گا اور یوں اس کے دل میں استحقاق کی علامتوں کے خلاف بغض وعناد پیدا ہو گیا ہو گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے افسروں کی پٹائی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، یہ ان کا سرغنہ ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جہاز پر جو سپاہی سوار ہیں، وہ سب کے سب اس کے بھرے میں آ گئے ہوں گے اور جو کچھ یہ چاہتا ہے، اسے کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو گئے ہوں گے۔ تاہم یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان حالات میں کیا واقعات کیا رخ اختیار کریں گے۔

امریکی سارجنٹ اپنے کمرے میں ڈیسک پر پاؤں ٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے میرے ساتھ گپ شپ کرنے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کیلی فورنیا کے قصبے فریزنو (Fresno) میں دس سال گزار چکا ہوں تو اس کا رویہ ناقابل یقین حد تک دوستانہ ہو گیا۔ شروع میں تو مجھے اس کی صحبت میں خاصا اطمینان رہا لیکن پھر اس نے ایک جانب سر جھکایا اور کہا: ''ایک آدمی کے پاس کالج کی ڈگری ہے مگر وہ فوج میں محض عام سپاہی ہے! کتنی عجیب بات ہے!'' وہ میرے ساتھ کچھ اس قسم کا برتاؤ کر رہا تھا جیسے میں جاپانی فوج کا نہیں، امریکی فوج کا رکن ہوں۔ تاہم زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کی آنکھوں سے صاف جھلکنے لگا کہ وہ بھی مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ یوں کہنے کو میں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا کہ یہ شخص بھی عہدوں کے نظام میں جکڑا ہوا ہے۔

''جارجی! اگر میں تم سے کہوں کہ اپنا پرائیویٹ فرسٹ کلاس نشان مجھے دے دو، تم برا تو نہیں مانو گے؟ میں اسے اپنے وطن لے جانا چاہتا ہوں۔''

''مسٹر براؤن! پرائیویٹ فرسٹ کلاس کے ستارے آپ کے کس کام آئیں گے؟ جہاز کے سامنے خانے میں ڈھیروں پڑے ہیں، جتنے چاہیں، اٹھا لیں۔''

''نہیں، مجھے تمہارے چاہئیں۔''

میں نے اس کی درخواست نظر انداز کر دی۔ ''سنئے، آپ مجھ پر اتنی مہربانی فرما سکتے ہیں کہ میرے والدین کو اطلاع بھجوا دیں کہ میں خیرت سے ہوں؟''

جب میں اپنے والدین کا پتہ لکھ رہا تھا، اس کی حریصانہ نگاہیں میرے کالر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور جب میں نے اسے سپاہیوں کی افسروں کی پٹائی کرنے کے منصوبے کے متعلق بتایا، وہ مجھ پر یوں برسنے لگا جیسے اس کام کی شہہ دینے والا میں ہی تو ہوں۔

''افسر افسر ہی ہوتا ہے، سوگی ہارا! اس حرکت کی قطعاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔''

اسے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ اگر جاپانی سپاہیوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا، تو ان کا ڈسپلن بالکل غارت ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے سے یہ بھی عیاں ہو رہا تھا کہ اسے جذباتی طور پر یہ سازش قطعاً ناپسند ہے۔ وہ مجھے گھسیٹنے اور تحکمانہ انداز سے پوچھنے لگا: ''بتاؤ، کون ہے وہ سپاہی جس نے تم سے بات کی تھی؟'' اس کے رویے سے میں بہت مایوس ہوا۔

سٹاف سارجنٹ براؤن میرے پیچھے چھپ گیا۔ جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ قصور وار شخص کون ہے تو اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں جیسے اسے اس بات پر بہت مایوسی ہوئی کہ اس کا نشانہ اتنا نحیف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور بولا کہ میں اس سپاہی کو رشوت کے طور پر چند سگریٹ، چاکلیٹ اور چیونگم دے دوں اور تھوڑی سی ڈانٹ بھی پلا دوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اسے تنبیہ کرنے کو کہا کہ کوئی چیز جہاز پر نہیں کھائی جائے گی، البتہ سگریٹ بیت الخلا میں پئے جا سکتے ہیں۔

میں نے سارجنٹ براؤن کی ہدایت پر عمل کیا اور سپاہی کو بتایا: ''اگر تم نے احتیاط نہ برتی، تم کبھی جاپان واپس نہیں پہنچ پاؤ گے۔'' اس نے وہ اشیا تو پکڑ لیں لیکن جواب کوئی نہ دیا۔ عرشے پر جلد بازی میں ناک سا بیت الخلا بنا دیا گیا تھا۔ (ذرا سی تیز ہوا چلتی تو یہ ڈگمگانے اور خطرناک انداز سے سمندر کی جانب جھکنے لگتا تھا۔) اس سے اب لیونڈر کی خوشبو کا دھواں اٹھنے لگا جسے ہوا آسمان کی جانب اچھالتی رہتی۔ بیت الخلا کی چھت نہیں تھی اور اس کو استعمال کرنے والوں کی اس کے سامنے قطار لگی رہتی تھی، چنانچہ ممکن ہے کہ وہ اپنے

سگریٹ نیچے سامان خانے میں بھی پیتا رہتا ہو۔ میں نے درحقیقت اسے ڈانٹ تو ضرور پلائی تھی لیکن دل ہی دل میں یہ توقع باندھ رہا تھا کہ وہ نیچے سامان خانے میں کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت ضرور کرے گا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے جاپان پہنچنے اور منتشر ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ لازماً ہو کر رہے گا۔ اس کے علاوہ میری شاید یہ آرزو بھی رہی ہو گی کہ یہ سپاہی کوئی فساد کرے جس کی سزا مجھے ملے اور یوں میں اس سلوک کی، جو میں نے ہکیدا سے کیا تھا، تلافی کر سکوں گا۔

یہ رجمنٹ، جسے ادھر ادھر کے سپاہیوں کو اکٹھا کر کے تشکیل دیا گیا تھا، میجر آئینوما کے زیر کمان تھی، تاہم میں اس کا سامنا کرنے سے بچنے کی کوشش میں زیادہ تر سامان خانے ہی میں بیٹھا یا لیٹا رہتا لیکن وہ آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ ہر جگہ مجھے ڈھونڈتا رہا، آخر کار اس نے مجھے پکڑ ہی لیا۔ اس کی زبانی مجھے یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ وہ اس بات پر بے حد خوش ہے کہ جہاز جاپان پہنچنا ہی چاہتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ میرے عزیز و اقارب سے ملنے آئے گا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے اپنے لیے ملازمت تلاش کرنے کی درخواست کی۔ مجھے امید تھی کہ ہم دونوں کے مابین عنقریب کچھ نہ کچھ............ جس کا ملازمت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا............ ہو کر رہے گا۔ مگر جب میں نے نگاہ اٹھا کر میجر کی طرف دیکھا، میں بہت مغموم ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی چیز کا شبہ تک نہیں۔

میں ایک اور سپاہی کے ساتھ نتھی ہو گیا اور اس سے اس شخص کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا جس کی شکل ہکیدا سے ملتی جلتی تھی۔ ''وہ؟ وہ تو پاگل ہے۔ تمہیں معلوم نہیں تھا؟'' اس نے جواب دیا۔ وہ انگشت شہادت سے اپنا سر کھجانے لگا۔ ''اسے محض اس لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ اسے مقفل کرنے کے لیے کوئی کمرا نہیں۔'' اس کی باتیں سن کر میں بہت پژمردہ ہو گیا اور اسی عالم میں اسی پاگل کی تلاش میں عرشے پر چڑھ گیا۔ وہ ابھی تک بیت الخلا میں آرام سے سگریٹ کے کش لگا رہا اور اس کا دھواں فضا میں بکھیر رہا تھا۔ دوسرے سپاہی نے اس کے متعلق جو کچھ کہا تھا، اسے دیکھ کر اس کی تصدیق ہو گئی۔ اس کی ٹوپ کی پشت پر سرخ کپڑے کی کترن سلی ہوئی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ شخص ذہنی مریض ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی اس کا ستارہ ہو گا۔ اب جب کہ مجھے خبردار کر دیا گیا تھا، میں نے دھیان سے دیکھا۔ اس شخص کی آنکھوں کی پتلیاں واقعی بے قاعدہ انداز سے

حرکت کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا اگر یہ شخص پاگل ہے، پھر جن لوگوں کو ہوش مند تصور کیا جاتا ہے، میرے دل میں ان کے لیے حقارت کے سوا کچھ نہیں۔

دوسرے روز کی صبح جب ہم صرف دلیے پر مشتمل اپنا روز کا راشن ختم کر چکے اور ہمت ہار کر اپنے تھیلوں پر لیٹ چکے تھے، پانچ چھ امریکی فوجی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ٹہلتے ادھر آ نکلے۔ ان میں سے چند ایک منہ سے سیٹیاں بجا رہے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ بظاہر خوش باش لوگوں کا گروہ دکھائی دے رہا تھا لیکن ان کی نظروں سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ کسی مار پر آئے ہیں، چنانچہ جاپانی سپاہی انہیں بغور دیکھنے لگے۔ پھر وہ بٹ گئے اور بیٹھے ہوئے جاپانیوں کے مابین چلنے لگے۔ ان کے قدم کہاں پڑتے ہیں، اس کی انہیں قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ چنانچہ کبھی ان کے پاؤں کسی کے گھٹنے سے اور کبھی کسی کے ٹخنے سے جا ٹکراتے۔ کوئی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ ان کی نظریں جاپانی سپاہیوں کی گردنوں پر جمی ہوئی ہیں۔ بات عجیب معلوم ہوتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے ایک امریکی فوجی نے اس سارجنٹ کے کالر پر جھپٹا مارا جو میرے قریب بیٹھا ہوا تھا اور اس کا نشان نوچ لیا۔ اس کے بعد اس نے میرے اوپر سے قدم بڑھایا اور جو سارجنٹ میرے پیچھے بیٹھا تھا، اس کے ستارے اتار لیے۔ تب وہ واپس مڑا اور اس سٹاف سارجنٹ کے سامنے رک گیا جو میرے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں جو ستارے پکڑ رکھے تھے، اس نے ان کا آپس میں موازنہ کیا اور پھر اس نے وہ تارے، جو اس نے پہلے سارجنٹ سے چھینے تھے، یوں فرش پر پٹخ دیئے جیسے وہ اڈی کھڈا کھیل رہا ہو۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم انگریزی بول لیتے ہو؟ واہ! ہم یہ اشیا بطور نشانی لے جا رہے ہیں۔ ہم اوکی ناوا سے لانا بھول گئے تھے۔''

''وطن واپس بھیجے جانے والوں کے ستارے ہمیشہ اسی طرح چھین لیے جاتے ہیں؟''

''یہ میرا پہلا سفر ہے۔ مجھے معلوم نہیں باقی کیا کرتے ہیں۔''

''آپ کو ستارے ضبط کرنے کی اجازت سارجنٹ براؤن نے دی ہے؟''

''دوسروں کی نسبت وہ کہیں زیادہ ان کے شوقین ہیں۔''

''اگر اس پر ہمارے آدمیوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا، پھر کیا ہوگا؟''

''یہ!'' وہ یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ مشین چلایا ہی چاہتا ہو۔

اس تجربے سے مجھے یہ سبق ملا کہ عہدوں کے نشانات اسی طرح جنگ کی نشانیوں کے طور پر چھین لیے جاتے ہیں، جس طرح پرانے زمانوں میں مالِ غنیمت کے طور پر دشمنوں کے سر اور کان کاٹ لیے جاتے تھے۔

امریکی فوجیوں کے اس گروہ نے تقریباً تمام نان کمشنڈ افسروں کے ستارے چھین لیے اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرنے لگے۔ جب یہ واردات ہو رہی تھی، میری نظر چند جاپانیوں پر پڑی۔ کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ ان کے ستارے نہیں، بلکہ ان کا تشخص ان سے چھین لیا گیا ہے۔ مجھ میں اس تذلیل کا مظاہرہ دیکھنے کی مزید تاب نہ رہی۔ تالیاں بجاتے، نعرے لگاتے اور ہر طرح کا شوروغل مچاتے امریکی فوجیوں نے راہداری میں بے شمار ستارے متعدد قطاروں میں سجا دیئے۔

آخر کار وہ فاتحانہ انداز سے واپس چلے گئے۔ شاید وہ یہ ارادہ کر کے گئے تھے کہ اب وہ افسروں کے کمروں پر ہلہ بولیں گے۔ سامان خانہ آہ سے ملتی جلتی چیز سے بھر گیا۔ اس کے یہاں وہاں ستاروں کے وردیوں سے اکھاڑے جانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن اب سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے جو ستارے اکھیڑے ہیں، ان کا وہ کریں کیا۔ پھر ایک شخص نے اپنا ستارہ فضا میں اچھال دیا اور دوسرے اس کی نقالی کرنے لگے۔ بعض تو اپنے ستارے اچھالنے کے دوران میں زیرلب ہنستے بھی رہے۔ میں نے اپنی نگاہیں پاگل سپاہی پر جمائے رکھیں، مگر وہ اپنی پشت کے بل نیچے گر گیا اور ہونقوں کی طرح گھور گھور کر چھت کو دیکھنے لگا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کاہلی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کے پاس کوئی ستارہ نہیں تھا۔

یہ تماشا اب میری برداشت سے بالکل ہی باہر ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں اٹھا اور گلا پھاڑ کر کہنے لگا: ''آپ لوگوں کو اپنے ستارے نوچنا نہیں چاہئیں۔ یہ بیش بہا ہیں! اب بس کرو!'' میں نے اپنے الفاظ بار بار دہرائے تا آنکہ ان اشخاص نے، جو میرے آس پاس تھے، اپنے ستارے پھینکنا بند کر دیئے اور میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ''یہ حرامی کون ہے؟ اس کا ستارہ میں نوچتا ہوں!'' وہ پوری قوت سے آگے بڑھا۔ اس نے جھپٹ کر میرے تینوں ستاروں کو کھینچا، انہیں اپنے بوٹوں تلے مسلا اور مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

میں اوپر عرشے پر لپا گیا جو بے طرح جھول رہا تھا۔ آئینوما وہاں کھڑا تھا۔ اس کے ستارے بھی چھن چکے تھے لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔

''جارج۔ براؤن میرا تھیلا اور بوٹ بھی لے گیا۔''

جاپانی بوٹوں کی جگہ اس نے امریکی فوج کے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس کے پاؤں تو عام جسامت کے پاؤں سے بڑے ہیں۔

............آئینوما اور دوسرے جاپانی فوجی نئے ستارے تلاش کر رہے تھے۔

اپنا اگلا حصہ ایک طرف جھکاتے اور وسل بجاتے ہمارا جہاز سے بو کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا۔ صبح کی دھند میں پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ ان کی رنگت اتنی جانی پہچانی تھی کہ مجھ پر ان کی شناخت کرنے کا جنون طاری ہو گیا۔ میں عرشے پر ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ میں لوگوں سے پوچھنا چاہتا تھا: ''یہ رنگ کون سا ہے؟'' پھر میں جہاں تھا، میرے قدم وہیں رک گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ پہاڑوں کی رنگت تو وہی خاکی ہے جو میری وردی کی ہے جس میں میں ملبوس ہوں۔

حواشی

(1) پرائیویٹ: بعض ممالک میں ادنیٰ ترین درجے کے سپاہی کو ''پرائیویٹ'' کہا جاتا ہے۔

(2) پنچ بیگ (Punch-bag): پنچ بیگ چمڑے یا کینوس کا تھیلا ہوتا ہے۔ اس میں ہوا بھر کر کسی چیز سے لٹکا لیا جاتا ہے اور باکسر اس پر مکے بازی کی مشق کرتے ہیں۔ امریکی انگریزی میں اسے Punching Bag کہا جاتا ہے۔

شونو جن زو

ساکن زندگی

شونو جن زو (Shono junzo) 1921ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مدرس کے تیسرے بیٹے تھے۔ وہ ابھی اوساکا کے غیر ملکی زبانوں کے ارادے باندھنے لگے۔ تاہم ابھی ان کی چند نگارشات ہی منظر عام پر آئی تھیں کہ جنگ عظیم دوم میں شدت آ گئی اور حکام نے انہیں فوج میں بھرتی کرنے کے جس فیصلے کو معرضِ تعویق میں ڈال رکھا تھا، اسے واپس لے لیا اور انہیں محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔

جونہی جنگ ختم ہوئی، شونو نے اوساکا کے ایک سکول میں ملازمت اختیار کر لی اور اس کے ساتھ ہی ان کا اشہبِ قلم بھی دوبارہ رواں ہو گیا۔ اگلے چند سالوں کے دوران میں ان کی کہانیاں اپنے علاقے کے متعدد ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ 1949ء میں ان کی کہانی ''پیار کی تھپکی'' اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ اتنی خوبصورت کہانی تھی کہ بڑے بڑے جغادری ادیب بھی اسکی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس میں ایک ایسی خانہ دار خاتون کی زندگی بیان کی گئی ہے جس کی اپنے شوہر کے متعلق خوش فہمیاں بتدریج ختم ہونے لگی ہیں اور اسے مایوسی اور خالی پن کا تجربہ ہونے لگا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس انداز کی پے در پے کئی کہانیاں تخلیق کیں۔ ان سب کہانیوں میں ان شادی شدہ جوڑوں کے جذباتی اور نفسیاتی تلاطموں کو بے رحمی سے بیان کیا گیا ہے جنہیں متعدد ازدواجی اور مالی مسائل کا سامنا ہے ان میں سے ایک کہانی کو 1953ء میں آکو تاگاوا انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

شونو، سکول کی ملازمت پہلے ہی چھوڑ چکے تھے اور ایک براڈ کاسٹنگ کمپنی میں کام کرنے لگے تھے۔ آکو ناگاوا انعام ملنے کے بعد ان کا ادبی کیریئر بن گیا اور یوں انہوں نے براڈ کاسٹنگ کمپنی کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔

اس مجموعے میں شامل ان کی کہانی ''ساکن زندگی'' 1960ء میں شائع ہوئی اور اس پر

انہیں شن چوشا ادبی انعام ملا۔ دراصل یہ کہانی ان متعدد کہانیوں کے سلسلے کی کڑی ہے جو پانچ افراد پر مشتمل ایک گھرانے کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ عام قسم کے اٹھارہ مختلف واقعات پر مشتمل ہے جن پر عموماً فکشن میں کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور جنہیں آسانی سے بھلا دیا جاتا ہے چونکہ یہ واقعات ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں اور اپنے طور پر خود مکتفی ہیں، وہ کہانی کو مسلسل آگے بڑھانے اور اس میں ربط پیدا کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں کرتے۔ اس کی بجائے امیجری کی تکرار اور موضوعاتی تلازمات کے ذریعے، جو مختلف واقعات کے محض لفظی ہی نہیں بلکہ مجازی مطالعے سے بھی سامنے آتے ہیں، ربط پیدا کیا گیا ہے۔ کہانی کا عنوان بذات خود معنی خیز ہے کیونکہ ''ساکن زندگی'' کہانی کم اور تصویر زیادہ ہے۔ جس طرح تصویر میں مختلف اشیا کے مابین تعلق ڈھونڈنے اور موضوع کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے کے لیے دیکھنے والے کی نظر تصویر کے کبھی کسی حصے اور کبھی کسی حصے پر مسلسل گھومتی رہتی ہے، اسی طرح اس کہانی کا موضوع دریافت کرنے کے لیے قاری کی ذہنی نگاہ میں واقعات بے ترتیب انداز سے آتے رہتے ہیں اور یہی اس کہانی کا امتیازی وصف ہے۔

''ساکن زندگی'' اور اس سے ملتی جلتی کہانیوں میں پانچ افراد پر مشتمل جس گھرانے کا بیان کیا گیا ہے، وہ عملی طور پر شونو کا تقریباً اپنا ہی گھرانا ہے اور ان میں کرداروں کے جو مکالمے اور افعال درج کئے گئے ہیں، وہ حقیقی زندگی کے بے حد قریب ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ شونو کی نگارشات کی جڑیں سختی سے ''میں۔ ناول'' کی روایت میں پیوست ہیں جس نے اس صدی کے آغاز سے جاپان کے جدید ادب میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جب کہ اکثر ''میں ناول نگاروں'' نے خاندان کی شکست و ریخت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ شونو زیادہ تر ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دیتے ہیں جو خاندان کو مربوط کر سکتی ہیں۔ انتہائی سادہ زبان اور جزئیات کے تفصیلی بیان کے ذریعے وہ ہمیں دکھاتے ہیں کہ انسانی زندگی کا تانا بانا اکثر انتہائی بے کیف تجربوں ہی سے بنا جاتا ہے جو بظاہر پیش پا افتادہ اور بے معنی نظر آتے ہیں۔

''ہم مچھلیاں پکڑنے والے تالاب پر جا سکتے ہیں؟'' لڑکے نے ملتجیانہ لہجے سے کہا۔

یہ ابتدائی مارچ کا خوبصورت، بے ہوا دن تھا اور کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے بہار کی آمد آمد ہو۔

''تم مچھلیاں پکڑنے نہیں جانا چاہو گے۔ تمہیں معلوم ہے تم کبھی کوئی چیز نہیں پکڑ پاؤ گے۔''

''میں جانا چاہتا ہوں۔ سب بچے جاتے ہیں۔ چند دن ہوئے ماسوکو نے پانچ پکڑی تھیں۔''

''کیسی؟''

''گولڈفش۔''

''گولڈفش؟ چہ خوب!'' باپ کے لہجے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ ''اگر تم صرف گولڈفش ہی پکڑ پائے تو پھر کوئی خاص مزہ نہیں آئے گا۔''

''اس میں بھی مزہ آتا ہے۔ بعض لڑکے بڑی مچھلی پکڑنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔''

''ارخ؟''

''ابا! آپ بھی کچھ نہ کچھ پکڑ ہی لیں گے۔ ضرور پکڑ لیں گے۔'' لڑکے کو ایک مہینے بعد دوسری جماعت میں داخل ہونا تھا۔

''پتا نہیں۔'' باپ نے کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو پہلی مرتبہ ہو گا۔ میں جس واحد جگہ مچھلیاں پکڑ سکا ہوں، وہ سمندر ہے۔ میں ان مصنوعی تالابوں پر کبھی نہیں گیا۔'' تاہم خود اسے بھی اپنا یہ بہانہ خاصا کمزور نظر آ رہا تھا۔

'' آپ کو کوشش تو کرنا چاہیے۔'' اس کی بیٹی نے لقمہ دیا پہنچ جانا تھا۔ ''کون جانتا ہے؟ آپ کچھ نہ کچھ تو پکڑ ہی لیں گے۔ اگر نہ بھی پکڑ پائے تو کیا فرق پڑے گا؟ بہرحال تفریح تو ہو ہی جائے گی۔''

''میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔'' باپ نے کہا۔ ''اگر میں نے کوشش نہ کی تو مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔''

''اگر ہم تینوں چلے چلیں تو ممکن ہے ہم میں سے کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ پکڑنے میں کامیاب ہو جائے۔'' لڑکی نے کہا۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ وہ اپنی غیر آمادگی ترک کر چکا ہے۔ وہ جب بھی کسی چیز کے بارے میں پریشان یا متامل نظر آتا تھا، وہ اس کے ساتھ ہمیشہ اسی حوصلہ افزائی کے لہجے میں بات کرتی تھی۔ اسے اس کے ساتھ نپٹنے کا طریقہ خوب

آتا تھا۔

کئی سال پہلے حادثے کے روز یہ لڑکی کسی یتیم کی طرح کھرے کونے میں اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پاس اس کا مصنوعی کتا تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کہیں کوئی خرابی بھی نمودار ہو سکتی ہے۔ تب اس کی عمر ایک سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔

''خوب مزے کرو!'' ماں نے ان کی روانگی پر کہا۔'' جب بھوک لگے، واپس گھر چلے آنا۔'' تین سالہ لڑکے کو گھر پر ہی ٹھہرنا تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ مچھلیاں نہیں پکڑ سکتا تھا۔

جب وہ گھر سے نکلے، باپ کے دل میں خوشگوار جذبات جنم لے رہے تھے۔ جو کام اس نے پہلے کبھی نہیں کیا ہوتا اور وہ اس پر روانہ ہوتا تو اس کی ہمیشہ یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اور بچوں کا جوش و خروش تو خواہ مخواہ آدمی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

لڑکا اپنی ٹین کی چھوٹی بالٹی اپنے ساتھ لے آیا تھا جو وہ صحن میں اپنے پانی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ جب وہ پیدل جا رہے تھے، باپ نے اسے اپنے بیٹے کے پہلو میں آگے پیچھے جھولتے دیکھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ''مجھے اکثر گھر سے باہر نکلنا اور اس قسم کے کام کرنا چاہئیں۔ مجھے بہانے نہیں گھڑنا چاہئیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں بچوں کے ساتھ اکثر گھومنے پھرنے نکلا کروں۔ ہم کچھ پکڑ پاتے ہیں یا نہیں، اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم بالٹی پکڑ کر چل پڑے ہیں۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے لیکن اکثر چھوٹی چھوٹی باتیں ہی عظیم فرق پیدا کرتی ہیں۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ خالی بیٹھنے رہنے سے کچھ نہ کچھ کرنا بہرحال بہتر ہے۔ جن دنوں اسے فراغت ہوتی تھی، وہ گھر میں ادھر ادھر بے مقصد گھومنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ وہ اتوار کے روز باہر تفریح کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بناتا تھا اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ جب آخر اتوار آ جاتا، وہ شاذ و نادر ہی کبھی گھر سے باہر قدم نکالتا۔ بعض اوقات اسے اپنے گھر والوں پر ترس آنے لگتا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ کچھ مدت سے اس کا یہی وتیرہ بن چکا تھا اور بچے اس کے عادی ہو چکے تھے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، ان کے نزدیک چھٹی کا مطلب یہ تھا کہ انہیں سارا دن گھر میں گزارنا اور اپنے

کھیل کھیلنا ہے۔ خیر، وہ انہی باتوں سے کافی تفریح کر لیتے تھے۔

پھر بھی اس کا اپنا اتنا کاہل رہنا اس کی اپنے بھلے کی بات نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مچھلیاں پکڑنے کا تالاب دور ہی کتنا ہے، صرف دس منٹ کا تو فاصلہ ہے۔

سڑک سے نیچے تالاب دکھائی دینے لگا۔ یہ دھان کی فصلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس سے آگے پہاڑی ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی جس پر بلند و بالا درخت کھڑے تھے۔ دراصل تالاب دو تھے۔ ایک تالاب میں چھوٹی مچھلیاں پالی جاتی تھیں اور یہ متبدیوں کے لیے تھا۔ دوسرے میں بڑی مچھلیاں تھیں۔ یہ ان لوگوں کے لئے تھا جنہیں مچھلیاں پکڑنے کا خاصا تجربہ حاصل تھا جیسا کہ اتوار کے روز توقع کی جا سکتی تھی، دونوں پر بڑا ہجوم تھا۔

''ایک بالغ اور ایک بچہ۔'' باپ نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ ریل گاڑی کی ٹکٹ خرید رہا ہو۔ وہ اس سے مختلف لہجہ اپنا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ادھر پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اس نے ایک گھنٹے کی ٹکٹ خریدی۔ اسے مچھلیاں پکڑنے کے دو بانس اور کچھ چارا مل گیا۔ لیکن جس آخری شخص نے ان میں سے ایک بانس کو استعمال کیا تھا، اس نے اسے واپس کرنے سے پہلے اس کی ڈور کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب وہ مچھلی پکڑنے میں ناکام رہا ہوگا، وہ بہت جھنجھلایا ہوگا اور اسی غصے کے عالم میں گھر چلا گیا ہوگا۔ باپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈور کس طرح سلجھائے۔ چنانچہ اس نے مدد کے لیے اس خاتون کی طرف رجوع کیا جو گیٹ پر کھڑی تھی۔

''یہ رہا۔'' خاتون سے مسکرا کر بانس اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''ڈور ٹھیک طرح بندھی ہوئی ہے؟''

''ہاں، اب اس میں کوئی خرابی نہیں ہونا چاہئے۔''

لڑکا اتنا بے قرار ہو رہا تھا کہ اس کے لیے انتظار کرنا ممکن ہو گیا اور وہ آگے بھاگ گیا۔ لیکن اب وہ واپس آ گیا اور زور زور سے چلانے لگا: ''ابا، جلدی کریں۔ اب چلیں بھی!'' میں نے بہت اچھی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔ ادھر'' تاہم وہ جس مقام کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ اس تالاب پر تھا جو تجربہ کار اشخاص کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں جو لوگ موجود تھے ان کے پاس اس قسم کے تھوتھرے بانس نہیں تھے جیسے کہ ان تین نوواردوں نے کرائے پر لئے تھے۔ پھر وہاں مچھلیاں پکڑنے کے لیے ٹکٹ بھی زیادہ پیسوں کی خریدنا پڑتی تھی۔

''ہم وہاں نہیں جا سکتے۔'' لڑکی نے کہا۔

''لیکن چل کر دیکھیں تو سہی۔ وہاں بڑی مچھلیوں کی بہتات ہے۔''

''نہیں۔'' لڑکی نے ملائم لہجے سے کہا۔ ''ہمارے لیے اس تالاب میں مچھلیاں پکڑنا بہت مشکل ہو گا۔ نو آموزوں کو مچھلیاں پکڑنے کی یہاں کوشش کرنا پڑتی ہے۔''

''اف!''

جب خاتون باپ کو سمجھا چکی کہ کانٹے پر چارا کیسے لگایا جاتا ہے تو وہ بچوں کے پاس اس تالاب پر آ گیا جو نو آموزوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں جو لوگ مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے، ان میں بالغ بھی اچھی خاصی تعداد میں شامل تھے۔ مرد اکیلے اکیلے اور شادی شدہ جوڑے مل کر مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ تینوں مل کر دو بانس استعمال کر رہے تھے لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جب کبھی کوئی دوسرا شخص کوئی چھوٹی موٹی مچھلی پکڑتا، لڑکا اسے دیکھنے ادھر دوڑ پڑتا اور بلند آواز سے پکارنے لگتا: ''ابا، یہاں زیادہ شکار مل رہا ہے۔''

''سنو۔'' باپ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا، ''ہم کچھ پکڑیں یا نہ پکڑیں، ہمیں ایک ہی جگہ ٹکے رہنا چاہیے۔ یہی ہمارے حق میں بہتر رہے گا۔ اگر ادھر کسی شخص کے کوئی چیز قابو آ جاتی ہے، تم سمجھنے لگتے ہو وہ بہتر جگہ ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں۔ بعض مچھلیاں پکڑنے کا گر جانتے ہیں اور بعض نہیں۔ لیکن مچھلیاں پکڑنے والا خواہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اسے بھی انتظار کرنا اور صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ بار بار جگہ بدلنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر آدمی آرام سے نہ بیٹھے، قسمت کبھی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔''

اس نے جو کچھ کہا تھا، اس پر اسے ایک کہانی یاد آ گئی جو اس نے مڈل سکول میں اپنی انگریزی کی کتاب میں پڑھی تھی۔ اس کہانی کا عنوان ''Sick to your own bush'' (اپنی جھاڑی سے چمٹے رہو) تھا۔ اس کہانی کے مطابق چند لڑکے جنگل میں خود رو رس بھریاں توڑنے چلے گئے۔ لڑکے رس بھریوں کی جھاڑیوں کے، جو ادھر ادھر اگی ہوئی تھیں، مابین منتشر ہو گئے۔ کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پہلے ایک اور پھر دوسری سمت سے ''مل گئیں، مل گئیں'' کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ ابھی ایک بھی رس بھری نہیں آئی تھی۔ اسے جدھر سے ''مل گئیں'' کی آوازیں سنائی دیتیں، وہ ادھر بھاگ کھڑا

ہوتا لیکن اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دوسرا لڑکا تمام رس بھریاں توڑ چکا ہوتا اور اسے کچھ نہ ملتا۔ جب باقی تمام لڑکے اپنی اپنی ٹوکریاں بھر چکے، اس کے پاس گنتی کی چند ایک تھیں۔ چنانچہ دوسروں نے اسے سمجھایا: ''جس طرح تم ادھر ادھر بھاگے پھرتے ہو، تمہیں کوئی خاص رس بھریاں نہیں مل سکیں گی۔ تمہیں چاہیے کہ ایک جھاڑی منتخب کر لو اور اسی سے چمٹے رہو۔'' اور یہی کہانی کا اخلاق سبق ہے............ یعنی ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جب وہ ابھی لڑکپن کی منازل طے کر رہا تھا، اسے یہ کہانی بالکل غیر دلچسپ معلوم ہوتی تھی اور اسے پڑھ کر اس کے دل میں کوئی امنگ نہیں پیدا ہوتی تھی۔ لیکن اب جب کہ وہ باپ بن چکا تھا اور مچھلیاں پکڑنے یہاں آ گیا تھا، وہ یہی بات اپنے بیٹے کے ذہن نشین کرا رہا تھا۔

اس سرزنش سے اتنا تو ہوا کہ لڑکے کی چیخ پکار بند ہو گئی لیکن ان کی قسمت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ دوسرے لوگ جب کوئی مچھلی پکڑتے تھے، اسے دیکھنے کے لیے لڑکا اب بھی کبھی کبھار بھاگ اٹھتا ہے۔

جہاں باپ بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے اسے درحقیقت پانی میں کوئی مچھلی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ تاہم وہ اپنی جھاڑی سے چمٹا رہا۔

''میرا خیال ہے یہ دن ہمارا نہیں۔'' اس نے اپنی بیٹی سے کہا جو اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ''ویسے بھی یہ کام اتنا آسان نہیں۔''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ محض اپنا بانس دیکھتی رہی۔

کبھی کبھار عورتیں اپنی شاپنگ کی ٹوکریاں اٹھائے تالاب کے سامنے گزرتی دکھائی دے جاتیں۔ ان میں سے بعض مچھلیاں پکڑنے والوں کو دیکھنے کے لیے ذرا کی ذرا رک جاتیں۔ جب ایک بار باپ ان راہ گیروں کو دیکھ رہا تھا، اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا بانس پانی میں ہچکولے کھا رہا ہے۔ وہ جھٹ اس طرف متوجہ ہو گیا۔ بانس کبھی پانی میں ڈوب رہا تھا اور کبھی اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس نے اسے جھٹکا دیا اور باہر کھینچ لیا۔ ڈور کے سرے پر کوئی مہین زرد چیز ٹمٹما رہی تھی۔

''ایک مل گئی!'' لڑکی چلائی۔

لڑکے نے، جو اپنے سے کسی بڑے لڑکے کو مچھلیاں پکڑتے دیکھ رہا تھا، یہ آواز سن لی اور وہ سرپٹ بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔

''ہمیں مل گئی! ہمیں مل گئی!'' وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔

''چپ کرو، اتنا شور نہ کرو۔'' باپ نے اسے ڈانٹ پلائی۔ لیکن اس کا اپنا چہرہ دمک رہا تھا۔ یہ واقعی ننھی منی گولڈفش تھی جو اس کے کانٹے میں پھنس گئی تھی۔ اس کی جسامت جزائرغرب الہند کی گپی (Guppy) مچھلی سے خاص بڑی نہیں تھی۔

لڑکا اپنے ساتھ جو بالٹی لایا تھا، انہیں پہلی بار اسے استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ ننھی منی گولڈفش اس میں یوں تیرتی پھر رہی تھی جیسے وہ اس حقیقت کو جھٹلانا چاہتی ہو کہ وہ ابھی ابھی کانٹے کی نوک میں پھنسی تھی۔

''جب وہ ایک مرتبہ اسے استعمال کر لیتی ہیں تو پھر انہیں عادت سی پڑ جاتی ہے۔'' بزرگ ڈاکٹر نے کہا۔ ''چنانچہ وہ اسے بار بار استعمال کرنے لگتی ہیں۔''

''مجھے بھی اسی کا اندیشہ تھا۔'' نوجوان شوہر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اپنی شادی کے صرف تین سال بعد وہ اتنا شکست خوردہ اور بے حوصلہ ہو جائے گا۔

''کم از کم اتنا تو عموماً ہوتا ہی ہے۔''

''کیا پھر یہی ہو گا؟'' اس نے سخت مایوسی اور بے چارگی کے عالم میں پوچھا۔ ''کیا وہ پھر اسے استعمال کرے گی؟''

تمہارے لیے اسے بر۔ بر۔ بر۔ برداشت کرنا مشکل ہو رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے کھلکھلا کر اپنی ہکلاتی ہنسی ہنستے کہا۔ تاہم اس کی آواز میں قدرے ہمدردی کی جھلک تھی۔ نوجوان ڈاکٹر کی اس امتیازی ہنسی سے بخوبی واقف تھا۔

''میرا خیال ہے ایک دفعہ کافی ہے؟''

''یقیناً کافی ہے۔''

ڈاکٹر نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے مہمان کے لیے کچھ مزید وسکی

انڈیلی۔ نوجوان سیاہی مائل سیال کو گلاس میں اوپر اٹھتے دیکھتا رہا۔

''ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔ کیوں ہوتی ہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے صراحی اٹھائی اور وسکی میں کچھ پانی ملا دیا۔ ''یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی اندھیرے میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔''

ڈاکٹر کا نشستی کمرا ایک قسم کی انیکسی تھا۔ اسے مکان کے اصل حصے سے ذرا اونچی سطح پر تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنے گھر والوں سے الگ تھلگ یہاں گزارتا تھا۔ جب اسے کسی چیز کی ضرورت پیش آتی تھی، وہ محض تالی بجا دیتا تھا۔ جب تک کوئی مریض نہ آ جاتا، وہ اس کمرے سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے اور وسکی کی بوتل ان کے درمیان میز پر رکھی تھی۔ جب کبھی نوجوان کو معمر ڈاکٹر کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا، اسے کسی نہ کسی طرح ایک گونہ اطمینان حاصل ہو جاتا تھا۔

نوجوان اسی شہر میں پیدا ہوا تھا اور یہیں پلا بڑھا تھا۔ اس کی ڈاکٹر کے کلینک کی یادداشت تب کی تھی جب وہ ابھی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے گھر کے قریب کسی دوست کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں کسی لکڑی پر رپٹ گیا جس کا خاصا بڑا کیل اس میں کافی دور تک دھنس گیا۔ اس کا دوست اس کی ماں کو بلانے بھاگ گیا اور وہ خود وہیں بیٹھا روتا رہا۔ جب اس کی ماں میدان میں پہنچی، اسے یوں لگا جیسے اس کو حادثہ پیش آئے مدتیں بیت چکی ہوں۔

اگلی بات جو اسے یاد تھی، وہ یہ تھی کہ وہ کسی نیم تاریک کمرے میں معائنے کی میز پر لیٹا ہوا تھا اور ڈاکٹر اس کے پاؤں سے کیل نکال رہا تھا۔ پریشان چہرے اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔

اس جگہ یہ اس کی پہلی آمد تھی۔

''اس کے پا۔ پا۔ پاؤں کا کیا حال ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''وہ اسے کہاں جلا بیٹھی تھی؟''

''میرا خیال ہے اسے چلنے میں اب بھی تکلیف ہوتی ہے۔''

''ہاں۔ مجھے یقین ہے بالکل ہوتی ہو گی۔ جلا بھی تو اس کے پاؤں کا تلوا تھا۔''

''ویسے وہ دعوے سے کہتی رہتی ہے کہ اسے اب اس کے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

ڈاکٹر نے ہمدردانہ انداز سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں نیچے جھکا لیں۔

''عملاً خود مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت دکھ پہنچا تھا۔'' نوجوان نے ایک اور چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کپڑا ڈھیلا ہو گیا ہے۔''

''بالکل، بالکل۔'' ڈاکٹر نے حسب معمول اپنی ہکلاتی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسے وقت آدمی کا دھیان بمشکل ہی ان باتوں کی طرف جاتا ہے۔ تمہاری بیوی کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا حالانکہ یہ اس کا اپنا پاؤں تھا۔''

اپنی بیوی کے بازوؤں اور ٹانگوں کو چھونے پر اسے کا جسم جس طرح ٹھنڈا محسوس ہوا تھا، اسے وہ یاد آ گیا۔ پہلے پہل تو اسے یہی لگا تھا کہ یہ قدرے گرم ہے لیکن یہ بتدریج ٹھنڈا اور مزید ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس کے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں اس نے ابلتے پانی کی تین بوتلیں بھریں اور اس کے بستر پر.......... ایک اس کے دائیں، دوسری بائیں پہلو میں اور تیسری اس کے سینے پر رکھ دی تھیں۔

بعد میں وہ اسے اپنے بازوؤں میں .... پہلے ایک اور پھر دوسری جانب سے.......... تھامے رہا تھا تاکہ ڈاکٹر اس کا معائنہ کر سکے۔ اس کی اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے بہنے لگے تھے۔ وہ صحیح صحیح نہیں بتا سکا تھا کہ وہ جلی کب تھی۔ اس نے ابلتے پانی کے گرد جو کپڑا لپیٹا تھا، وہ اس کی ٹانگیں ہلانے جلانے کے دوران میں ڈھیلا ہو گیا ہوگا۔

ڈاکٹر نے وسکی کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اپنے لیے ایک اور گلاس انڈیل لیا۔

''اس قسم کی سوزش صحیح معنوں میں مسئلہ بن سکتی ہے۔ میرے پاس پہلے بھی ایسے مریض آتے رہتے ہیں۔ لوگ بستر پر اپنے پہلو میں گرم پانی کی بوتل رکھ لیتی ہیں اور انہیں اگلی صبح تک پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اپنے آپ کو جلا بیٹھے ہیں۔''

''تو اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں؟''

''میرا خیال ہے اگر آدمی گہری نیند سویا ہوا ہو، اسے اتنی تکلیف نہیں ہوتی کہ اس کی آنکھ کھل جائے۔ دوسرے موقعوں پر جلنے سے اتنا ضرر نہیں پہنچتا جتنا اس طرح پہنچتا

ہے۔''

اپنے تخیل میں نوجوان کو حادثے کے بعد ابھی تک اپنی بیوی پرسکون مکان میں قدرے لنگڑا لنگڑا کر چلتی نظر آ رہی تھی۔

''فلو میں مبتلا ہونے کے تین دن بعد آٹھ سالہ سوزی کا انتقال ہو گیا۔'' باپ نے اخبار سے پڑھ کر سنایا۔ اسے امریکا کی خبروں کے مابین کوئی کہانی نظر آ گئی تھی جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ شاید دوسرے لوگ بھی اسے سننا پسند کریں گے۔ وہ سب میز کے گرد بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

''سوزی سیاہ فام لڑکی تھی۔'' اس نے مزید پڑھنے سے پہلے وضاحت کی۔ غم زدہ والدین سے تعزیت کرنے متعدد دوست اور پڑوسی آئے۔ جنازے کی دعا کے دوران میں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی لیکن جب تابوت کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا............''

''کوئی گڑ بڑ ہو گئی؟'' لڑکی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

باپ نے اس مداخلت کے جواب میں اسے یوں گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، ''مجھے ختم کر لینے دو۔'' اور دوبارہ کہانی پڑھنے لگا: ''جب والدین نے اپنی لڑکی کی میت کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لیے تابوت کا ڈھکن کھولا، سوزی نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بولی امی، مجھے دودھ مل سکتا ہے؟ سارے شہر میں ہاہا کار مچ گئی۔''

''وہ دوبارہ زندہ ہو گئی؟'' لڑکی نے پوچھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدت سے چاہتی ہے کہ اس کا باپ اسے انھی لفظوں میں جواب دے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گئی تھی۔''

''بالکل انوکھی اور غیر فطری بات ہے۔'' بڑے لڑکے نے کہا اور پچھلی جانب تنکوں کی چٹائی پر ڈھلک گیا۔

تین سالہ لڑکے نے جھٹ پٹ اس کی تقلید کی۔

''تصور کرو لوگوں کو کتنا دھکا پہنچا ہو گا!'' باپ نے کہا۔ وہ اپنے ذہن میں اس چھوٹے سے جنوبی قصبے کا خاکہ بنانے کی کوشش کرنے لگا جہاں سوزی اور اس کے ماں باپ

رہتے ہوں گے، تاہم وہ حقیقتاً یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہاں کی سڑکیں اور مکان دیکھنے میں کیسے نظر آتے ہوں گے۔ بلاشبہ قبرستان قصبے کے نواح میں واقع ہوگا لیکن گردوپیش ہوگا؟

''کیسی بھیانک کہانی ہے!'' اس کی بیوی نے کہا۔

''بھیانک؟ کیوں؟ تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''ہونہہ؟ مجھے معلوم نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ بہت مضطرب نظر آ رہی تھی۔ ''میرا مطلب ہے، اف خدایا! سب لوگوں نے فرض کر لیا تھا کہ بچی مر چکی ہے لیکن وہ اچانک جاگ جاتی ہے اور بولنے لگتی ہے۔ اگر میں ماں ہوتی تو میری تو ڈر کے مارے جان ہی نکل جاتی۔'' اس کے شوہر نے اسے بغور دیکھا ضرور لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ ''آپ نہ ڈرتے؟''

اچانک کمرے میں عجیب وغریب آواز گونجی: ''امی مجھے دودھ مل سکتا ہے؟''

یہ آواز لڑکی کی تھی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی اور وہ خالی خالی نظروں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ وہ یوں بن رہی تھی جیسے وہ سوزی ہو اور ابھی ابھی اس نے نئی زندگی پائی ہو۔

''یہ کس قسم کی آواز ہو گی؟'' باپ سوچ رہا تھا۔ ''ایک شخص تقریباً مردوں کی سرزمین میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اچانک چمکتی چمکتی دنیا میں واپس آ جاتا ہے، اس کی آواز کیسی ہو گی؟''

''اف، اس طرح مت بولو۔'' ماں نے لڑکی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اس سے میری جان نکلنے لگتی ہے۔''

اتوار کے تفریحی دورے کے دوران میں جو گولڈفش ملی تھی، اسے بچوں کے سٹڈی روم میں میں رکھ دیا گیا۔ وہ درمیانی کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب شیشے کے پیالے میں تیر رہی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''کتنی صحت مند گولڈفش ہے!'' ماں کے منہ سے اکثر نکل جاتا۔ خاندان کی نئی پالتو چیز کا بیشتر وقت وہی خیال رکھتی تھی............ وہ اس کا پانی تبدیل کرتی، اسے روٹی کے

چھوٹے چھوٹے بھورے کھلاتی اور کبھی کبھار نمک کی معمولی سی مقدار بھی دے دیتی تھی۔

جب باپ اور بچے بالٹی میں اپنا ننھا منا شکار لے کر گھر لوٹے تھے، ماں نے کہا تھا: ''کتنی خوبصورت ہے!'' ''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' باپ کو اس سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔ ''اس کا جسم اتنا بڑا تو نہیں، لیکن یہ ہے واقعی نفیس، چکنا اور چمکدار۔''

اور اس کے پیٹ، سر اور چانوں پر کہیں کہیں سرخ دھاریاں تھیں جو بمشکل نظر آتی تھیں۔

''جب یہ پھنسی تو میرا دھیان طرف تھا۔'' اس نے کہا تھا۔ ''ہمیں اس کا بڑا خیال رکھنا ہوگا۔''

سٹڈی روم میں دونوں بچوں کو، جو سکول میں پڑھتے تھے، ڈیسکوں اور بک شیلفوں کے علاوہ چند اور چیزیں بھی تھیں۔ ان کی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑے سینے کی مشین بھی یہیں رکھی تھیں۔ ایک کونے میں ٹوکری پڑی تھی۔ اس میں چند چوبی گوٹیں، چند چھلے، ایک بیس بال کا دستانہ، بچوں کے چند کھلونے، جو ابھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئے تھے اور کئی الم غلم اشیا ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دوسرے کونے میں دو بڑے بڑے سوٹ کیس ایک دوسرے کے اوپر سجے ہوئے تھے۔ وہ شاذونادر ہی استعمال میں آتے تھے: بیش وقت وہ بس جگہ ہی گھیرے رکھتے تھے۔

چنانچہ صحیح معنوں میں اسے بچوں کا سٹڈی روم کہنا درست نہیں تھا۔ دراصل یہ وہ کمرا تھا جس میں وہ ہر چیز رکھ دی جاتی تھی جو کسی دوسرے کمرے میں موزوں نہیں معلوم ہوتی تھی۔

دیوار پر دو تصویریں چسپاں تھیں۔ ایک کا نام ''سٹار چلڈرن'' تھا۔ اسے کئی سال پہلے لڑکی نے اپنے چھٹیوں کے کام کے طور پر بنایا تھا۔ وہ ننھی منی لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہلکے نیلے آسمان پر تیر رہی تھیں۔ ہر ایک کے سر پر روپہلی کاغذ کا ستارہ سجا ہوا تھا۔ ان کے لباس کپڑوں کی بچی کھچی کترنوں سے بنائے گئے تھے اور بالوں کی جگہ زرد اور سرمئی دھاگوں کے ٹکڑے گوند سے چپکا دیئے گئے تھے۔ دوسری تصویر کا عنوان ''کاؤ بوائز............ میدانی علاقے میں'' تھا۔ یہ دراصل ڈرائنگ تھی اور اسے بڑے لڑکے نے پنسل سے بنایا تھا۔ ایک کاؤ بوائے نے، جس کے کندھے پر رائفل لٹک رہی تھی، ابھی ابھی کسی پرندے پر

گولی چلائی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں رسی کا پھندا تھا۔ وہ اسے گھوڑے کی گردن میں ڈالا ہی چاہتا تھا جو فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ ایک سانڈ ان کی طرف یوں بھاگا چلا آ رہا تھا جیسے وہ ان پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ اور ایک خرگوش ان کے قریب کلیلیں کرتا پھر رہا تھا۔

بید کی دو کرسیاں بھی کسی طرح اس کمرے میں پہنچ گئی تھیں۔ اگر انہیں ایک دوسرے کے برابر برابر رکھا جاتا، وہ دروازہ پار کرنے میں رکاوٹ بن سکتی تھیں، چنانچہ عام طور پر انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا جاتا تھا۔ جب بچوں کے دل میں موج آتی، وہ اپنی ڈیسک کرسیوں کو ان کے ساتھ باندھ دیتے اور یوں ایک قسم کی سٹیج کوچ (پرانے زمانے کی بند گھوڑا گاڑیاں جن کے گھوڑے مختلف چوکیوں پر بدلے جاتے تھے) بنا لیتے۔ ان میں ایک کوچوان کی نشست پر اور دوسرے دو اس کے اندر بیٹھ جاتے۔ پھر وہ شور مچاتے، چابک لہراتے اور پہیے ٹھک ٹھکاتے یوں چل پڑتے جیسے وہ کسی قدیمی شاہراہ پر سرپٹ بھاگے جا رہے ہوں۔

تو یہ تھا وہ کمرا جس میں گولڈفش کا ورود ہوا تھا۔ پانی سے لبریز شیشے کے نازک پیالے کے لیے وہ کوئی محفوظ جگہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب اس میں کوئی گیند یا کھلونا آ گرے گا یا کوئی بچہ اس سے ٹکرا جائے گا اور یوں اسے پاش پاش کر دے گا۔

ہے تو یہ بات ناقابلِ یقین لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس قسم کا کوئی سانحہ رونما نہ ہوا۔ بچوں کے اطوار پہلے سے بہتر نہیں ہوئے تھے تاہم پیالہ کسی نہ کسی طرح بچ ہی گیا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، یہ کمروں کی دوسری چیزوں سے خلط ملط ہوتا چلا گیا اور اب کسی کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہیں ہوتی تھی۔

پھر بھی باپ اپنے اس خدشے پر قابو نہ پا سکا کہ کسی روز کوئی نہ کوئی اسے ضرور توڑ ڈالے گا۔

''ابا، شب بخیر۔''

''امی، شب بخیر۔''

''سب کو شب بخیر۔''

کچھ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بچوں کی آوازیں ابھی تک فضا میں گونج رہی ہوں۔ صرف کچھ ہی دیر پہلے ان کی آپس میں دوڑ لگی ہوئی تھی کہ کون پہلے شب خوابی کا پاجامہ پہنتا اور بستر پر پہنچتا ہے۔ اب جب کہ سارے گھر پر سکوت طاری ہو چکا تھا، صرف باپ جاگ رہا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پہلو میں لیٹی سو رہی تھی اور وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یہ عورت جو اپنا چہرہ اس کی جانب کیے لیٹی ہوئی تھی............یہی وہ عورت تھی جس سے اس نے شادی کی تھی۔ وہ پندرہ سال سے ہر رات اس کے ساتھ ایک ہی بستر میں سو رہا تھا۔

بچپن میں وہ اکیلا سوتا رہا تھا اور فوج کی ملازمت کے دوران میں بھی اکیلا سوتا رہا تھا۔ لیکن جس روز اس کی شادی ہوئی تھی، اس نے ایک اور شخص کو اپنے بستر میں سلانا شروع کر دیا تھا۔ یہ دو افراد، جو پہلے ایک دوسرے کو خاص جانتے بھی نہیں تھے، اکٹھے سونے لگے تھے، بس زندگی اسی طور گزرنے لگی تھی۔

درحقیقت ایک مختصر وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ دونوں ایک ہی بستر پر نہیں سویا کرتے تھے۔ اس کی مدت کتنی تھی؟ تین مہینے؟ شاید اتنی بھی نہیں۔ وہ علیحدہ علیحدہ کمروں میں سویا کرتے تھے۔ اس کی بیوی اپنی بچی کو اپنے ساتھ سلایا کرتی تھی جو ان دنوں ایک سال کی ہوئی تھی۔ لیکن یہ انتظام بہت جلد ختم ہو گیا۔ حادثے کے بعد دونوں پھر اکٹھے سونے لگے تھے اور وہ تب سے اکٹھے سو رہے تھے۔

سکوت میں اکیلے جاگتے ہوئے اس کے خیالات ان کی سہاگ رات کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس رات چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس کی کرنیں کھڑکی میں سے اندر آ رہی تھیں اور اس کی بیوی کے چہرے کو منور کر رہی تھیں جو اس کے پہلو میں لیٹی چپ چاپ سو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سانس بھی بمشکل چل رہی ہے۔ اس کے بالوں میں چھوٹا سا ربن تھا۔

''یہ ہماری پہلی رات تھی۔'' اس نے دل میں سوچا۔

وہ جو کتاب پڑھ رہا تھا، اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس نے اسے دوبارہ اٹھایا اور صفحہ تلاش کرنے لگا۔ ''یہ رہا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''نہیں، یہ تو میں پہلے پڑھ چکا ہوں۔'' اس نے مزید کئی صفحات پلٹ ڈالے۔ ''کیا یہ تھا؟'' نہیں، اسے یہ حصہ بھی یاد تھا۔

''پھر وہ کہاں گیا؟''

اس نے ایک صفحہ منتخب کیا۔ اپنی آنکھوں کو، جن کے پپوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے، زبردستی کھولا اور پڑھنے لگا۔ چند ہی منٹوں میں اسکی آنکھیں دوبارہ بند ہوگئیں اور کتاب نیچے گر پڑی۔

''مجھے یاد نہیں یہ امریکا تھا یا انگلستان، لیکن میں نے ایک لڑکے کے متعلق کہانی پڑھی تھی جس کے ہاتھ کسی بطخ کا انڈا آ گیا تھا اور اس نے اس میں بچہ جنوا لیا تھا۔'' لڑکے نے شام کو غسل کے دوران میں بتایا۔

''اس نے بطخ کا بچہ جنوا لیا؟''

''اسے یہ ملا کہاں سے تھا؟''

''پتا نہیں۔''

''کسی گاؤں کے قریب؟''

''ہوں۔ گاؤں کے قریب۔''

''میرا خیال ہے یہ کسی ندی یا تالاب کے کنارے پڑا ہوگا۔''

''ہوسکتا ہے لیکن وہ اس سے بچہ جنوانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے کپڑے کی دھجی سے اپنے پیٹ پر باندھ لیا۔''

''کہاں؟''

''بالکل یہاں۔'' لڑکے نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنے پیٹ میں رکھ لیا۔ باپ نے سوچا کہ اس نے یہ جگہ بالکل متنازعہ انداز سے چنی ہے۔

''اور وہ اسے تقریباً بیس روز اسی طرح حرارت پہنچاتا رہا۔ وہ خواہ سکول جاتا، خواہ سو رہا ہوتا، وہ ہر دم انڈے کو اپنے پیٹ سے چپکائے رکھتا اور اسے کبھی علیحدہ نہ ہونے دیتا۔''

''بیس دن تک؟''

''ہوں، جی ہاں، تقریباً اتنے ہی دن۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ بہرحال بچہ عین اس وقت انڈے سے نکل آیا جب کلاس جاری تھی۔ استاد اور طالبعلم سبھی دم بخود رہ

گئے۔''

''اچنبھے میں ڈالنے والی بات ہے۔'' باپ نے کہا۔ ''واقعی بچہ کلاس میں (انڈے سے) باہر آیا تھا؟''

''ہوں۔''

''اور ہر شخص حیران رہ گیا؟''

''ہوں۔''

''تم نے یہ کہانی سکول میں پڑھی تھی؟''

''ہوں۔ ہال میں نوٹس بورڈ پر۔ خاصے بڑے کاغذ پر دنیا جہاں کی خبریں لکھ لی جاتی ہیں اور پھر یہ کاغذ نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔''

''کوئی تصویر بھی تھی؟''

''بعض خبروں کے ساتھ تصویریں ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ کوئی نہیں تھی۔''

''تم نے یہ کہانی کب پڑھی تھی؟''

''بہت عرصہ ہوا۔''

''پہلی جماعت میں؟''

''ہوں۔''

''اور تمہیں یہ اب یاد آئی؟''

''ہوں۔''

باپ سوچنے لگا کہ اسے یہ کہانی کیوں یاد آئی۔ ''تمہارا خیال تھا اس سے یہ انڈا ٹوٹ جائے گا؟'' اس نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں اس نے اسے باندھا کیسے''۔

''میں شرط بدلنے کو تیار ہوں۔'' لڑکے نے کہا، ''اگر نڈا میرے پاس ہوتا تو یہ ایک دن بھی صحیح سلامت نہ رہتا۔ میں کھیل کے دوران میں اسے بالکل بھول جاتا۔ ابا! کیا خیال ہے آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟''

''نہیں۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید مجھ سے نہ ہو پاتا'' اس نے کہا۔ ''خیر، چھوڑو۔ باہر چلنے کو تیار ہو؟''

''بالکل۔'' اس نے ٹب سے باہر چھلانگ لگا دی۔

''ایک منٹ۔'' باپ نے اسے روک لیا۔ ''تم نے اپنا منہ دھویا تھا؟''

''میں نے دھویا تھا۔''

''اوہو، نہیں، تم نے نہیں دھویا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تمہارا چہرہ تو گیلا تک نہیں۔ یہ تم نے منہ دھوئے بغیر نہانا کب سے شروع کیا؟ آؤ، منہ دھوؤ، ادھر ادھر کی باتوں سے مجھے ٹرخانے کی کوشش مت کرو۔''

''بہت اچھا'' لڑکے نے صابن کی ڈبیا کا ڈھکن اتارا اور اسے گرم پانی سے بھر لیا۔

''ادھر ادھر کی حرکتیں چھوڑ دو، سیدھی طرح منہ دھو ڈالو۔''

''دھولوں گا، دھولوں گا۔'' اس نے اپنا تولیہ ڈھکن پر رکھ لیا۔

''جلدی کرو۔''

''صرف ایک سیکنڈ۔'' وہ آہستہ آہستہ اور ارادتاً صابن تولیے پر رگڑنے لگا۔ پھر اس نے تولیہ اپنے ہونٹوں کے قریب کیا اور اس پر ہلکی سی پھونک مار دی۔ تولیے پر ڈھیروں بلبلے بن گئے۔

''دیکھیں۔''

''تو تم یہ کام کرنا چاہتے تھے۔''

''دیکھیں تو سہی۔ یہ بڑے مزید بڑے ہوتے جائیں گے۔''

''خوب، بہت خوب۔ یہ پہلے ہی خاصے بڑے ہو چکے ہیں۔''

''صاف ستھرے نہیں؟''

''بالکل ہیں۔''

''آپ بھی کرنا چاہیں گے؟''

''نہیں۔ تم اپنا کرتب دکھا چکے ہو۔ اب بس کرو اور جلدی جلدی منہ دھو ڈالو۔''

''بس، تھوڑی دیر اور۔''

بلبلے بڑے ہوتے اور ساتھ ہی کچھ کچھ کپکپاتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں لڑکے کا چہرہ بالکل اوجھل ہو گیا۔

''میں سوچ رہا ہوں، ہم نے جو فلم دیکھی تھی، تمہیں یاد ہے؟'' باپ نے اپنی بیٹی

سے کہا۔ وہ اپنی گڑیا کا بلاؤز سی رہی تھی۔ ''کون سی فلم؟''

''جب تم پہلی جماعت میں پڑھتی تھیں۔ پہلی میں یا کنڈر گارٹن میں؟ نہیں، یہ اس سال کی بات نہیں جب ہم نے نقل مکانی کی تھی بلکہ اس کے ایک برس بعد کی ہے۔ چنانچہ تم پہلی جماعت میں پہنچ چکی ہو گی۔''

جب لڑکی کنڈر گارٹن میں تھی، خاندان کسی اور شہرت سے یہاں آیا تھا۔ بڑے لڑکے نے ابھی چند الفاظ سیکھے تھے اور چھوٹا ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ریل گاڑی میں جو لمبا سفر کیا تھا، باپ کو ابھی تک یاد تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ انہیں اپنا نیا مکان کیسا دکھائی دیا تھا۔ تب یہ اکیلا تھا اور اس کے ارد گرد زرعی کھیت تھے۔

اگلے سال سردیوں میں وہ اپنی بیٹی کو فلم دکھانے لے گیا تھا۔

''فلم میں کسی عمارت کی تعمیر کا منظر دکھایا گیا تھا۔ مزدوروں کا انچارج گڑھے میں گر پڑا تھا جس میں کنکریٹ بھرا جا رہا تھا۔''

''جی ہاں، مجھے یاد ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''کتنا کچھ یاد ہے؟''

اس نے ٹانکے لگانا چھوڑ دیئے۔ ''وہ شخص ترکھان تھا۔ جی، ٹھیک کہا میں نے؟''

''ہاں، ایک لحاظ سے۔ وہ مکان تعمیر کیا کرتا تھا۔ ویسے وہ اینٹیں لگانے کا کام کرتا تھا، یوں میرے خیال میں اسے راج کہنا چاہیے۔ پہلے وہ اٹلی میں رہا کرتا تھا۔ پھر ایک روز وہ بحری جہاز میں سوار ہوا اور نیویارک چلا آیا۔''

''وہ واقعی غریب تھا۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسی لیے وہ امریکا آیا تھا۔ اٹلی میں اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔''

انہوں نے یہ فلم پچھواڑے کی گلی کے سینما میں دیکھی تھی جو سٹیشن کے سامنے کی شاہراہ میں سے نکلتی تھی۔ حالانکہ انہوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے، سینما کے اندر انہیں پھر بھی سردی لگ رہی تھی۔

''اسے بخار تھا یا کوئی اور شکایت تھی، یوں وہ اپنے کام پر نہیں جا سکتا تھا۔''

''میرا خیال ہے اسے چوٹ لگ گئی تھی۔'' باپ نے کہا۔ وہ ابھی تک اپنی

دھندلی یادوں کی تفصیلات اپنے حافظے میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہاں، یہی بات درست ہے۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ وہ ان مزدوروں کا انچارج بن گیا تھا جن کا کام پرانی عمارتوں کو مسمار کرنا تھا۔ پھر اس کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اختلاف ہو گیا اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آنے لگی۔ پہلے تو مزدوروں نے اس کے ساتھ بات چیت کرنا بند کر دیا اور پھر اسے چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ چنانچہ اسے اکیلے ہی کام کرنا پڑا۔ کوئی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ ایک دیوار کے نیچے دب گیا اور اس کی ٹانگیں کچلی گئیں۔''

''اسی لیے وہ کام کرنے کے قابل نہ رہا؟''

''ہاں، کچھ اس قسم کی بات ہوئی تھی۔''

''اوہ، مجھے اب یاد آ گیا۔ جب اس کی ٹانگیں ٹھیک ہو گئیں، وہ دوبارہ کام پر جانے لگا اور پھر وہ اس گڑھے میں گر پڑا جس میں کنکریٹ بھرا جا رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے چیختا چلاتا رہا لیکن شوروغل میں اس کی آواز کسی کو سنائی نہ دی۔ چنانچہ اس کے اوپر کنکریٹ کا ڈھیر اونچے سے اونچا ہوتا چلا گیا۔''

''اور آخر میں اس کا صرف سر ہی باہر رہ گیا۔''

''یہ منظر اتنا ڈراؤنا تھا کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کی چیخیں بدستور سنتی رہی۔ میں انہیں روک نہیں سکتی تھی۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اس کی بیوی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہو کیا رہا ہے اور کوئی شخص اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔''

''ٹھیک! چونکہ اس کا خاوند کام کے دوران میں ہلاک ہوا تھا، اس لیے خیال تھا، اسے تلافی کے طور پر بہت بڑی رقم ملے گی۔ کوئی شخص اس سے پوچھنے لگا کہ وہ اس رقم کا کیا کرے گی۔ اس نے جواب میں محض اپنا سر ہلا دیا اور محض اتنا کہا۔ پتا نہیں، ممکن ہے اس کا مطلب ہو کہ اس نے ابھی اس بارے میں سوچا نہیں۔ کچھ اور یاد ہے؟''

''ہوں۔''

''نہیں؟ سینما کے اندر جانے سے پہلے میں نے تمہارے لیے جو کتاب خریدی

تھی، اس کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''اوں ہوں۔'' اس نے اپنی سلائی اٹھائی اور دوبارہ دھاگے ٹانکنے لگی۔ جس انداز سے اس کے ہاتھ حرکت کر رہے تھے، وہ ان کا بغور جائزہ لینے لگا۔

جہاں تک خود اسے یاد تھا، یہ تصویروں کی کتاب تھی لیکن کوشش کے باوجود وہ اس کا نام یاد نہ کر سکا۔ اس روز اس کی چھٹی تھی اور وہ یہ فلم ہر حال میں دیکھنا چاہتا تھا، چنانچہ وہ اسے بھی زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔سینما پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس نے بچی کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ فلم غیر ملکی تھی بلکہ جو کچھ اس نے اس کے متعلق سنا تھا، اس کے مطابق چھ سالہ بچی کے لیے اسے برداشت کرنا بھی کافی مشکل ہوگا، چنانچہ اس نے اس کی تلافی یوں کی کہ اسے یہ کتاب خرید دی۔

فلم کے پہلے چند مناظر خاصے ہلکے پھلکے تھے۔ راج کا ایک ساتھی اسے مشورہ دیتا ہے کہ اسے شادی کر لینا چاہیے اور وہ اسے ایک لڑکی کے متعلق بھی بتاتا ہے جسے وہ جانتا ہے۔ راج لڑکی کے ساتھ ملاقاتیں شروع کر دیتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔لڑکی بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی ہے۔

''لیکن ہم رہیں گے کہاں؟'' وہ اس سے پوچھتی ہے۔''جب تک تمہارے پاس مکان نہ ہو،تم سے شادی نہیں کر سکتی۔'' اس کا خاندان بھی اٹلی سے ترک وطن کر کے آیا تھا۔ وہ جانتی ہے کہ غربت کیا ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ جو لوگ اپنے مکان کے بغیر شادی کر لیتے ہیں، ان کی زندگی کتنی تلخ اور مصیبت زدہ ہوتی ہے۔

راج اسے بتاتا ہے کہ س کے پاس اپنا مکان ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ صرف اسی طریقے سے لڑکی کو شادی پر آمادہ کر سکتا ہے۔شادی ہو جاتی ہے۔ اس پر مسرت تقریب میں شرکت کے لیے پڑوس کے تارکین وطن پر مشتمل کنبے پہنچ جاتے ہیں۔

اب تک تو سب کچھ بہ حسن وخوبی انجام پا جاتا ہے لیکن پھر دلہن کو معلوم ہوتا ہے کہ جس مکان کو وہ اب تک اپنا سمجھتی رہی تھی، وہ دراصل کسی اور کا ہے۔ اس کی پرمسرت مسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ وہ سدا مسکرانے اور خوش رہنے والی لڑکی تھی لیکن اب اس پر افسردگی غالب آ جاتی ہے۔

وہ اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز ایک چھوٹے سے خستہ حال فلیٹ میں کرتے

ہیں۔ وہ دیوار پر چاقو سے V کے نشانات کھودتے رہتے ہیں۔ یہ ان کے عزم کی علامت ہیں کہ خواہ انہیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے، وہ روپیہ بچائیں گے اور اپنا مکان خرید کر ہی دم لیں گے۔ پھر بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جوں جوں فلم آگے بڑھتی گئی، سکرین پر جو مناظر دکھائے جا رہے تھے، وہ دل خراش سے دل خراش تر ہوتے چلے گئے۔ ایک صبح راج نشے میں دھت گھر آتا ہے۔ اس نے رات کسی اور عورت کے ساتھ گزاری ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے فلیٹ میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے، وہ اپنے آپ کو سزا دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنی ہتھیلی کھولتا ہے اور اسے سیڑھی کے ڈنڈے کے نوکیلے سرے پر دے مارتا ہے۔

''نہیں!'' باپ نے اپنی سانس روک لی اور تیزی سے اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے مڑا۔ تھیٹر جاتے ہوئے اس نے راستے میں جو کتاب خریدی تھی، اس کی بیٹی نے اسے اپنے چہرے کے سامنے تھام رکھا تھا۔ اس نے کتاب جبلی طور پر اپنی گود سے اٹھائی تھی جیسے محض آنکھیں بند کرنے سے منظر اوجھل نہیں ہو سکے گا۔ ''سمجھدار لڑکی ہے!'' اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے سوچا۔

راج پر یکے بعد دیگرے مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے رہے اور جب کوئی ڈراؤنا منظر نمودار ہوتا، لڑکی کی کتاب گود سے اوپر اٹھ جاتی اور پھر نیچے گر پڑتی۔ ہر مرتبہ جب منظر اختتام کو پہنچتا، باپ لڑکی کو اطلاع دیتا۔ ''اب ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے کان میں کہتا۔ ''اب جو کچھ ہو رہا ہے، تمہیں اسے دیکھے بغیر گزر جانے نہیں دینا چاہئے۔''

جب فلم کے اختتام پر راج گڑھے میں گر پڑا، باپ نے ایک بار پھر دزدیدہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی کتاب کی اوٹ میں اپنا جسم اکڑائے سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس مرتبہ سارے منظر کے دوران میں کتاب اوپر اٹھی رہی جب کہ گرتے کنکریٹ کا شوروغل اور راج کی چیخیں سارے ہال میں گونجتی رہیں۔

اچانک سکرین خاموش ہو گئی اور لڑکی نے ڈرتے کانپتے کتاب کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا۔ راج کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی بیوی، جو اپنے شوہر سے محروم ہو چکی تھی، صدمے سے نڈھال اکیلی کھڑی تھی۔

''وہ..........وہ مر گیا؟'' لڑکی نے مہین آواز سے پوچھا۔

''ہاں۔'' باپ نے جواب دیا۔

جب وہ اپنی بیٹی کو سلائی کرتے دیکھ رہا تھا، اسے یہ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔''اس وقت کتاب واقعی مفید ثابت ہوئی تھی۔'' اس نے سوچا۔ اس نے ہیبت ناک مناظر دیکھے بغیر لڑکی کو ساری فلم کے دوران میں بیٹھے رہنے میں مدد دی تھی۔

اسی طریقے سے اس کی بیٹی اس حادثے کی تفصیلات جاننے سے بچ گئی تھی جو اس کے اپنے گھر میں رونما ہوا تھا۔ وہ ابھی دودھ پیتی بچی تھی۔ چنانچہ اس کی ماں جس گہری نیند میں چلی گئی تھی، وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کسی نادیدہ ہاتھ نے ملائمت سے اس کی آنکھیں ڈھانپ دی تھیں۔

''ابا!'' لڑکے نے کہا۔''ہمیں کوئی ایسی چیز سنائیں جو'ک' سے شروع ہوتی ہے۔''

'ک' سے؟''

''ہوں،'ک ہ' سے۔''

''کہا۔ نی۔ کوئی کہانی۔

''کہانی کیا؟''

''ہم چاہتے ہیں آپ ہمیں کوئی کہانی سنائیں۔''

''مجھے کہانیاں نہیں آتیں۔'' باپ نے احتجاج کیا۔

''آپ کو آتی ہیں۔''

''اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہی۔''

''جنگلی سور کی کہانی کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''وہ............ وہ تو میں کئی مرتبہ تمہیں سنا چکا ہوں۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

باپ کے سارے بہانے ختم ہو گئے۔''گرمیوں کے موسم میں جنگلی سور ہمیشہ سوئے رہتے ہیں۔'' اس نے اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔''وہ اپنے بھٹوں سے باہر نہیں نکلتے، سارا دن سرکنڈوں اور گھاس پھوس کے نرم و گداز بستروں پر لیٹے رہتے ہیں اور سونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے۔ جس بوڑھے شکاری نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی، وہ کہتا

تھا کہ یہ سر کنڈے پہاڑوں پر اگتے ہیں۔ سور انہیں محض بستر کے طور پر ہی استعمال نہیں کرتے، بلکہ اپنے بھٹوں کے اوپر ان کی چھت بھی بنا لیتے ہیں جس سے وہ برسات کے دنوں میں بارش سے اور گرمیوں کے ایام میں دھوپ سے محفوظ رہتے ہیں۔ دونوں اعتبار سے یہ پودے ان کے بہت کام آتے ہیں۔ ساری گرمیوں کے دوران میں سور اپنے سرکنڈوں کے آرام دہ گھروں میں لیٹے رہتے ہیں۔''اگر یہ آسان زندگی نہیں، پھر کون سی ہوگی؟'' اس نے اپنے بڑے بیٹے سے چھوٹے کی طرف دیکھتے ہوئے رشک آمیز لہجے سے کہا۔

''تاہم بوڑھے شکاری نے مجھے بتایا تھا کہ آدمی گرمیوں میں ان سوروں کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ اس کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میرا خیال ہے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب قصائی گرمیوں کے سوروں کو ہلاک کرتے ہیں تو انہیں ان کی کھال کے نیچے جو چربی ملتی ہے وہ چربی تختے کی طرح سخت ہوتی ہے۔ درحقیقت شکاری اسے کہتے ہی ''تختہ'' ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ جس سور کے اندر ''تختہ'' ہو وہ اچھا نہیں ہوتا کیونکہ آدمی اسے کھا نہیں سکتا۔ لیکن دراصل ''تختے'' کا خاص مقصد ہوتا ہے۔ یہ سور کے جسم کے اندر توانائی برقرار رکھتا ہے، چنانچہ وہ ساری گرمیاں سو کر گزار سکتا ہے۔''

''اسی لیے بجو کی چربی بہتر ہوتی ہے۔ ٹھیک؟''

ٹھیک! بجو سوروں کے بالکل الٹ ہوتے ہیں۔ وہ سردیوں کے دوران میں سوئے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دنوں ان کے اجسام میں چربی کی افراط ہوتی ہے لیکن گرمیوں میں یہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ بجو کی چربی واقعی اچھی ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس کی کھال کے بالکل نیچے سے کچھ مقدار نکال لے اور پھر اسے برتن میں پگھلا لے، تو اس سے صاف ستھرا اور شفاف تیل حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں، ضمناً میں یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ شکاری ایک خاص نام کا استعمال کرتے ہیں اور وہ ''سنجاب'' ہے۔ وہ یہ نام سوروں کے بچوں کو دیتے ہیں کیونکہ ان کی پشتوں پر نرم و ملائم بالوں کی ٹکڑیاں ہوتی ہیں جو لمبے موٹے کھیروں کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔''

''یہ تو بڑی صاف ستھری چیز ہوئی۔'' بڑے لڑکے نے کہا۔

''یہ تو بڑی صاف ستھری چیز ہوئی۔'' چھوٹے لڑکے نے بڑے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسی کے الفاظ دہرا دیئے۔

''ہاں، میرا بھی یہی خال ہے۔ خیر، تم مانو یا نہ مانو مگر حقیقت یہی ہے کہ سوروں کی ایک مرغوب غذا کیچوے ہوتے ہیں۔ ذرا سوچو اتنے بڑے بڑے حیوان کیچوؤں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک ہی رات میں شکر قندی کا پورا کھیت ہڑپ کر جاتے ہیں! جب بوڑھے شکاری نے مجھے یہ بات بتائی تھی، وہ بے یقینی سے اپنا سر ہلانے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتا پیٹو حیوان آخر حقیر کیچوؤں پر کیوں مرتا ہے۔ پھر انہیں چمگادڑیں اور کیچڑ میں پائے جانے والے گھونگھے بھی بہت پسند ہیں۔ وہ کیچوؤں کی طرح گھونگھوں کو بھی اپنی تھوتھنیوں سے زمین کھود کر نکالتے ہیں۔ وہ انہیں کھاتے کیسے ہیں، ابھی تک اس پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ ان کے خول پیچھے نہیں چھوڑتے۔ وہ لازماً انہیں یا تو اپنے بھٹوں میں کھاتے ہیں یا پھر خول سمیت سالم نگل جاتے ہیں۔ شکاری کہتا تھا: ''اگر گھونگے کا خول نہ اتارا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ مزیدار ہوتا ہوگا۔'' باپ نے اپنا سر ایک طرف جھکایا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے اپنے کندھے اچکائے اور کہا، ''کون جانتا ہے وہ کیا کرتے ہیں۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی: ''میرا خیال ہے سوروں کا شکار خاصل مشکل کام ہے۔ جب آدمی برف پر ان کے قدموں کے نشان ڈھونڈنے نکلتا ہے تو اس کے پاؤں تربتر ہو جاتے ہیں اور درختوں سے اس کے اوپر برف کی مہین ڈلیاں گچھوں کی صورت میں گرتی رہتی ہیں اور پھر کچھ دیر میں اس کا پیٹ شکایت کرنے لگتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ جب آدمی سوروں کے قدموں کے نشان ڈھونڈتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا واسطہ ایک ایسی مخلوق سے ہے جو ہمیشہ ایک ہی راستے پر سے گزرتی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ سور ضابطے کی پابندی کرتے ہوں یا پھر وہ واقعتاً کسی چیز سے خوف کھاتے ہوں، میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے خود کچھ معلوم نہیں۔ بہرحال اتنا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ کتنے سور گزرے ہیں، بظاہر یہی نظر آتا ہے جیسے صرف ایک ہی سور گزرا ہو۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ مستقل مزاجی سے ایک ہی رویے پر کاربند رہتے ہیں۔

''ان کے اس رویے کے باعث ایک مرتبہ بڑا بھیانک سانحہ رونما ہو گیا۔ پہاڑیوں کے مابین جو بجلی گھر بنا ہوا ہے، وہاں جس پانی سے جنریٹر چلتے ہیں، اس کے نکاس کی نہر پر شہتیر رکھا ہوا ہے جو پل کا کام دیتا ہے۔ ایک برفانی صبح بجلی گھر کے ملازمین کو تین مردہ سور نظر آئے جو پانی میں بہتے بہتے نکاسی آب کے دروازوں میں آ پھنسے تھے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر ہوا کیا ہے، نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے تا آنکہ وہ شہتیر کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ شہتیر کا درمیانی حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ صبح صبح جو پہلا سور ادھر سے گزر رہا تھا، اس کا پاؤں برف پر پھسل گیا تھا اور وہ پانی میں گر پڑا تھا۔ چونکہ نہر کے کنارے کنکریٹ سے بنے ہوئے ہیں اور بالکل عمودی ہیں، کوشش کے باوجود سور باہر نہ نکل سکا اور موجوں کے ساتھ بہتا چلا گیا۔ پھر دوسرا سور آیا۔ پہلے سور کی پیروی میں وہ بھی شہتیر پر چڑھ گیا، اسی کی طرح درمیان میں پہنچ کر پھسلا اور نیچے گر پڑا۔ ان دو کے بعد تیسرا آیا اور اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ بے چارے!۔ ملازمین یہ بتانے سے قاصر تھے کہ سوری کے بعد دیگرے اکٹھے یا خاصے وقفے وقفے سے آئے تھے، لیکن ان کے پاؤں کے نشان جس انداز سے شہتیر کے درمیانی حصے سے غائب ہوئے تھے، اسے دیکھ کر وہ اتنا اندازہ لگا سکتے تھے کہ دراصل ہوا کیا تھا۔''

''انہیں چاہیے تھا کہ وہ دیکھ بھال کر چلتے۔'' بڑے لڑکے نے کہا۔

''انہیں چاہیے تھا کہ وہ دیکھ بھال کر چلتے۔'' چھوٹے لڑکے نے جگالی کی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ جو بعد میں آئے تھے، وہ اگر رک جاتے اور سوچتے نشان درمیان میں کہیں گم ہو گئے ہیں، آگے نہیں جا رہے، پھر شاید ان کا کچھ نہ بگڑتا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اتنی سوچ آئی ہی نہیں۔ خیر، چھوڑو، اب ہم بوڑھے شکاری کی کہانی شروع کرتے ہیں کہ اس کا جنگلی سور سے کیسے آمنا سامنا ہوا۔''

لڑکے اگلی جانب جھک گئے۔ کہانی کا یہی وہ حصہ تھا جس کا انہیں انتظار تھا۔

''ایک روز شکاری پہاڑوں پر چڑھ گیا۔ وہاں اس کی نظر سوروں کے بھٹ پر پڑی۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، یہ سرکنڈوں سے بنا ہوا تھا۔ وہ واپس آ گیا اور اپنے تین دوستوں کو اس کے متعلق بتایا۔ ان چاروں نے اپنے منصوبے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور چپکے چپکے شکار کی تیاری شروع کر دی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک سور کو

ہلاک کرنے کے لئے آدمی کو کم از کم تین چار شکاری دوستوں کی مدد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر آدمی اکیلا ہی اس مہم پر روانہ ہو جائے، سور بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکار کے روز............ اتنا یاد رکھو کہ جب یہ واقعہ پیش آیا، شکاری ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا تھا جتنا کہ وہ اب ہے............وہ چاروں علی الصبح پہاڑوں کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد انہیں معلوم ہوا کہ شکاریوں کا ایک اور گروہ، جسے کسی نہ کسی طرح ان کے منصوبے کی بھنک مل گئی تھی، ان سے پہلے ہی نازل ہو چکا ہے۔ تاہم جب وہ خود منزل مقصود کے قریب پہنچے، وہ اپنے حریف گروہ کی آمد کے متعلق لاعلم تھے۔ یوں وہ مزے مزے سے جھاڑیوں کے بیچوں بیچ خاصی دور تک سوروں کے بھٹ کی طرف چلتے رہے۔ ان کے راستے میں ایک پست قامت تقریباً عمودی چٹان آئی اور وہ اس پر چڑھنے لگے کہ ناگاہ انہیں کسی کے ہانپنے اور پھر (گولی چلنے کی) دھماکہ خیز آواز سنائی دی۔''

اس طرح بنتے ہوئے جیسے وہ خود شکاری ہو اور چٹان کے اوپر چڑھ رہا ہو، باپ نے اپنے سر کو پچھلی جانب جھٹکا دیا۔

''عین اس وقت جب بوڑھا شکاری رینگتا رینگتا چٹان کی چوٹی پر پاؤں رکھا چاہتا تھا، اسے بالکل اپنے سامنے ایک عظیم الجثہ سور دکھائی دیا۔ بے خبری میں پکڑے جانے کا محاورہ ایسے ہی موقعوں پر تو استعمال ہوتا ہے! وہ اور اس کے ساتھی تو یہ فرض کر کے آئے تھے کہ سور اپنے بھٹ میں گہری نیند سو رہے ہوں گے! لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ جونہی بوڑھے شکاری کی نظر سور پر پڑی، اس نے جھٹ پٹ اپنا سر نیچے جھکا لیا اور رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا جو اس کی پشت پناہی پر لٹک رہی تھی۔ خود سور بھی اتنا ہی چونک چکا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی پھرتی دکھائی اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔''

اب باپ جنگلی سور کا پارٹ ادا کرنے لگا۔ وہ یوں اگلی جانب جھکا جیسے وہ اپنا سر چٹان کے اوپر دھکیلنا چاہتا ہو۔ پھر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''شکاری نے سوچا کہ سور نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ جس راستے سے آیا ہے، اسی پر واپس چلا جائے گا اور اگر خود اس نے پھرتی نہ دکھائی، وہ اس کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ گرتا پڑتا بھاگم بھاگ اس کا تعاقب کرنے لگا۔

لیکن یہ کیا؟ فضا میں سرسراہٹ سی سنائی دی تھی............ اچانک سور اسے اپنیسر

کے قریب دیوانہ وار بھاگتا دکھائی دیا۔ پھر اس نے چٹان کے ساتھ زبردست ٹھوکر کھائی اور پھر اس کے ساتھ ہی برق رفتاری سے پھسلتا نیچے جھاڑیوں میں جا گرا۔ جب شکاریوں نے مڑ کر دیکھا، جہاں سور گرا تھا وہاں انہیں صرف ٹوٹی پھوٹی شاخیں نظر آئیں۔ جب ان کی نگاہوں نے مزید آگے تعاقب کیا، سور جھاڑیوں میں یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے دہی میں مدھانی پھرتی ہے۔''

''واہ!'' بڑے لڑکے کے منہ سے نکلا۔

چھوٹا لڑکا گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ بس ٹکر ٹکر اپنے باپ کو دیکھے جا رہا تھا۔

''دراصل ہوا یہ تھا کہ دوسرے شکاری، جو ان سے پہلے پہنچ گئے تھے، سور پر گولی چلا کر اسے ہراساں کر چکے تھے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس نے بے چارگی کے عالم میں اتنی زبردست چھلانگ لگائی تھی۔ چنانچہ جب شکاری نے سوچا کہ سور اچانک دوسری طرف چلا گیا ہے، وہ دراصل پیچھے ہٹا تھا تاکہ وہ دوڑ کر چھلانگ لگا سکے۔'' باپ بولتے بولتے ہنسنے لگا۔ پھر اس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی اور کہانی ختم کرتے ہوئے بولا، ''شکاری نے مجھے بتایا کہ ہفتہ دس دن بعد کسی دوسرے شکاری نے اس سور کو ہلاک کر دیا تھا اور یہیں کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔''

اپنے موجودہ مکان میں منتقل ہونے سے پہلے وہ جس شہر میں رہتے تھے، وہاں سے ان کا چچا انہیں ملنے آیا۔ وہ اپنے ساتھ بچوں کے لیے اخروٹوں کی تھیلی لایا تھا۔

''کتنا اچھا تحفہ ہے!'' بعد میں باپ نے کہا۔ ''ہم خود اخروٹ نہیں خرید سکتے .... یہ بڑی فضول خرچی ہوتی لیکن جس شخص کے بچے ہوں اور اخروٹ اسے تحفے میں مل جائیں، پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ صحیح معنوں میں دوسروں کے کام آنا اسے ہی کہتے ہیں، خیر، شکر ہے ہمیں کھانے کو ایسی چیز مل گئی ہے جو ہم خود نہیں خرید سکتے تھے۔''

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اخروٹ تقسیم کیسے کئے جائیں۔ آخری فیصلہ ماں نے کیا: ''بیٹی کو سات، بڑے بیٹے کو پانچ اور چھوٹے کو تین ملیں گے۔ باقی بچیں گے دو اور یہ دونوں ماں باپ آپس میں بانٹ لیں گے۔

بڑا بیٹا ہتھوڑی لے آیا اور اس نے اپنا حصہ منٹوں میں ختم کر دیا۔ ماں نے اخروٹ توڑنے میں چھوٹے لڑکے کی مدد کی اور اس نے بھی انہیں ٹھکانے لگانے میں کوئی دیر نہ کی۔ ماں نے اگلی دوپہر تک انتظار کرنا مناسب خیال کیا جب وہ اکیلی چھوٹے بیٹے کے ساتھ گھر پر ہوگی۔ ماں نے اپنا اخروٹ جیب میں ڈال لیا اور اگلے روز کہیں گنوا دیا۔

لڑکی نے فیصلہ دیا کہ وہ اپنا حصہ چند دن تک بچا کر رکھے گی۔ اس نے اپنے اخروٹ اپنی ڈیسک کی دراز میں رکھ دیئے اور ایک ایک کر کے ان کی جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔ وہ انہیں پوری طرح چمکانا چاہتی تھی۔

چند دنوں بعد جب وہ سکول میں اپنی دو بہترین سہیلیوں سے ملی، اس نے انہیں ان کے متعلق بتایا۔ ''میرے چچا ہمیں ملنے آئے تھے اور وہی یہ تحفہ دے گئے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں اخروٹ پسند ہیں؟ میں چند ایک کل لے آؤں گی۔''

''بالکل۔'' ان دونوں کو اخروٹ پسند تھے۔

''میں دونوں کو ایک ایک دوں یا دو دو؟'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اگر میں نے انہیں دو دو دیئے، وہ انہیں آپس میں رگڑنے اور سمع خراش آوازیں پیدا کرنے لگیں گی۔ یوں وہ خوب لطف اندوز ہوں گی۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں انہیں دو دو دے دیتی ہوں، پھر میرے پاس آدھے سے بھی کم رہ جائیں گے۔'' وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے اپنی تجویز پسند آئی ہے۔ جب وہ دراز کھولتی اور اس کی نظر اخروٹوں پر پڑتی، اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ''اور اگر صرف تین رہ گئے، پھر سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ اپنی سہیلیوں کو صرف ایک ایک پر ٹرخا دے، پھر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہتر تو یہ ہے کہ دو دو دے دیئے جائیں۔ مگر اگر صرف ایک ایک دیا جائے تو کچھ نہ دینے سے یہ بھی بہتر ہی ہوگا۔''

جب وہ اگلے روز سکول جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، اس نے دراز سے چار اخروٹ نکالے اور اپنی سکرٹ کی جیب میں رکھ لیے۔

سکول میں اچانک اس کا سامنا ایک سہیلی سے ہو گیا۔ ''میں اخروٹ لے آئی ہوں۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ وہ اسے ایک دے گی یا دو۔

''یہ رہا۔'' اس نے ایک اخروٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''شکریہ'' اس کی سہیلی نے احسان مندی سے کہا۔

اس سہ پہر وہ اپنی دوسری سہیلی ایکوکو کے ساتھ واپس گھر جا رہی تھی۔ جب وہ سکول کے پھاٹک میں سے باہر نکل رہی تھیں، اس نے اسے بھی ایک اخروٹ پکڑا دیا۔

''شکریہ!'' ایکوکو نے کہا۔

''ذرا اس طرح کر کے دیکھو۔ بڑا لطف آتا ہے۔'' اس نے جیب سے دوسرے دونوں اخروٹ نکالے اور انہیں آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

''یہ تو واقعی بہت اچھا ہے۔'' ایکوکو نے کہا۔ لڑکی نیا پنا ایک اخروٹ ایکوکو کو عاریتاً دے دیا۔ ایکوکو چلتے چلتے کچھ دیر دونوں اخروٹ ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتی رہی۔ پھر اس نے دوسرا اخروٹ واپس کر دیا جو اس نے ادھارا لیا تھا۔

''اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے'' لڑکی نے بعد میں اپنے باپ کو بتایا، ''کہ ایک روز ہم ایک ایسی جگہ چلے گئے جہاں چند اشخاص سڑک بنا رہے تھے۔ اخروٹ ابھی تک ہمارے ہاتھوں میں تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ میرا ان پر کوئی خاص دھیان نہیں تھا کیونکہ ایکوکو ایکا ایکی کہنے لگی تھی، اری! تم نے ایک اخروٹ گرا دیا ہے۔'' چنانچہ ہم اسے تلاش کرنے جھٹ پٹ واپس مڑ گئے۔ اندازہ لگائیں کیا ہوا ہوگا! ابھی ہم نے پانچ چھ قدم بھی نہیں اٹھائے ہوں گے کہ ایک مزدور ہم سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا، میں شرط لگانے کو تیار ہوں تم اپنا اخروٹ ڈھونڈ رہی ہو۔ کیوں، ٹھیک کہا نا میں نے؟''اور پھر وہ کھیسیں نکالنے لگا۔ اس نے ہنستے ہنستے بتایا کہ وہ تو اسے کھا بھی چکا ہے اور وہ ہمیں اس کا خول دکھانے لگا جو درمیان میں ٹوٹا ہوا تھا۔

''اور مغز غائب ہو چکا تھا؟''

''ہوں۔''

''وہ اسے ابھی تک چبا رہا تھا؟''

''نہیں۔ وہ اسے چبا نہیں رہا تھا۔ وہ پہلے ہی چبائے بغیر نگل چکا تھا۔ اسے دو سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔''

''اوہ!''

''میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس نے اتنا سخت اخروٹ توڑا کیسے۔ دانتوں سے! ہم نے اس سے کہا، تم بہت گھٹیا آدمی ہو۔ اور گھر چلی آئیں۔ مگر سچ پوچھیں تو ہم غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔''

''میں اس کا تصور کر سکتا ہوں۔'' اس کے باپ نے اتفاق میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولا، ''میرا خیال ہے کہ اخروٹ لڑھکتا لڑھکتا بالکل اس کے سامنے پہنچ گیا ہوگا................ اور اتفاق سے وہ ادھر ہی دیکھ رہا ہوگا۔''

معلوم ہوتا تھا کہ گولڈ فِش اس وقت کے مقابلے میں، جب وہ پہلے پہل خاندان میں آئی تھی، اب خاصی بڑی ہو چکی تھی۔ اس کا پیٹ بڑھ گیا تھا اور ہلکی گلابی چتیوں کی رنگت گہری ہو چلی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ بالغ ہوتی جا رہی ہے۔ اسے کھڑکی کی روشن دہلیز پر رکھے پیالے میں تیز تیز تیرتے دیکھ کر سب کے دل مسرت سے اچھلنے لگتے تھے۔

''میرا خیال ہے ہم نے اتنی اچھلنے کودنے والی گولڈفش پہلے کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔'' ماں نے کہا۔

''ہاں۔ ہمیں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرنا چاہیے۔'' باپ نے کہا۔ ''ہمیں امید کرنا چاہیے کہ وہ سدا ایسے ہی رہے گی۔''

ہر دوسرے دن ماں تقریباً آدھا پانی تبدیل کر دیتی اور ذرا سا نمک بھی چھڑک دیتی۔ وہ ہر تیسرے دن مچھلی کو ڈبل روٹیوں اور نمکین یا میٹھے بسکٹوں کے بھورے کھلا دیتی۔ جب بچے مچھلی کو ڈبل روٹیوں اور نمکین یا میٹھے بسکٹوں کے بھورے کھلا دیتی۔ جب بچے مچھلی کو کچھ کھلانا چاہتے، وہ ان کی باریک خود طے کرتی اور دنوں کا حساب رکھتی تا کہ اسے یقین رہے کہ وہ اسے ضرورت سے زیادہ یا بار بار کچھ نہ کھلاتے رہیں۔

مچھلی کے معاملے میں باپ کوئی مدد نہیں کرتا تھا، لیکن کبھی کبھار وہ بچوں کے سٹڈی روم میں چلا جاتا اور اسے اپنے پیالے میں گھومتے پھرتے دیکھتا رہتا۔ ''کتنا توازن ہے!'' وہ حیرت سے سوچتا۔ وہ اپنے چانوں کو معمولی سے جھٹکا دے کر اور اپنی دم کو ذرا سا

مروڑ کر جب تک جی چاہے، اپنے آپ کو بالکل ساکن رکھ سکتی تھی۔ نہ آگے حرکت کرتی تھی اور نہ پیچھے۔

وہ اور بچے حال ہی میں دوسری مرتبہ تالاب کا چکر لگا چکے تھے۔ تاہم اس مرتبہ ان کی ٹین کی بالٹی بے کار ثابت ہوئی کیونکہ وہ ایک بھی مچھلی پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔ صرف وہی خالی ہاتھ واپس نہیں آئے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ دونوں تالابوں پر کسی بھی شخص کی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔

جوں جوں شام قریب آتی گئی، تالاب پر فضا سوگوار سے سوگوار تر ہوتی چلی گئی۔

''اس مرتبہ کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔'' باپ نے آہ بھر کر کہا۔'' ایک بھی تو ایسا شخص نظر نہیں آ رہا جس کے ہاتھ کچھ آیا ہو۔'' چارے ک یتبدیلی بھی کوشش کا ضیاع معلوم ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ جما رہا تا آنکہ وہ میعاد گزر گئی جس کے اس نے پیسے دیئے تھے۔

پچھلی مرتبہ انہوں نے جو مچھلی پکڑی تھی، وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ بیش بہا بن گئی۔ صرف ایک مچھلی پکڑنے اور بالکل ہی کچھ نہ پکڑنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے جو واحد مچھلی پکڑی تھی، وہ قدرت کا خاص عطیہ تھی۔ ایک بوڑھا شخص، جس کے سر پر شکاریوں کی ٹوپی تھی، اپنا مچھلی پکڑنے کا سامان سمیٹنے لگا۔''اچھا ہوتا اگر آج میں نہ آتا۔'' وہ اپنی روانگی پر چڑچڑے پن سے بڑبڑا رہا تھا۔''جب پوربی ہوا چل رہی ہو، مچھلی شاذ ہی ملتی ہے۔'' چند منٹ بعد سب لوگ چونک گئے۔ دوسرے تالاب پر ایک لڑکا، جو اپنے باپ کو مچھلی پکڑتے دیکھ رہا تھا، زور شور سے چھینٹے اڑاتا پانی میں گر پڑا۔ شکاری نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگا دی اور سب کی نگاہیں اس کی جانب گھوم گئیں۔ لڑکا، جس کا جسم گردن تک پانی سے شرابور ہو چکا تھا، تقریباً دس سال کا معلوم ہوتا تھا۔

تالاب پر جو چند بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے، ان میں ہلکی پھلکی ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔ فضا پر جو گمبھیرتا چھا چکی تھی، اس واقعے سے وہ ناپید ہو گئی اور ہر شخص دوبارہ ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔

ہوا یہ تھا کہ اس سہ پہر کے بیکار گزرنے پر اس آدمی پر مایوسی اور تھکن غلبہ پانے

لگی تھی اور اسے اونگھ آ گئی تھی۔ اسی کیفیت میں اس کا جسم اپنے بیٹے پر ڈھلک گیا۔ لڑکا بھوکلا گیا، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پانی میں گر گیا۔

جب مچھلی پکڑنے کے بجائے اس شخص کو اپنے بیٹے کو پانی سے نکالنا پڑا تو اس کا سارا شوق جاتا رہا۔ جب وہ اپنے گھر کی جانب روانہ ہوئے، سورج خاصا نیچے آ چکا تھا۔ بے چارہ لڑکا چھپ چھپ کرتا بے ہنگم انداز سے اپنے باپ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

''پتا نہیں اس چیز میں خرابی کیا ہے۔'' باپ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔''کسی نہ کسی طرح پھول تو اس پر اگ آتے ہیں لیکن نظریہ ہمیشہ بے ترتیبی سے پھیلا ہوا آتا ہے۔''

اتوار کی صبح وہ لائی لک (Lilac) کی جھاڑی کا قریب سے جائزہ لینے صحن میں آ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں لمبی، لاغر اور ناتواں شاخوں سے مہین سرخ پھولوں تک اور وہاں سے پودے کے نیچے زمین کی جانب گھوم گئیں۔

پودا پانچ سال قبل لگایا تھا۔ اس وقت انہیں اس مکان میں منتقل ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب یہ اس کے اپنے قد سے ذرا اونچا ہو گیا، اس کا مزید بڑھنا رک گیا۔ اس کا بڑا تنا کبھی نہ بن سکا۔ اس کی بجائے یہ جڑ سے ذرا اوپر بے شمار چھوٹی چھوٹی شاخوں میں منقسم ہو گیا جو آسمان کی جانب پنکھے کی صورت میں پھیل گئی تھیں۔

شروع میں اسے امید تھی کہ یہ کسی روز اتنا تناور اور لمبا چوڑا ہو جائے گا کہ جب بچے آنکھ مچولی کھیلا کریں گے تو وہ اسے میں چھپ سکیں گے۔ مگر اب اس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ ابھی لائی کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اسے گلی گلی گھومنے پھرنے والے موسیقاروں کا طائفہ دکھائی دیا۔ سب سے آگے جو شخص آ رہا تھا، وہ موسیقی کی سنگت میں ادھر ادھر کلیلیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی دائیں کبھی بائیں مڑ جاتا۔

''وہ اس قسم کی حرکتوں سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے رکھتا ہے۔ باپ نے سوچا۔ اگر وہ عام انسانوں کی طرح چلے، پھر دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہو گا۔''

باپ آہنی تاروں کی باڑ کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہاں سے وہ ناچنے والے کی حرکات

بغور دیکھتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ نچنیا مرد نہیں، عورت ہے اور عورت بھی بالکل مریل سی۔ وہ مردانہ کپڑوں میں ملبوس تھی اور اس نے اپنے چہرے پر سفید میک اپ کی تہہ جما رکھی تھی۔

اس کے پیچھے پیچھے اسی قسم کے لباس اور میک اپ میں ایک اور نچنیا تھا لیکن یہ عورت نہیں بلکہ فی الواقع مرد تھا۔ اس مرد کے عقب میں ایک اور عورت تھی۔ اس کے سر پر کپڑے کی گول ٹوپی تھی اور وہ ولایتی باجا کلارنٹ بجا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ڈھولکیا تھا۔ اس کی ننھی منی ڈھولک ہندی ٹمٹم سے مشابہ تھی۔ اس نے ڈھولک چھاتی کے ساتھ باندھی ہوئی تھی اور وہ اسے ضرورت سے زیادہ زور لگا کر پیٹ رہا تھا۔ سب سے آخر میں ترم بجانے والا تھا۔ وہ بحری جہازوں پر ریڈیائی پیغام بھیجنے اور وصول کرنے والوں کی وردی پہنے ہوء تھا۔

جلوس رک گیا۔ تینوں سازندے اپنے اپنے ساز بجاتے رہے جب کہ دونوں ناچنے والے ایک گھر سے دوسرے گھر جاتے اور دستی اشتہار تقسیم کرتے رہے۔

بڑا لڑکا تماشا دیکھنے گھر سے باہر آ گیا اور سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ ڈھولکیا اس کے قریب پہنچا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ لڑکا حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا تاہم اس کے ہونٹوں نے کوئی حرکت نہ کی۔

''اس نے جواب کیوں نہ دیا؟'' باپ نے سوچا۔ ''اس شخص نے کیا کہا ہو گا؟''

طائفہ آہستہ آہستہ دوبارہ آگے بڑھنے لگا اور لڑکا واپس صحن میں آ گیا۔

''ڈھولچی نے تم سے کچھ کہا تھا؟'' باپ نے پوچھا۔

''ہوں۔''

''اس نے کیا کہا تھا؟''

''میں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس رکھی تھیں۔'' لڑکے نے کہا۔ ''میں انہیں کبھی باہر نکال لیتا اور کبھی دوبارہ اندر ٹھونس لیتا۔ میں صحیح معنوں میں اونچی اور صحیح معنوں میں دھیمی دھنیں سننا چاہتا تھا۔'' اس نے اپنی گفتگو کے دوران میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بھی دکھائیں۔ ''چنانچہ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے اسی طرح اپنے کان بند رکھنا ہیں تو مجھے ان کے قریب نہیں آنا چاہیے بلکہ کہیں اور چلے جانا چاہیے۔''

''سمجھا۔'' باپ نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے وہ سمجھتا تھا کہ مجھے ان کے سُر پسند نہیں آئے۔'' لڑکے نہ جھکتے ہوئے کہا۔

اتوار کی شام باپ نے اپنی سکیچ بک نکالی اور اپنی بیٹی کی تصویر بنانے لگا۔ وہ غسل سے ذرا جلدی فارغ ہوگئی تھی اور سونے کے لیے تیار تھی۔ تاہم وہ تنکوں کی چٹائی پر بیٹھ گئی اور کتاب پڑھنے لگی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کا باپ کیا کر رہا ہے اور اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنی جگہ ہلے جلے نہیں، تاکہ اس کے باپ کو تصویر کشی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

''تمھیں اڑکانت تو محسوس نہیں ہو رہی؟'' باپ نے کچھ دیر بعد بیٹی سے پوچھا۔

''نہیں، کوئی خاص نہیں۔'' وہ اپنی ٹانگیں ایک طرف جھکائے بیٹھی تھی اور کھلی کتاب اس کی گود میں پڑی تھی۔ ایک پاؤں کا انگوٹھا دوسرے گھٹنے کے عقب میں سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس کا باپ اسی انگوٹھے کا سکیچ بنانے لگا۔

''نہیں۔ میرا خیال ہے یہ کچھ زیادہ ہی بڑا ہے۔'' اس نے زیادہ تر اپنے آپ سے کہا۔

''کیا بڑا ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''تمہارے پاؤں کا انگوٹھا۔''

''بڑا بدتمیز ہے۔ اسے اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بے اختیار بچگانہ انداز سے ہنطسنے لگی۔

''تمھیں اپنے دادا یاد ہیں؟'' باپ نے اگوٹھے کو مسلتے ہوئے کہا۔

''تھوڑے تھوڑے۔'' اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

''مجھے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب انہوں نے مجھے تمہارے پاؤں کی تصویر بنانے کا مشورہ دیا تھا۔''

''میرے پاؤں کی؟''

''ہوں۔''

''پر کیوں؟''

''یہ تب کی بات ہے جب تمہیں پیدا ہوئے ابھ یا یک دو دن ہی ہوئے تھے۔''

''میرے ہی پاؤں کیوں؟''

''ان کا خیال تھا انہیں بعد میں دیکھ کر بہت لطف آیا کرے گا۔'' وہ دوبارہ انگوٹھے کا خاکہ بنانے لگا۔''اس وقت میرے پاس اپنی ایڈریس بک کے سوا اور کچھ نہیں تھا، چنانچہ میں نے اسی میں چھوٹا سا سکیچ بنا لیا۔تمہارے پاؤں کے صرف تلوے۔ میرا خیال ہے وہ ایڈریس بک کہیں کھو چکی ہے۔''

''یہ تو بڑی بری بات ہوئی۔''

''کاٹ یہ ہمارے پاس ہوتی۔ اگر تم اسے دیکھ سکتیں، تم بہت لطف اندوز ہوتیں۔ مجھے چیزیں گنوانے میں جو ملکہ حاصل ہے، اس پر میں سوچتا ہوں کیا تمہارے دادا واقعی سمجھتے تھے کہ میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھ سکوں گا.......... ہونہہ، میرا خیال ہے اس طرح سوچنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے جس ہاتھ میں کاپی پکڑ رکھی تھی، وہ اس کی پوزیشن درست کرنے لگا۔''مجھے یاد ہے دادا ہسپتال کا کمراہ دیکھ کر کتنے متاثر ہوئے تھے۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے، یہ رہائش کے لیے بہت اچھا ثابت ہو گا۔انہیں چاہیے کہ یہ ہمیں کرائے پر دے دیں۔''

''میں اپنی ٹانگیں ذرا ہلا جلا سکتی ہوں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''بالکل، ہلا لو۔ وہ واقعی بہت بڑھیا کمرا تھا: پرسکون، مطالعے کے لیے بالکل موزوں۔ کھڑکی کا رخ نرسوں کی ڈورمٹری (Dormitory) کی طرف تھا اور کبھی کبھار ہمیں کوئی نرس سڑک پر بھاگتی نظر آ جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ صدر دروازے کے قریب بہت بڑا پالونیا (Paulownia) کا درخت تھا.......... یہ میری انگلیاں سیدھی کیوں نہیں رہتیں؟ میں ان سے جتنا زیادہ کام لیتا ہوں، یہ اتنی یہ خراب ہو جاتی ہیں۔''

لڑکی نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اس نے ایک نظر اپنے باپ کی سکیچ بک پر ڈالی۔

''اس روز'' باپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا،'' جب میں ہسپتال سے نکلا، میرا سامنا تمہارے دادا سے ہو گیا۔ وہ بارش میں بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے سر پر

ہیٹ تو تھا لیکن چھتری نہیں تھی۔ وہ تمہاری امی کو دیکھنے آئے تھے۔ ہم ایک دو منٹ باتیں کرنے کے لیے چھجے کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ تمہیں معلوم ہے انہوں نے کیا کہا ہو گا؟ وہ اپنی زندگی میں زچگی کے وارڈ میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے کبھی ایسی عورت سے ملنے نہیں آئے تھے جو ابھی ابھی کسی بچے کی ماں بنی ہو۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان کے ساتھ واپس ہسپتال چلوں گا۔ بعد ازاں جب ہم واپس جا رہے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر نئے دن کے ساتھ بچے کی قوت مزاحمت اور زندہ رہنے کی طاقت بڑھتی رہتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں تمہیں اپنی امی کا دودھ پلوانے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ جونہی تم چوچی منہ میں لیتیں، تم پر غنودگی طاری ہو جاتی۔ نرس تمہارا کان بھی مروڑتی، لیکن تم پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم تمہارا کریں کیا۔''

لڑکی کھسیانی ہو کر زیر لب ہنسنے لگی۔

''سوچیں آج ہمیں سکول میں کیا ملا ہو گا'' لڑکی نے کھانے کی میز پر کہا۔

''چھچھوندر۔ ہم پھولوں کی کیاری کی کھدائی کر رہے تھے اور......''

''ایک اور چھچھوندر!'' ماں نے کہا۔ ''ایک کل تمہارے بھائی کو ملی تھی۔ وہ دروازے میں داخل ہوا ہی تھا اور مجھے اتنا بھی موقعہ نہیں مل سکا تھا کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ کر سکتی کہ سکول میں اس کا دن کیسے گزرا ہو گا کہ وہ اس مکروہ مخلوق کو میری ناک کے سامنے لہرانے لگا اور کہنے لگا امی! دیکھیں، میں آپ کے لیے تحفہ لایا ہوں۔''

''اگر آپ لوگ موجود ہوتے تو دیکھتے یہ کیسے اچھل رہی تھیں۔'' لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو، میں واقعی اچھل پڑی تھی۔ مجھے کتنی مرتبہ تمہیں سمجھانا ہو گا؟ تم جو چاہو دو گھر کے پھاٹک تک لا سکتے ہو لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تم طرح طرح کے کیڑے مکوڑے لے کر اندر چلے آؤ۔''

''مجھے اف اف! افسوس ہے۔''

''تمہیں کیاری میں جو چھچھوندر ملی تھی، تم نے اس کا کیا کیا؟'' باپ نے پوچھا۔

''مجھے ریت کی بالٹی سے ملی تھی۔'' لڑکے نے کہا۔

''ریت کی بالٹی؟ تمہارا مطلب ہے تم اسے سکول سے اٹھا کر گھر لے آئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''ہمیں جو کیاری سے ملی تھی، ہم نے اسے اٹھایا'' لڑکی نے کہا، ''یوں پکڑا اور اس سے پوچھنے لگے، فلاں کا دماغ کتنا بڑ۔ بڑ۔ بڑا ہے؟'' وہ ہر سوال پر حیران رہ جاتی، پھر تیزی سے ذرا دائیں یا بائیں گھوم جاتی اور اپنی اگلی ٹانگیں پھیلا دیتی۔''

''یہ بات کسے سوجھی تھی؟'' باپ جاننا چاہتا تھا۔

''اس کے متعلق ہم سب نے مل کر سوچا تھا۔ جب کوئی لڑکی اپنا نام لیتی تھی تو اس کا لہجہ بہت اونچا ہوتا تھا۔ کتنا بڑ۔ بڑ۔ بڑا؟'' وہ ب پر خاص طور پر زور دیتی تھی۔ اور چھچھوندر اپنی ٹانگیں خاصی دور تک پھیلا لیتی تھی، بالکل اس طرح ہے۔ لیکن جب کوئی لڑکی دوسری لڑکی کا نام لیتی تو مریل انداز سے پوچھتی ''کتنا بڑا؟'' اس مرتبہ اس نے اپنی آواز اتنی نیچی کر لی جیسے کسی کے ساتھ سرگوشی کر رہی ہو۔'' پھر اس کی ٹانگیں بس ذرا سا کھلتیں۔'' وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اپنے بازوؤں سے اس کا عملی مظاہرہ بھی کر کے دکھا رہی تھی۔

''تم یہ سب کچھ گھڑ رہی ہو؟'' ماں نے کہا۔

''میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ نظر یہی آتا تھا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ سن اور سمجھ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم بھی چھچھوندر کی نقل اتارنے اور اپنا نام پکارے جانے پر اپنے بازوؤں کو واقعی ایک دوسرے سے دور پھیلانے لگے۔''

''جیسے بیچاری چھچھوندر پہلے ہی کافی گھبرا نہیں چکی ہو گی۔'' باپ نے کہا۔

چھچھوندر حیرانی کے عالم میں جس طرح دائیں بائیں جھولتی تھی، لڑکی اس کا ذکر مزے لے لے کر کر رہی تھی اور اس کی بات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے ''کتنا بڑ۔ بڑ۔ بڑا'' کا ڈرامہ بار بار دہرایا۔ وہ چھوٹی لڑکی سے چھچھوندر اور چھچھوندر سے دوبارہ چھوٹی لڑکی بن جاتی۔ پھر وہ ہنستے ہنستے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

''کتنا بڑ۔ بڑ۔ بڑا؟'' بڑے لڑکے نے اپنی بہن کی طرح بازو لہراتے ہوئے کہا۔

''کتنا بڑ۔ بڑ۔ بڑا؟'' چھوٹے لڑکے نے اس کی نقالی کی۔

''ات۔اتنا بڑا۔''

''ات۔اتنا بڑا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ سب جب یہی حرکت کرنے لگے، باپ نے انہیں ذرا سا ڈانٹا۔'' بہت ہو گیا۔اب ہمیں ذرا کچھ دیر چپ چاپ بیٹھنا چاہیے۔''

اب بھی سکول کے صحن میں، جہاں بچے دن کے دوران میں کھیلتے رہے تھے، چھچھوندریں پھولوں کی کیاریوں اور ریت کی بالٹیوں میں کھدائی کر رہی ہوں گی۔

کھڑکی کی چوڑی دہلیز پر، جہاں گولڈفش کا پیالہ دھرا ہوا تھا، دو کھلونے پڑے تھے۔ ان میں سے ایک شیر اور دوسرا خرگوش تھا۔ دونوں کو کپڑے میں روئی یا اون بھر کر بنایا گیا تھا۔ شیر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اس کی ٹانگیں آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کا سر آگے کو ڈھلکا ہوا تھا، چنانچہ اس کی ناک تقریباً فرش کو چھو رہی تھی اور وہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کسی جفاکش چیونٹی کی حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لے رہا ہو۔ خرگوش نے چتی دار آرائشی کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ وہ پشت کے بل لیٹا ہوا تھا اور آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

دن کے دوران میں یہ جانور اسی طرح کھڑکی کی دہلیز پر لیٹے رہتے تھے رات کے وقت بچے انہیں اپنے بستروں پر لے جاتے تھے۔ چھوٹے بچے کے حصے میں ہمیشہ خرگوش آتا تھا۔ اس معاملے میں کبھی اختلاف رونما نہیں ہوتا تھا۔ شیر کو بڑا لڑکا اور لڑکی باری باری اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ بعض اوقات ان میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ ایک کہتا،''آج میری باری ہے'' جب کہ دوسرا اپنا حق جتلانے لگتا۔

ایک روز جب باپ راہداری کے اختتام پر اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا، اس کے کانوں میں بڑے بچوں کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں پڑیں۔ یہ آوازیں اتنی اونچی تھیں کہ معلوم ہونے لگا نوبت مار کٹائی تک پہنچ جائے گی۔ چند سیکنڈ بعد ماں نے مداخلت کی۔''خیر، یہ بتاؤ یہ پرسوں کس کے پاس تھا؟ اور کل؟ نہیں، تم دونوں کو قاعدہ اچھی طرح معلوم ہے............فروگزاشت کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

جیسا کہ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکی تھی، وہ اب پھر انہیں سمجھا رہی تھی کہ اگر کوئی

باری کھوتا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ وہ اگلے دن یہ نہیں کہہ سکتا کہ آج میری باری ہے۔ اگر انہیں اس کی اجازت دیدی گئی، پھر وہ اپنی باقاعدہ باری کبھی نہیں لے سکیں گے اور یوں ان کے جھگڑے بھی کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اگر کسی سے بھول ہو جاتی ہے، یہ بات قابل افسوس تو ہے، لیکن اسے اپنی باری کا اگلے روز تک انتظار کرنا پڑے گا۔

''اس کا آغاز کیسے ہوا تھا؟'' باپ سوچنے لگا۔ ''ان کے یہ جھگڑے کب سے جاری ہیں؟''

بعض اوقات کئی کئی دن گزر جاتے اور کسی بچے کو بھی شیر اپنے بستر پر لے جانا یاد نہ رہتا چونکہ دونوں میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ پچھلی مرتبہ اسے کون یا کب لے گیا تھا، ان کی ماں کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا کہ اس مرتبہ کس کی باری ہے۔ آخر کار حتمی طور پر طے کرنے کے لیے کہ کس روز کس بچے کی باری ہو گی، وہ کیلنڈر پر ان کے ناموں کے ابتدائی حروف لکھنے لگی۔

جب باپ بستر میں گھسا، وہ ناپسندیدگی سے اپنا سر ہلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی چیزوں کو اپنے بستروں پر کیوں لٹانا چاہتے ہیں۔ جب وہ خود بچہ تھا، وہ اکیلا ہی سویا کرتا تھا اور اس نے سوچے سمجھے بغیر یہ بات صحیح تسلیم کر لی تھی کہ باقی لوگ بھی یہی کرتے رہے ہوں گے۔

بچوں کا جھگڑا آخر ختم ہو ہی گیا۔ اس رات شیر نے لڑکی کے ساتھ سونا تھا۔

''خوش قسمت گدھی!'' لڑکا اونچی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

جب باپ نے اپنے سرہانے رکھی کتابوں میں سے ایک اٹھائی تو اس کے خیالات ایک اور روئی بھرے کھلونے کی طرف چلے گئے جو کسی زمانے میں ان کے پاس ہوا کرتا تھا۔ یہ کھلونا کتے کا پلا تھا۔ یہ نہ تو اتنا چھوٹا اور نہ اتنا نرم و گداز تھا جتنا کہ یہ شیر تھا جس پر ابھی ابھی بچے جھگڑ رہے تھے۔ اسے دس سال سے زیادہ عرصے کی وہ کرسمس صبح یاد آ گئی جب اسے اپنی ننھی منی بیٹی کے بستر کے ساتھ پلا کھڑا نظر آیا تھا۔ بچی کے ننھے منے جسم کے مقابلے میں یہ بہت قوی ہیکل اور مضبوط معلوم ہو رہا تھا۔

''آخر وہ اس قسم کی چیز کیوں خرید کر لائی ہے؟'' اسے یاد آیا اس نے کچھ اسی انداز سے سوچا تھا۔

''تب اس سے صرف چند منٹ پیشتر بھی وہ اتنا ہی حیران ہوا تھا جب آنکھ کھلنے پر اسے ایک ڈبا دکھائی دیا تھا۔ اس کے اوپر ربن بندھے ہوئے تھے اور وہ اس کے تکیے کے قریب پڑا تھا۔ اس میں فیلٹ ہیٹ تھا۔ اس کا نام فرانسیسی ڈرامہ نگار وکتوریاں ساغدو کے ڈرامے 'دفیدورا'' کے اسی نام کے ہیرو کی مناسبت سے فیدورا پڑ گیا تھا کیونکہ سب سے پہلے اسی نے یہ ہیٹ پہنا تھا۔ پھر فلمی اداکار ہنری بوگارٹ نے اسے مقبول عام بنا دیا تھا۔

کیا اس نے کہا تھا کہ اسے اس قسم کا ہیٹ چاہئے؟ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شاید اسی نے کسی وقت اس کا ذکر کر دیا ہو گا اور اس کی بیوی نے اس کی بات کو سنجیدگی سے لے لیا ہو گا۔ ہوسکتا ہے اس نے کسی شخص کو اس قسم کا ہیٹ پہنے دیکھا ہو اور اس نے اس کی تعریف کر دی ہو۔

اس قسم کے ہیٹ کتنے میں آتے ہیں؟ اس نے خود اس کے خریدنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا اور نہ کبھی یہ تصور کیا تھا کہ وہ اسے پہن کر دفتر جائے گا۔ چنانچہ اس کے پاس اس قسم کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ اس کی تلاش میں کسی ڈیپارٹمنٹ سٹور کے ہیٹ سیکشن کا تفصیل سے جائزہ لینے چل پڑے۔ اس کا ہیٹوں کے متعلق علم زیادہ تر کار ڈرائے کی ٹوپیوں تک محدود تھا جو وہ گرمیوں میں پہنا کرتا تھا لیکن یہ ٹوپی اس قسم کی چیز تھی جسے آدمی لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ اسے صحیح معنوں میں ہیٹ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جو واحد ہیٹ اس نے کبھی پہنا تھا، وہ تنکوں کا بنا ہوا تھا اور اسے وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں پہنا کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ دروازہ بند ہونے سے پہلے وہ جب ٹرین کے ڈبے میں داخل ہونے کے لیے اندھا دھند بھاگا کرتا تھا وہ اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ لیا کرتا تھا تاکہ وہ کہیں گر نہ پڑے۔

اسے معلوم تھا کہ سے یہ ہیٹ بہت سستا مل گیا تھا لیکن ہنری بوگارٹ کے انداز کے فیدورا ہیٹ تو بہت اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں۔ اس پر اچھی خاصی رقم صرف ہوئی ہو گی۔ اس کی بیوی نے اس سے مشورہ کیے بغیر اتنی پرتعیش اور مہنگی چیز کیوں خرید لی تھی؟ وہ خوب جانتی تھی کہ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں۔

اس نے بیٹھے بیٹھے نیا ہیٹ پہن کر دیکھا تھا۔ جس نرم ولطیف انداز سے اس نے اس کے سر کو دبایا تھا، وہ اسے پسند آیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے

پہننا کس طرح چاہیے۔ اگر اس نے اسے کچھ زیادہ ہی نیچے کھینچ لیا، اس کی کریز کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔ پھر یہ فیدورا نہیں، عام قسم کا باؤلر ہیٹ دکھائی دے گا۔ دوسرے لوگ اسے کیسے پہنتے ہیں؟ اب اسے زیادہ دھیان سے دیکھنا ہو گا۔

اس نے ہیٹ دبے میں رکھ دیا اور ڈھکن بند کر دیا۔

چونکہ اس روز چھٹی تھی، وہ چاہتا تو معمول سے زیادہ دیر تک سو سکتا تھا۔ لیکن ہیٹ کا غیر متوقع تحفہ دیکھ کر وہ پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اسے اٹھ ہی جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ اٹھ گیا تھا۔

صبح کا سکوت گھر پر حاوی تھا۔ باہر آسمان پر دبیز بادل منڈلا رہے تھے۔

صرف تب، جب اسے نہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بیوی اور بیٹی جاگ گئی ہیں یا نہیں، اپنا سر اندر کر کے جھانکا تھا، اسے پلے کی پہلی جھلک دکھائی دی تھی۔

وہ کئی لمحے اس کی پرشوکت جسامت اور خوبصورتی پر عش عش کرتا رہا۔ یہ پلا لاماً حیوانوں کے بادشاہ کی حیثیت سے راج کرتا رہے گا۔ اگر آدمی ایک مرتبہ اسے دیکھ لے، پھر اسے اس کے مقابلے میں باقی تمام کھلونے بالکل حقیر نظر آئیں گے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے بنایا ہی اس مقصد کی خاطر گیا ہے کہ طویل عرصے تک جوں کا توں رہے گا۔ اگر یہ بچے کو اپنی پیٹھ پر اٹھا لے تو بھی اس کا غالباً کچھ نہیں بگڑے گا۔

وہ ایک بار پھر سوچنے لگا تھا کہ اس کی قیمت کیا ہو گی۔ اگرچہ روئی وغیرہ سے بھرے ہوئے کھلونوں کے متعلق اس کا علم ہیٹوں سے بھی کم تھا، وہ اتنا ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ ہو گا بہت مہنگا۔ اس قسم کے کھلونے پر اتنی رقم بہاتے وقت اس کی بیوی کیا سوچ رہی ہو گی؟ انہیں گھر کے روز مرہ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے بڑا تردد کرنا پڑتا تھا، اس کے پیش نظر اس کی بیوی کو قدرے عقل سے کام لینا چاہیے تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ہلکی پھلکی ڈانٹ پلائے گا۔ دراصل اسے یہ کام ابھی اور اسی وقت کرنا ہو گا۔ اگر آج چھٹی کا دن ہے تو بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ معمول سے پہلے ہی تاخیر ہو چکی ہے، اسے اٹھ جانا اور ناشتہ تیار کرنا چاہیے۔

اس نے اس کا نام لے کر پکارا تھا، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی بلکہ اسی طرح بے سدھ پڑی رہی تھی۔ اس کی بیوی کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی شکل

صورت چغلی کھاتی رہتی ہے کہ وہ کبھی جی بھر کر نہیں سوئے۔ رات کو جونہی اس کا سر تکیے کو چھوتا ہے، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ اسے شاذ ہی کبھی خواب آتا ہے اور آنکھ تو اس کی کبھی کھلتی ہی نہیں۔ لیکن اگلی صبح جب الارم بجتا ہے یا وہ اسے آواز دیتا ہے، وہ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھتی ہے۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ جب سے ان کی شادی ہوئی ہے، اسے دو مرتبہ اسے آواز دیتا ہے، وہ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھتی ہے۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ جب سے ان کی شادی ہوئی ہے، اسے دو مرتبہ اسے آواز دینا پڑی ہو۔

''اجی سنتی ہو؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔'' اس نے دوبارہ کہا تھا اور اس کا کندھا جھنجھوڑنے آگے بڑھا تھا لیکن اچانک اس نے دیکھا تھا کہ آج وہ جس قسم کا لباس پہنے ہوئی تھی، عام طور پر وہ اسے پہنا نہیں کرتی تھی۔

جب اس صبح باپ لیٹا سوچ رہا تھا، ایک بار پھر اس کا دھیان پلے کی طرف چلا گیا۔ وہ اتنا ہی مضبوط اور سخت جان ثابت ہوا تھا جتنا کہ پہلی مرتبہ دیکھنے پر نظر آیا تھا۔ لڑکی کافی عرصے تک اس سے کھیلتی رہی تھی۔ وہ اس کے اوپر سوار ہو جاتی تھی اور اسے اس کے نرم و ملائم کانوں سے مضبوطی سے اپنی بچگانہ مٹھیوں میں کس لیا کرتی تھی۔ جب ان کا پہلا بیٹا پیدا ہوا، وہ بھی اس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ جب وہ اس کے اوپر نیچے جھول رہا ہوتا، اس کی مسرت دیدنی ہوا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بہن سے کم خوش نہیں۔ لیکن کھلونے کا کچھ نہیں بگڑا تھا، وہ بالکل نیا کا نیا ہی رہا۔

بعد ازاں جب وہ نئے مکان میں منتقل ہوئے، پلا بھی ان کے ساتھ آ گیا۔ باپ کو یاد آیا کہ اس نے دوسری اشیا کی طرح اسے بھی ڈبے میں بند کر دیا تھا۔

''تاہم فیدورا ہیٹ کی کہانی بالکل مختلف ہے۔'' اس نے آہ بھری۔ وہ تو اسے تقریباً فوراً ہی گنوا بیٹھا تھا۔ کسی سینما میں فلم کے دوران میں اس نے اسے گود میں رکھ لیا تھا، لیکن جب وہ واپسی کے ارادے سے اٹھا تھا، تو وہ اسے اٹھانا بھول گیا تھا۔ جب وہ سینما سے خاصا آگے نکل گیا تھا، تب اسے یاد آیا تھا لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ایک گیٹ کیپر نے اس کی بات توجہ سے سنی تھی اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ڈھونڈ کر لاتا ہے لیکن وہ خالی ہاتھ واپس آ گیا اور صرف اتنا بتا سکا تھا کہ اندر بہت بھیڑ ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب وہ اسے کبھی نہیں پا سکے گا۔

جب لڑکوں نے ایک شام پھر ''ک'' کا مطالبہ کیا تو باپ نے انہی بوڑھے شکاری کے متعلق ایک اور کہانی سنائی۔ ''شکار کے بعد'' اس نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا، ''بوڑھے کا دل پسند مشغلہ مچھلیاں پکڑنا ہے۔ وہ شکاری پہلے بنا تھا۔ اس اس کی مسیں بھی بھیگنے نہیں پائی تھیں کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ پہاڑوں کے چکر لگانے لگا اور اس نے چالی سال تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ پھر تقریباً تیس سال قبل وہ اس شہر میں منتقل ہو گیا۔ اسے یہ شہر اتنا پسند آیا کہ اس نے یہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ آج بھی یہیں رہتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے شکار کا شوق ترک کر دیا اور مچھلیاں پکڑنے کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ تب سے اس نے خاصا وقت قریبی دریا کے کنارے پر گزارا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے مچھلی کا شکار اس لیے شروع کیا تھا کیونکہ اسے دریا کا اچھا استاد مل گیا تھا۔''

''دریا کا استاد؟'' بڑا لڑکا ہنس پڑا۔

''ہاں۔ ممکن ہے تم نے صرف مدرسے کے استادوں کے متعلق سنا ہو لیکن دریا کے، بلکہ پہاڑوں اور سمندروں کے بھی استاد ہوتے ہیڑں۔ بہت عرصہ پہلے یہ دریائی استاد کی عمارتی لڑکی کا کاروبار کرنے والی کمپنی میں شہتیروں کو بہ حفاظت منزل مقصود تک پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب کمپنی کے کارندے پہاڑوں پر درخت کاٹتے ہیں، وہ شہتیروں کو اس طرح آپس میں باندھ دیتے ہیں کہ ایک قسم کا بیڑا بن جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ شہتیر دریا کے پانی میں بہائے جاتے ہیں، وہ ڈوبتے نہیں بلکہ تیرتے تیرتے آرا مشین تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ہر بیڑے کے اوپر ایک ملازم بھی بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بیڑے کو دریا کے تیز بہاؤں میں چٹانوں اور دوسری رکاوٹوں سے بچاتا صحیح سلامت اپنی منزل پر پہنچائے۔ یہ واقعی بڑا خطرناک کام ہے۔ دریائی استاد کچھ عرصہ تو یہ کام کرتا رہا۔ پھر وہ اکتا گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دریا کے کنارے واقع کسی شہر میں آباد ہو جائے گا اور مچھلیاں پکڑنے کا دھندا کرے گا۔ وہ دریا کو اتنی ہی اچھی طرح جانتا تھا جتنا کہ اپنی ہتھیلی کو پشت کو۔ وہ دوسروں کو صحیح صحیح بتا سکتا تھا کہ کس مقام پر کتنی مچھلیاں ہوں گی اور وہ کیا کر رہی ہوں گی یا دریا کے ساتھ ساتھ کس طرح

تیر رہی ہوں گی۔ وہ دریا کے ان مقامات میں بھی ان کی حرکات کے متعلق بتا سکتا تھا جو انتہائی گہرے ہوتے ہیں اور جہاں موجیں بیحد طوفانی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ مچھلیاں پکڑ رہا ہوتا اور وہ اس سے کہتا، ایک اور، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس مقام پر صرف ایک مچھلی باقی رہ گئی ہے اور اس کا دعویٰ درست ثابت ہوتا۔''

''واہ!'' بڑے لڑکے کے منہ سے نکلا۔

''واہ!'' چھوٹے لڑکے نے اس کی نقل اتاری۔

''یہ تو ناقابل یقین ہے۔'' پہلے نے مزید کہا۔

''شکرای کو بھی اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے کبھی ایسے شخص کا ذکر نہیں سنا تھا جو دریاؤں اور مچھلیوں کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہو۔ دریائی استاد کا نام کاتسوجیرو تھا لیکن چونکہ اس کے باپ کا نام کاتسوزو تھا، سب لوگ اسے کاتسوخورد کہتے تھے۔ جب شکاری کی اس سے ملاقات ہوئی، تب بھی لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے حالانکہ تب وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔''

جب باپ نے کاتسوخورد کہا، بڑے لڑکے کی ہنسی نکل گئی۔

''مسئلہ یہ تھا چونکہ کاتسو کو اپنی روزی کمانے کے لیے مچھلیاں پکڑنا پڑتی تھیں، وہ جو کچھ دوسروں کو بتاتا تھا، اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص پوچھتا اچھا شکار کہاں ملے گا، وہ جھوٹ بول دیتا اور اسے کسی ایسی جگہ بھیج دیتا تھا جہاں کچھ ہاتھ آنے کی خاص امید نہیں ہو سکتی تھی۔ شکاری اس کا بہترین دوست بن گیا اور ان کی آپس میں گاڑھی چھننے لگی۔ وہ تقریباً ہر رات اکٹھے مے نوشی کرتے لیکن وہ پھر بھی اس سے سیدھا جواب حاصل کرنے میں ناکام رہتا۔ مثلاً وہ اس سے پوچھتا، ''آج کا دن اچھا رہے گا؟'' اور کاتسوخورد فوراً جواب دیتا نہیں، مگر یہ بالکل جھوٹ ثابت ہوتا۔ جن دنوں کے متعلق اس کا جواب، نہیں، ہوتا، درحقیقت وہی بہترین ثابت ہوتے۔ چنانچہ شکاری اس کی نفسیات سمجھ گیا اور جو کچھ وہ اس سے سنتا، وہ اس کے بالکل الٹ کرتا۔ اگر وہ ''نہیں'' کہتا، شکاری دریا کی جانب چل پڑتا اور یقین کرو، کاتسوخورد وہیں موجود ہوتا۔''

''چنانچہ شکاری کو اس کی باتوں کا الٹا مطلب نکالنا پڑتا ہو گا۔'' بڑے لڑکے نے کہا۔

''تمہاری بات صحیح ہے۔ کاتسوخورد جیسے استاد سے آدمی کو اسی طرح سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود شکاری کے ساتھ بار بار داؤ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے نیا طریقہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ کاتسوخورد سے براہ راست کچھ پوچھنے کی بجائے وہ چھپ چھپا کر اس کے گھر پہنچ جاتا اور کنسوئیاں لینے لگتا کہ وہ گھر پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے ادھر ادھر گھومتا، محض جھپکی لیتا یا کچھ اور کرتا نظر آتا، وہ سمجھ جاتا دریا پر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیونکہ وہ سمجھ جاتا ہوگا کہ اگر وہ چلا بھی گیا، اسے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔'' لڑکے نے کہا۔

''ہوں۔ خیر، میں نے کہا تھا کہ کاتسو بکثرت جھوٹ بولتا تھا لیکن درحقیقت بعض ایسی چیزیں تھیں جن کے بارے میں غلط بیان نہیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً دریا میں جال کیسے ڈالنا ہے تاکہ یہ آپ کی مرضی کے مطابق کھل سکے۔ یا یہ کہ رسی کے ساتھ کانٹا باندھنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ یا یہ کہ آدمی ڈیس (Dace) مچھلی پکڑ رہا ہو اور اسے محسوس ہو کہ مچھلی نے کانٹے پر منہ مارا ہے، تو بجائے اس کے کہ آدمی فوراً رسی کھینچنے کی کوشش کرے، جیسا کہ اکثر لوگ کرتے ہیں، اسے چاہیے کہ وہ صبر سے کام لے اور اسے مزید ڈھیلی چھوڑ دے تاکہ مچھلی اچھی طرح پھنس جائے۔

''اسے شکاری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ کاتسوخورد نے اسے یہ باتیں صحیح صحیح بتا دیں، ورنہ اسے کبھی معلوم نہ ہو پاتا کہ صرف دریا سے اس مچھلی کو پکڑنے کا جو خاص جال استعمال کیا جاتا ہے، اسے کیسے پھینکنا چاہیے۔ یہ تقریباً پندرہ فٹ لمبا ہوتا ہے اور اسے صحیح طریقے سے کھولنا خاصا ٹیڑھا کام ہوتا ہے۔ اگر یہ پانی میں اس طرح سیدھی لائن بناتا چلا جائے'' اس نے اپنی انگلی سے لائن بنا کر کہا، مچھلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے اردگرد تیرتی رہیں۔ انہیں اس سے روکنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جال قوس بناتا پانی سے ٹکرائے۔ اس طرح'' اس نے بازو سے قوس بنا کر دکھائی۔

''اس طرح؟'' بڑے لڑکے نے اسی طرح کی قوس بنا کر کہا۔

''اس طرح؟'' اس کے بھائی نے اس کی نقل اتاری۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قوس بنانے سے جو فرق پڑتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مچھلی آسانی سے مڑ نہیں سکتی۔ چنانچہ جب وہ جال سے ٹکراتی ہے تو ذرا دائیں یا بائیں

بل کھاتی ہے اور دھکا مار کر سیدھا جانے کی کوشش کرتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر جال کے دونوں کناروں کو اس طرح قوس کی شکل دے دی جائے، پھر مچھلی اس کے عین درمیان میں چلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔'' اس نے یہ دکھانے کے لیے کہ مچھلی جال سے کیسے ٹکراتی ہے، اپنے بائیں ہاتھ سے پیالہ بنایا اور پھر اپنی دائیں انگشت شہادت اس میں دھکیل دی تاآنکہ وہ اس کے عین درمیان پھنس گئی۔لڑکوں نے بڑی وجہ سے اس منظر کو دیکھا۔

''لیکن اگر آدمی ان مچھلیوں کو اسی طرح چھوڑ دے، پھر وہ واپس مڑنے اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر لیتی ہیں۔ چنانچہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ایسا نہ ہونے پائے، بوڑھا شکاری پانی میں چھلانگ لگا دیتا ہے، اس کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا جال کے قریب پہنچ جاتا ہے اور ان کی ریڑھیں توڑنے لگتا ہے۔

''ریڑھ کیا ہوتی ہے؟'' بڑے لڑکے نے پوچھا۔

''بالکل یہاں۔'' باپ نے اپنی گردن کی پشت کو تھپکاتے ہوئے کہا۔''پھر جب وہ چند ایک کو اس طرح قابو کر لیتا ہے، وہ انہیں جھٹ پٹ باہر لے آتا ہے۔ جب اس نے مچھلیاں پکڑنے کا دھندا شروع کیا تھا، وہ ایک ہی رات میں تیس تیس بلکہ بعض اوقات چالیس چالیس بھی پکڑ لاتا تھا۔ ان راتوں میں اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ پانی کتنا ٹھنڈا ہے۔ صرف گھر پہنچنے پر ہی اسے ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح کانپنے لگتا تھا۔ وہ گرم پانی سے غسل کرتا اور اپنا سارا جسم لحاف میں ڈھانپ لیتا لیکن اس کی کپکپی ختم ہونے کا نام نہ لیتی۔ سردیوں میں ہی نہیں، عین گرمیوں میں بھی اس کی یہی کیفیت ہتوی تھی۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ہوتا کیا؟ اسکا جسم خواہ کتنا ہی کیوں نہ کانپ رہا ہوتا، وہ اگلی ہی رات دوبارہ دریا پر پہنچ جاتا۔ چنانچہ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور اس کے بدن کے مختلف حصوں میں درد ہونے اور ٹیسیں اٹھنے لگیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن وہ کوئی خاص پرواہ نہیں کرتا، وہ محض کندھے اچکا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔''

''ہمیں لومڑ کے متعلق بتائیں۔'' بڑے لڑکے نے دوبارہ مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ ان مچھلیوں کو پھرتی سے ٹکڑا کرتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جال کی بجائے ڈوری استعمال کیا کرتا تھا جس پر تین تین چار چار انچ کے فاصلے پر متعدد کانٹے لگے ہوتے تھے۔ یہ کانٹے مچھلیوں کے گلپھڑوں میں پھنس جاتے ہیں۔ اس طریقے سے بعض اوقات بیک وقت پانچ چھ مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں۔ اس طریقے سے بھی مچھلیاں پکڑنے کا بہترین وقت رات ہی کا ہوتا ہے، خاص طور پر تب جب بارش کے بعد دریا میں طغیانی آ جاتی ہے اور پانی کا رنگ گدلا ہو جاتا ہے۔ کوشش کرے تو آدمی درجنوں مچھلیوں کا شکار کر سکتا ہے۔

''بہرحال ایک رات جب بوڑھا دریا کے عین درمیان میں اپنی ڈور کے قریب کھڑا تھا، کنارے پر ایک لومڑ آ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ لومڑ اتنا مبہوت تھا کہ وہ کافی دیر تک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکا جیسے وہ جانور نہ ہو، پتھر کا بت ہو۔'' باپ لومڑ کی طرح اپنے چاروں ہاتھوں اور پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔'' شکاری کو لومڑ کی کوئی پرواہ نہ ہوتی لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی مچھلیوں کی ٹوکری کنارے پر پڑی تھی۔ دراصل اس کے پاس دو ٹوکریاں تھیں، ایک بڑی اور دوسری چھوٹی۔ اس نے چھوٹی ٹوکری تو اپنی کمر کے گرد باندھی ہوئی تھی اور بڑی دریا کے کنارے پر رکھ دی تھی۔ جب چھوٹی ٹوکری بھر جاتی، وہ واپس کنارے پر جاتا اور اس کی مچھلیاں بڑی ٹوکری میں انڈیل دیتا۔ فکر کی بات یہ تھی کہ لومڑ بڑی ٹوکری سے صرف چند قدم دور کھڑا تھا۔''

''اسے بھگا دو!'' چھوٹے لڑکے نے اونچی آواز سے کہا۔

''اسے بھگا دو!'' چھوٹے لڑکے نے اس کی نقل اتاری۔

''تم سمجھ سکتے ہو کہ بوڑھا شکاری اپنی ٹوکری کے متعلق پریشان ہو گیا۔ اس نے دریا کے پانی میں ہاتھ ڈالا، پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے لومڑ کی طرف پھینک دیا۔ اس کا خیال تھا کہ لومڑ ڈر جائے گا اور وہاں سے بھاگ جائے گا۔ لیکن لومڑ آخر لومڑ تھا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا چند قدم ایک طرف ہٹ گیا۔ دوبارہ رکا اور ایک بار پھر شکاری کو دیکھنے لگا۔ وہ چند منٹ یونہی کھڑا رہا اور اس کے بعد مزے مزے ٹوکری کی جانب چل پڑا۔''

''چند اور پتھر مارو!'' بڑے لڑکے نے کہا۔

''ٹھیک۔ اس نے ایک اور پتھر اٹھایا اور چلایا: ''بھاگ جاؤ!'' اور اس کے ساتھ

ہی اس نے پتھر کھینچ مارا۔ لیکن لومڑ نہ پہلے اس کی چال میں آیا تھا اور نہ اب آیا۔ شکاری نے مجھے بتایا کہ اس نے اتنا کاہل لومڑ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی شکاری سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے، لومڑ نے ٹوکری اپنی تھوتھنی میں دبائی اور چلتا بنا۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' بڑے لڑکے نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔

''بہت برا ہوا۔'' چھوٹے لڑکے نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''امی! میں اور ایکو کو آج دن ڈھلے بسکٹ بنائیں گی۔'' لڑکی نے ایک اتوار دوپہر سے ذرا قبل کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس کی ماں نے گردن ہلا کر جواب دیا۔

''وہ کہتی ہے کہ وہ مطلوبہ اشیا خود لائے گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔''

''میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔''

''مجھے یقین ہے تمہیں جو کچھ چاہیے، ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے بتایا بھی لیکن وہ مانی نہیں۔''

ایکوکو آٹے کی تھیلی اور ایک انڈا اٹھائے تقریباً دو بجے پہنچ گئی۔ وہ پرکشش اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سدا مسکراتی رہتی ہے۔

''میں کچھ مدد دوں؟'' بڑے لڑکے نے پوچھا۔

''اے ٹھہر۔'' باپ نے اسے ڈانٹ پلائی۔'' تم ہمیشہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے رہتے ہو۔ جب لڑکیاں بسکٹ وغیرہ بناتی ہیں، سمجھو وہ ہوم ورک کر رہی ہیں۔ تم خواہ مخواہ کی رکاوٹ بنو گے۔''

''لیکن میں بھی تو ہوم ورک کرنا چاہتا ہوں۔

''دیکھو، باورچی خانے میں اتنی جگہ نہیں کہ تم تینوں کے لیے گنجائش نکل سکے۔''

''ہاں، ہے۔'' لڑکے نے ہونٹ لٹکاتے ہوئے شکایتی لہجے سے کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آیں اور ایک دو آنسو رخسار پر گر پڑے۔

''اچھا، مدد کرو، لیکن زیادہ دخل مت دینا۔ سمجھے؟'' ماں نے اسے پکارتے ہوئے

کہا۔

''بہت اچھا۔'' اس نے وعدہ کیا۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔ ملال اور مسرت کے مابین فاصلہ ہے ہی کتنا!

جب ماں بچوں کو کام سمجھا رہی تھی، باپ چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سوچا، ''میرے پاس یہاں کچھ کرنے کو تو ہے نہیں۔ چلو، چل کر لیٹتے ہیں اور ایک گھڑی آرام کر لیتے ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بہت بڑے بڑے نہ بنانا۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔ ''چھوٹے ہوں تو زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔''

عقبی کمرے میں اس نے گدی کو دوہرا کر کے تکیہ بنا لیا اور تنکوں کی چٹائی پر لیٹ گیا۔ اسے یہاں بھی باورچی خانے سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

''اتنا مت لو۔'' لڑکی لڑکے کو جھڑک رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ توقع کے مطابق لڑکے پر بھوت سوار ہو چکا ہے۔

اس کی بیوی بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ ''یہ اس عورت کی آواز ہے جس سے میں نے شادی کی تھی۔'' اس نے سنتے سنتے سوچا'' جب وہ بچوں کے ساتھ مل کر کوئی کام کرتی ہے تو اسی انداز سے بولتی ہے۔''

پتا نہیں کیوں لیکن اسے ماضی بعید کا وہ وقت یاد آ گیا جب اس نے ایک مرتبہ گھٹے گھٹے انداز سے رونے کی آوازیں سنی تھیں۔ یہ کب کی بات ہے؟ ارے ہاں، تب کی جب وہ پرانے مکان میں رہا کرتے تھے۔ ایک اتوار کی سہ پہر وہ اوپر کی منزل پر قیلولہ کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آ گیا کہ جس طرح اب اس نے گدی کو دوہرا کر کے تکیہ بنا لیا ہے، تب بھی ایسا ہی کیا تھا کہ اچانک اسے کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی عورت رو رہی ہو۔ اس نے غور سے سننے کے لیے اپنا سر ذرا اونچا کر لیا تھا لیکن آواز بند ہو چکی تھی۔ پھر جب وہ اس الجھن میں گرفتار تھا کہ وہ اس سے کیا مطلب اخذ کرے تو آواز دوبارہ آنے لگی تھی۔

گڑبڑ کیا ہے؟ سوا کیا ہے؟ کوئی رو کیوں رہا ہے؟

وہ نیچے چلا گیا۔ ان کا دوسرا بچہ اپنی پلنگڑی پر گہری نیند سویا ہوا تھا اور اس کی بیوی باورچی خانے کے سنک میں پالک دھو رہی تھی۔ ان کی بیٹی کھیلنے باہر چلی گئی تھی۔

''تمہیں کچھ سنائی دیا تھا؟'' اس نے اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔

''نہیں، مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔'' اس نے چمکتا دمکتا چہرہ اس کی طرف گھماتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''عجیب بات ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں مجھے کچھ سنائی دیا تھا۔ اسی لیے تو میں نیچے آیا ہوں.......... یہ دیکھنے کہ ہوا کیا ہے۔''

پھر یہ کیا چیز تھی؟ چھوٹی چھوٹی ٹوٹی پھوٹی سسکیوں کی آواز؟ شاید یہ ہوا کہ کسی چیز سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی ہو۔ لیکن اسے کیوں محسوس ہوا تھا کہ یہ اس کی بیوی کی آواز ہے؟

وہ واپس بالائی منزل پر چلا گیا تھا لیکن آواز پھر سنائی نہیں دی تھی۔

باپ اب عقبی کمرے میں تنکوں کی چٹائی پر لیٹا ہوا تھا اور جب وہ اس واقعے کے متعلق سوچ رہا تھا جس نے اسے اتنا الجھن میں ڈال دیا تھا، وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اس کی بیوی کے پاس رونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

''یہ میرا ہے۔'' لڑکے کی آواز نے باپ کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ ''میں نے پہچان کے لیےاس پر نشان لگا دیا تھا۔'' چند منٹ بعد کوئی ہنسنے لگا۔ پھر وہ سبھی ہنسنے لگے۔

راہداری میں کسی کے دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ یہ چھوٹا لڑکا تھا۔ ''انہوں نے بنا لیے، بنا لیے۔ اب کھانے کا وقت آ گیا ہے۔'' اس نے کہا اور دوبارہ باورچی خانے کی طرف بھاگ گیا۔

باپ اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ سب کے سامنے کمرے میں نچلی گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بسکٹوں کی متعدد پلیٹیں پڑی تھیں۔ ایک پلیٹ اس کے لیے تھی۔

''بہت خوب! بہت اچھے!'' اس نے لقموں کے درمیان میں کہا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا تھا، چھوٹے بسکٹ بہترین ہوتے ہیں۔'' اس نے اپنا حصہ ختم کر لیا اور دوسروں کو کھاتے دیکھنے لگا۔

''کچھ اور لے لیں۔'' اس کی بیوی نے زور دے کر کہا۔

''نہیں، شکریہ، میرے لئے یہی کافی ہیں۔'' اس نے پلیٹ بچوں کی طرف دھکیل

دی۔

''بہت مزہ آیا۔'' لڑکی نے آخری لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور بہت لذیذ۔'' ایکوکو نے اپنا حصہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

لڑکا بھی اپنا آخری لقمہ کھانا چاہتا تھا کہ اچانک لڑکی بول پڑی۔ ''ٹھہرو! تھوڑا سا بچا لو!'' لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ آخری ٹکڑا لڑکے کے منہ میں غائب ہو چکا تھا۔ ''خیر!'' لڑکی نے مایوسی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔

''ہم گولڈفش کے لیے کچھ بچانا تو بھول ہی گئے۔''

لڑکے نے اپنے رخساروں کو یوں تھپتھپایا جیسے وہ ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اب کچھ نہیں بچا۔ پلیٹوں اور میز پر ایک بھی بھورا نظر نہیں آ رہا تھا۔

....

''آج ہم نے موسیقی کی کلاس میں نیو ورلڈ سمفنی سنی تھی۔'' ایک شام لڑکی نے ڈنر کے تقریباً اختتام پر کہا۔

''بہت خوب!'' ماں نے کہا۔ ''پسند آئی؟''

''خوبصورت تھی۔''

''ہاں۔ یہ واقعی خوبصورت ہے۔''

''آپ کو معلوم ہے ہوا کیا؟ جب ہمارے استاد نے ہمیں بتایا کہ وہ ہمیں یہ موسیقی سنوا رہا ہے، لڑکے شکایت کرنے لگے کہ وہ نہیں سننا چاہتے۔ صرف لڑکیاں سننا چاہتی تھیں۔''

''کیوں؟ لڑکوں کو کیا شکایت تھی؟'' باپ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ وہ سب کہہ رہے تھے، بور ہے، بور ہے، بور ہے۔ میرا خیال ہے وہ سمجھتے تھے اس میں کوئی لطف نہیں آئے گا۔ تاہم انہیں یہ توقع سے بڑھ کر پسند آئی ہو گی کیونکہ جب یہ ایک مرتبہ شروع ہو گئی، وہ چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔''

''تم جو موسیقی سنتے ہو، تمھیں اس کے منتخب کرنے کی اجازت ہے؟'' ماں نے پوچھا۔

''ہوں۔ کبھی کبھی استاد ہم سے پوچھ لیتے ہیں کہ ہم کیا سننا پسند کریں گے اور وہ تختہ سیاہ پر اس کی فہرست بنا لیتے ہیں۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں، بہت سے لوگوں نے درخواست کی تھی کہ وہ نیو ورلڈ سمفنی سننا چاہیں گے۔ تاہم اس وقت ان کے پاس اس کی ٹیپ تیار نہی تھی۔''

''اوہ، تو تم ٹیپ پر سنتے ہو؟'' باپ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں، ان کے پاس موسیقی کی بے شمار ٹیپیں ہیں۔''

''سمجھا۔''

''بہرحال آج جب وہ کلاس میں آئے، انہوں نے بتایا کہ انہیں گزشتہ رات نی ورلڈ سمفنی کی ٹیپ بنانے کا موقع مل گیا تھا، چانچہ آج ہم سب کو یہی سننا چاہیے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ شروع کا حصہ ٹھیک طرح ریکارڈن ہیں ہوا............ انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ گزشتہ رات ریڈیو پر یہ سمفنی سنوائی جانا تھی۔ چنانچہ جب یہ شروع ہوئی، انہیں بھاگم دوڑ ٹیپ ریکارڈر کے بٹن دبانا پڑے اور یوں تھوڑی بہت گڑبڑ ہوگئی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ہم اس کے درمیان میں ان کے بیٹے کی آواز سنیں گے۔''

''تم نے سنی؟''

''ہوں۔''

''اس نے کیا کہا تھا؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی تھی، آ آ ہو ہو،''

''آ آ ہو ہو؟''

''میں ٹھیک طرح نہیں بتا سکتی۔ یہ بہت تیزی سے گزر گئی تھی۔''

کئی شامیں گزر گئیں۔ پھر لڑکی ایک اور کہانی لے آئی۔

''آج انہوں نے'' اس نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا'' ایکوکو کی کلاس میں دعوت رقص سنی۔ استاد نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ موسیقار نے............ میرا خیال ہے اس کا نام (میکس) ویبر (Weber: جرمن رومانی موسیقار اور پیانو نواز) ہے............ اس نے اسے اپنی بیوی کے نام معنون کیا تھا اور اس کی موسیقی بڑی مرصع و مسجع ہے۔''

''تو تم اسے یہ کہتے ہو۔'' اس کے باپ نے کہا۔

''جب انہوں نے ٹیپ چلا دی، لوگوں کے خیال کے مطابق سمفنی کے دوران میں جگہ جگہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کی تشریح کرنے لگے۔'' جیسا کہ اس کی عادت تھی جب وہ اپنی کہانی کے بہترین حصے پر پہنچتی تھی، وہ ذرا تیز تیز بولنے لگتی تھی۔ چنانچہ اب بھی وہ وہی تیزی دکھانے لگی۔'' خیر، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس سمفنی کے درمیانی حصے میں ایک مقام ایسا آ جاتا ہے جہاں دھن کچھ دیر کے لیے خاصی دھیمی ہو جاتی ہے اور پھر وہ اچانک بلند ہونے لگتی ہے۔ استاد نے بتایا کہ جہاں دھن دھیمی ہوتی ہے، وہاں مرد اٹھتے ہیں، خواتین کے پاس جاتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں، کیا میں آپ کے ساتھ رقص کرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہوں؟ اور جب دھن بلند ہونے لگی، تو انہوں نے بتایا، یہ وہ مقام ہے جہاں خواتین کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور منہ سے ''اوہ، ہ'' جیسی آواز نکل جاتی ہے، لیکن جب خود استاد کے منہ سے، اوہ، ہ، نکلا تو ان کے نقلی دانت ڈھیلے ہو گئے اور تقریباً باہر گر پڑے!'' اب اس کے لیے اپنے اوپر قابو رکھنا محال ہو گیا اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

اس کے والدین بے یقینی سے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔

''ان کے نقلی دانت؟'' باپ نے پوچھا۔

''میں صحیح کہہ رہی ہوں، وہ تقریباً باہر گر پڑے تھے!'' وہ اتنے بلند آہنگ قہقہے لگا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اسے اپنے پیٹ کو پکڑنا پڑا۔ تاہم کچھ ہی دیر میں باپ بھی ہنسنے لگا اور اس کے بعد ماں اور لڑکے اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔ وہ سب مسلسل ہنسے جا رہے تھے اور کوشش کے باوجود اپنی ہنسی کو روک نہیں پا رہے تھے۔

آخر کار بڑے لڑکے نے پوچھا، ''پھر استاد نے کیا کیا؟''

''ایکو کو کہتی تھی کہ انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا اور جلدی جلدی انہیں دوبارہ ٹھیک کر لیا تھا۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

....

بڑے لڑکے کے چھوٹے سے گتے کے ڈبے میں لاروا رکھا ہوا تھا، ایک روز وہ غائب ہو گیا۔

اس وقت باپ کو لاروے کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ کسی کو اس سے اس کا ذکر کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ صرف گمشدگی کے بعد ہی اس نے اس کا قصہ سنا۔

ہوا یہ کہ لڑکا اور اس کا دوست ہمسائے کے صحن میں درخت کی گٹولیاں اکٹھی کر رہے تھے (انہیں وہ اپنی کھلونا بندوقوں میں گولیوں کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے) کہ انہیں یہ لاروا مل گیا۔ اس کے دوست نے اسے بتایا کہ اگر وہ اس کا کویا اتار دیں اور اسے پتوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے بیچ ڈبے میں رکھ دیں تو یہ تین گھنٹے کے اندر اپنے جسم کے گرد نیا کویا بنا لے گا۔

لڑکا اسے گھر لے آیا اور اس نے وہی کیا جس کا اس کے دوست نے اسے مشورہ دیا تھا۔ لیکن جب اس نے رات کو ڈبے میں جھانک کر دیکھا، لاروا جوں کا توں پڑا تھا، وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلا تھا۔ اگلی صبح بھی وہ وہیں پڑا تھا۔

اس کے بعد وہ حشرے کے متعلق بھول گیا۔ تین دن گزر گئے، تب کہیں اسے ڈبے میں جھانکنے کا خیال آیا۔ اس مرتبہ وہ کھسکتا کھسکتا ایک کونے میں چلا گیا تھا اور اس نے اپنی بشت پر خیمہ نما پردہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ لڑکے نے اس نیم تیار چھاتے کو اپنی انگلی سے کھٹکھٹایا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ چھاتا جھٹ پٹ حشرے کے جسم سے اتر گیا۔

ایک دو دن بعد اسے یہ ننھی منی مخلوق اپنے سٹڈی روم کے فرش پر رینگتی نظر آئی۔ اس مرتبہ بھی اس کی پشت پر اسی جسامت کا چھاتا تھا جتنا کہ پہلے تھا۔ لڑکے نے بڑی احتیاط سے اسے دوبارہ ڈبے میں رکھ دیا۔

اس کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اس کے متعلق بھول گیا اور کئی دن ڈبے کے قریب نہ گیا۔ جب آخر کار اسے یاد آیا، وہ ڈبے میں موجود نہیں تھا۔ اپنی ماں کی مدد سے اس نے سٹڈی روم کے فرش کا چپا چپا چھان مارا، سلائی کی مشین سے کھلونوں کے ڈبے تک ہر چیز اٹھا اٹھا کر نیچے جھانکا لیکن حشرے کا سراغ کہیں نہ ملا۔

دو ہفتے گزر گئے۔ پھر ایک شام جب ماں سٹڈی روم میں گئی، اسے حشرہ کویا میں لپٹا ستار بجوں کی تصویر سے ذرا نیچے دیوار پر نظر آیا۔

''یہ رہا!'' حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔

لڑکے نے گم شدہ حشرے کے ڈبے میں جو پتے، شاخیں اور کاغذ کے ٹکڑے رکھے تھے، حشرے نے انہیں اپنے جسم کے رووٴں سے ملا کر اپنے ارد گرد نیا کویا تیار کر لیا

تھا۔ اگرچہ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ اسے مختلف اشیا جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن یہ بالکل بے عیب تھا۔

''یہ اتنے دن کہاں چھپا رہا ہے؟'' بعد ازاں باپ سوچنے لگا۔''اتنا تو ظاہر ہے اسے کوئی ایسی جگہ مل گئی ہو گی جس پر دوسروں کی نظر نہیں پڑ سکتی ہو گی۔ شاید یہ بک شیلف کے پیچھے جا چھپا ہو جہاں دھاگے، بال وغیرہ پڑے رہتے ہیں جنہیں اس نے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا ہو گا۔ بہرحال جب اس کا کویا مکمل ہو گیا، وہ باہر نکل آیا اور جنوبی دریچوں کے قریب ایسی جگہ چپک گیا جہاں خوب دھوپ آتی اور روشنی پڑتی ہے۔''

لڑکا غسل خانے میں گھسا ہوا تھا اور اپنے آبی پستول سے چھت اور دیواروں پر پانی اچھال رہا تھا۔ جب ایک مرتبہ اسے اس کھیل میں مزہ آنے لگتا، وہ اس پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنے لگتا۔

''تولیے سے اپنا جسم پونچھو اور ادھر آ جاؤ۔'' اس کی ماں اور بہن نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔''ہم تمہیں ایک ایسی چیز دینا چاہتے ہیں جس کی تمہیں کوئی توقع نہیں ہو گی۔''

لڑکا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ''غیر متوقع'' چیز اس کا اپنا حشرہ ہو گی۔ اس نے ٹب سے چھلانگ لگائی اور جلدی جلدی اپنا جسم پونچھنے لگا۔

سب سے آخر میں جس نے حشرہ دیکھا تھا، وہ باپ تھا۔ اس شام وہ کہیں باہر چلا گیا تھا اور جب واپس آیا، خاصی دیر ہو چکی تھی اور سب لوگ مدتوں پہلے سو چکے تھے، صرف اگلی صبح اسے اپنی بیوی کی زبانی حشرے کے متعلق معلوم ہوا۔

جب باپ گھر سے باہر ہوتا، اسے حشرے کا بھول کر بھی خیال نہ آتا۔ تاہم ایک ایسا حشرہ لازماً عجیب وغریب قسم کی چیز ہو گا جو ٹھوس چھت کے نیچے اور دیواروں کے اندر مکان میں اپنے جسم کے گرد کویا بن لیتا ہے۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔'' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔'' تمہارے خیال میں اس کا یہیں گھر بنانے کا ارادہ ہے۔؟''

''معلوم تو یقیناً یہی ہوتا ہے۔''

باپ کو کوئے کی ایک جانب چمکتے دمکتے سرخ کاغذ کا مہین ٹکڑا لٹکتا نظر آیا۔ کیا

اس کے بیٹے نے دیواروں اور چھتوں پر لگائے جانے والے کاغذ کے ٹکڑے بھی ڈبے میں رکھ دیئے تھے؟ یا اسے حشرے نے کمرے میں مختلف جگہوں پر گھومتے پھرتے کہیں سے اٹھا لیا تھا؟

ماں اور باپ جس درمیانی کھڑکی کے قریب کھڑے حشرے کا جائزہ لے رہے تھے، اس کے دوسرے سرے پر گولڈفش مزے مزے سے اپنے پیالے میں تیر رہی تھی۔ پانی کے کنارے پر جو کائی اگ آئی تھی، اس نے اس پر منہ مارا۔ کچھ یوں لگا جیسے اسے کائی پسند نہیں آئی۔ وہ پیچھے ہٹی اور دوبارہ تیرنے لگی۔

کاواباتا یاسوناری

ایک بازو

کاواباتا یاسوناری (Kawabata Yasunari) (1899ء تا1972ء) پہلے جاپانی ادیب ہیں جنہیں نوبل انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ 1968ء میں انعام کی وصولی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا، ''جاپانی روایت میں برف، چاند، شگوفے جیسے الفاظ، جو موسموں کے ایک دوسرے سے گلے ملنے کا اظہار کرتے ہیں، پہاڑوں اور دریاؤں، گھاسوں اور درختوں ہی کے حسن کو نہیں، جو فطرت کے لاتعداد مظاہر ہیں، بلکہ انسانی جذبات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔'' مملکت انسانی اور دنیائے فطرت کے مابین امتیازات کو آپس میں مدغم کرنے کی یہ صلاحیت ان کی تحریروں کی امتیازی اور نشہ آور خصوصیت ہے۔ انہوں نے ''برفانی خطہ'' (1948ء) اور ''پہاڑ کی آواز'' (1954ء) (اس ناول کا اردو ترجمہ محمد سلیم الرحمٰن نے کیا اور ''مشعل'' نے چھاپا ہے) جیسی معرکۃ الارا تصنیفات میں نباتات وحیوانات کی دھیمی دھیمی حرکات وسکنات، پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ اور آتشِ جذبات کی حدت کی سرخی میں نہائے ہوئے سرمائی زمینی مناظر کی اصطلاحات میں بیان کر کے سچی شاعرانہ عبقریت کا مظاہرہ کیا ہے۔

چنانچہ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے مغربی قارئین کو کاواباتا کا گرویدہ بنایا ہے۔ وہ انہیں ایک ایسا ادیب تصور کرتے ہیں جو جاپانی روایت پر پورے بھی اترے اور جنہوں نے اسے طوالت بھی بخشی۔ واقعی کاواباتا کی تحریروں کا یہ پہلو بہت زوردار ہے لیکن اتنا ہی پرزور وہ فاصلہ ہے جو وہ اپنے کرداروں کے مابین قائم کرتے رہتے ہیں۔ اکثر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں کے مردوں اور عورتوں کا تعلق متخالف مقناطیسی خطوں سے ہے۔ وہ کتنا ہی کیوں نہ سمجھیں کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں، ان کی بنیادی فطرت انہیں ایک دوسرے سے دور دھکیلتی رہتی ہے۔ تاہم مقصد کے حصول کی یہی معذوری (اور بعض اوقات تنہا رہنے کی خواہش) اس بے داغ پاکیزگی کا عنصر تخلیق کرنے کا باعث بنتی ہے جو ان کے بیشتر نسوانی کرداروں کے

آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔'' برفانی خطہ'' کی یاکوشیما مورا کے لیے اپنی کشش اس لیے برقرار رکھنے میں کامیاب رہتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اسے کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ''پہاڑ کی آواز'' کی کیکوکوشنگو کے لیے اپنی پاکیزگی اس لیے محفوظ کر سکی ہے کیونکہ وہ اس کی بہو ہے۔ اس قسم کے ٹکراؤ کا رشتہ اس کی بعض ابتدائی کہانیوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کاواباتا کی تحریروں کا ایک اور پہلو، جو ''ایک بازو'' جیسی کہانیوں میں نمایاں انداز سے سامنے آتا ہے، وہ ماورائے فطرت (سریلسٹ) فستازیہ (Fantasy) کا جاندار عنصر ہے۔ کاواباتا نے شروع ہی میں جدیدیت کی جو تربیت حاصل کی تھی، یہ اسی کی دین ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کاواباتا کو اواخر عمر میں ''مکائی'' (بدروحوں کی دنیا)، پاگل پن اور امیجری کے انوکھے استعمال میں بڑی کشش محسوس ہونے لگی تھی۔'' ایک بازو'' کو اس کی ان تحریروں کی مخصوص مثال گردانا جا سکتا ہے۔ کم از کم جاپانی تو یہی سمجھتے ہیں۔

''میں تمہیں اپنا ایک بازو ایک رات کے لیے دے سکتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔
اس نے کندھے سے اپنا دایاں بازو الگ کیا اور بائیں ہاتھ سے میرے گھٹنے پر رکھ دیا۔
''شکریہ!'' میں نے اپنے گھٹنے پر نظر ڈالی۔ بازو کی حرارت میرے اندر جذب ہونے لگی۔
''میں اسے اپنی انگوٹھی پہنا دیتی ہوں۔ یہ تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ یہ میرا ہے۔'' وہ مسکرائی اور اس نے اپنا بازو میری چھاتی کی طرف بڑھا دیا۔ ''برا نہ ماننا'' لیکن ایک بازو کے ساتھ اس کے لیے انگوٹھی اتارنا مشکل تھا۔
''منگنی کی انگوٹھی؟''
''نہیں۔ نشانی میری اماں کی۔''
یہ چاندی کی انگوٹھی تھی اور اس میں چھوٹے چھوٹے نگینے جڑے ہوئے تھے۔
''شاید دیکھنے میں یہ منگنی کی انگوٹھی ہی نظر آتی ہے لیکن مجھے کوئی خاص پروا نہیں۔ میں اسے پہنے رکھتی ہوں اور جب میں اسے اتارتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں اپنی اماں سے بے وفائی کر رہی ہوں۔''
میں نے گھٹنے سے بازو اٹھایا، انگوٹھی اتاری اور اسے چھنگلیا کے ساتھ کی انگلی میں

پہنا دیا۔

''یہی ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔'' جب تک بازو اور انگلیاں مڑتی تڑتی نہیں، یہ دیکھنے میں مصنوعی معلوم ہوتا رہے گا۔ تمہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ لاؤ، میں انہیں تمہاری خاطر خمیدہ کر دیتی ہوں۔''

اس نے میرے گھٹنے سے اپنا دایاں بازو اٹھایا اور بڑی ملائمت سے اسے اپنے ہونٹوں سے دبانے لگی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ انگلیوں کے جوڑوں پر پیوست کر دیئے۔

''اب یہ ہلنے جلنے لگیں گے۔''

''شکریہ۔'' میں نے بازو اٹھا لیا۔''تمہارے خیال میں یہ بات کرے گا؟ مجھ سے گفتگو کرے گا؟''

''یہ صرف وہی کچھ کرتا ہے جو کوئی بازو کرتا ہے۔ اگر یہ بولنے لگا تو میرا خیال ہے، مجھے اسے واپس لینا پڑے گا۔ اگر تم نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا تو یہ کم از کم تمہاری باتیں ضرور سنے گا۔''

''میں اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔''

''میں تم سے پھر ملوں گی۔'' اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے دایاں بازو چھوتے ہوئے کہا۔''تم ان کے ہو، لیکن صرف ایک رات کے لیے۔''

''جب وہ میری جانب دیکھ رہی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''میرا خیال ہے تم اسے اپنے بازو سے تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔'' اس نے کہا۔''اگر کرو گے، تو بھی ٹھیک ہے۔ خیر، کر کے دیکھ لو۔''

''شکریہ۔''

میں نے بازو اپنی برساتی کی جیب میں رکھ لیا اور دھند آلود گلیوں میں نکل گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں ٹیکسی یا ٹرام میں سوار ہوا، تو لوگ مجھے عجیب شخص سمجھیں گے۔ اگر بازو نے، جو اب لڑکی کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا، چیخ مار دی یا رونا شروع کر دیا، تو خواہ مخواہ انوکھی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

میں نے اسے ایک جانب اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنا دایاں ہاتھ کندھے کے جوڑ کی گولائی پر رکھ دیا۔ یہ برساتی میں مستور تھا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ ابھی تک وہیں ہے، مجھے وقتاً فوقتاً برساتی کو چھونا پڑتا تھا۔ میں شاید اپنے آپ کو بازو کی موجودگی کا اتنا یقین نہیں دلانا چاہتا تھا جتنا کہ اپنی مسرت کا۔

اس نے بازو کو عین اس مقام سے اتارا تھا جو مجھے پسند تھا۔ یہ بھرا بھرا، نرم و گداز اور گول تھا۔ کیا یہ بازو کا آخری سرا یا کندھے کا آغاز تھا؟ گولائی کسی حسین و جمیل مغربی دوشیزہ کی تھی جو کسی جاپانی لڑکی میں کم ہی نظر آتی ہے۔ یہ فی نفسہ لڑکی میں موجود تھی۔ صاف ستھری، شستہ گولائی جیسی کسی کرے میں موجود ہوتی ہے۔ جو دھیمی، تازہ روشنی میں جھلملا رہا ہو۔ جب لڑکی صاف ستھری نہیں ہوتی ہوگی، یہ ملائم گولائی ماند پڑ جاتی ہوگی اور تھلتھلی ہو جاتی ہوگی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو کسی خوبصورت دوشیزہ کی زندگی میں صرف گھڑی کی گھڑی آتی ہے۔ بازو کی گولائی مجھے اس کے جسم کی گولائی یاد دلانے لگی۔ اس کی چھاتیاں بہت بڑی نہیں ہوں گی، شرمیلی شرمیلی لجائی لجائی، صرف اتنی بڑی جو آسانی سے ہاتھوں میں سما جائیں، چھونے پر ان کے گداز پن اور قوت کا احساس رگ رگ میں سما جائے گا۔ بازو کی گولائی میں مجھے اس کی ٹانگوں کا احساس ہوتا تھا جو وہ اس کے چلنے پر نظر آتی تھیں۔ وہ انہیں یوں ہلکے پھلکے انداز سے اٹھاتی تھی جیسے وہ کوئی ننھا منھا پرندہ ہو یا کوئی تتلی ہو جو ایک پھول سے دوسرے پھول پر منڈلاتی پھرتی ہے اور جب وہ بوسہ لیتی تھی تو اس کی زبان کی نوک سے وہی لطیف نغمگی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

یہ آستینوں کے بغیر ڈریس پہننے کا موسم تھا۔ لڑکی کے بازو کی رنگت، جو تازہ تازہ برہنہ ہوا تھا، ایک ایسی جلد کی طرح تھی جو ابھی ہوا کے خنک لمس کی عادی نہ ہو پائی ہو۔ اس میں اس غنچے کی تمتماہٹ تھی جو بہار کی پناہ میں بھیگ چکا ہو اور جسے ابھی تک گرمیوں کے تھپیڑوں نے پامال نہ کیا۔ میں نے اس صبح مگنولیا کی ایک کلی خریدی تھی اور شیشے کے گلدان میں سجا دی تھی۔ لڑکی کے بازو کی گولائی اسی جسیم، سفید کلی کی مانند تھی۔ بے آستینوں کے عام ڈریسوں کے مقابلے میں اس کے ڈریس کی پشت کہیں زیادہ اوپر تک چڑھی ہوئی تھی جو بالکل انقلابی قدم معلوم ہوتا تھا۔ کندھے کا جوڑ اور خود کندھا ننگا تھا۔ گہرے سبز، تقریباً سیاہ، ریشمی ڈریس پر نرم و گداز آب و تاب تھی۔ لڑکی کے شانوں میں مدور ڈھلوان

تھی جو اس کی کمر کے بل کھانے پر ہلکورے لینے لگتی تھی۔ اگر ترچھی نگاہوں سے اس کے عقب کا جائزہ لیا جاتا، تو معلوم ہوتا کہ اس کے مدور بازوؤں سے لابنی، مہین گردن تک جو گوشت پوست نظر آتا ہے، وہ اچانک اس مقام پر ناپید ہو گیا ہے جہاں سے اس کے بالوں کا آغاز ہوتا ہے جنہیں اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور کچھ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے سیاہ بال کندھوں کی گولائی پر جھلملاتا عکس ڈال رہے ہوں۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اسے خوبصورت سمجھ رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے اس گولائی کی خاطر، جو اس کے کندھے میں تھی، اپنا دایاں بازو مجھے ادھار دے دیا تھا۔

میری برساتی میں احتیاط سے چھپایا ہوا لڑکی کا بازو میرے ہاتھ سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔ میرا دل جس تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس نے میرا سر چکرا دیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میرا ہاتھ گرم ہو گا۔ میں اس حرارت کو، خود لڑکی کی حرارت کو، جوں کا توں برقرار رکھنا چاہتا تھا اور میرے ہاتھ میں جو معمولی سی خنکی تھی، اس سے مجھے اس مسرت کا احساس ہو رہا تھا کہ بازو میری تحویل میں ہے۔ یہ بالکل اس کی چھاتیوں کی مانند تھا جنہیں ابھی تک کسی مرد نے نہیں چھوا تھا۔

دھند ابھی تک معمول سے زیادہ دبیز تھی اور آثار سے معلوم ہوتا تھا کہ رات کو بارش ہو گی۔ دھند نے میرے ننگے بالوں کو بھگو دیا تھا۔ مجھے کسی بند دوا خانے کے عقبی کمرے سے ریڈیو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ دھند کے باعث تین طیارے ہوائی اڈے پر اترنے میں ناکام رہے ہیں اور آدھ گھنٹے سے اوپر فضا میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ پھر وہ لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانے لگا کہ مرطوب راتوں میں گھڑیوں کے آگے پیچھے ہونے کا امکان ہوتا ہے اور اگر ایسی راتوں میں انہیں پوری چابی دینے کی کوشش کی جائے، تو ان کے سپرنگوں کے ٹوٹنے کا احتمال ہو جاتا ہے۔ میں نے آسمان پر چکر لگانے والے جہازوں کی روشنیاں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ آسمان نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ بڑھتی ہوئی رطوبت میرے کانوں تک پہنچ گئی تھی اور مجھے کچھ اس قسم کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں جیسے کہیں دور لاتعداد کیچوے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہوں۔ میں مزید تنبیہہ اور مشورے سننے کے لیے دوا خانے کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایسی راتوں میں چڑیا گھر کے اندر شیر،

ببر شیر، چیتے اور ان جیسے دوسرے خونخوار درندے رطوبت کے خلاف اپنے غیظ وغضب کا اظہار کرنے کے لئے دہاڑنے لگتے ہیں اور اب ہم ان کی یہی چیخم دہاڑ سنیں گے۔ یہ دہاڑ ایسی تھی جیسی خود دھرتی میاد ہاڑ رہی ہو۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ایسی راتوں میں حاملہ عورتوں اور پژمردہ لوگوں کو جلدی سو جانا چاہیے اور یہ کہ جو خواتین اس موقع پر اپنے اجسام پر خوشبوئیں لگاتی ہیں، انہیں بعد میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔

جب درندوں کی چیخم دہاڑ شروع ہوئی تھی تو میں وہاں سے پرے ہٹ گیا تھا اور خوشبوؤں کے متعلق جو انتباہ کیا جا رہا تھا، وہ میرے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ اس غصیلی دہاڑ نے مجھے مضطرب کر دیا تھا اور میں اس اندیشے کے پیش نظر وہاں سے آگے چل پڑا تھا کہ کہیں میری بے چینی لڑکی کے بازو میں نہ سرایت کر جائے۔ لڑکی حاملہ تھی نہ پژمردہ، لیکن اس رات مجھے خیال گزرا کہ لڑکی کو، جس کے پاس صرف ایک بازو رہ گیا تھا، ریڈیو کے مشورے پر کان دھرنا چاہیے اور خاموشی سے سو جانا چاہیے۔ میں امید کرنے لگا کہ لڑکی آرام کی نیند سوئے گی۔

جب میں سڑک پار کر رہا تھا تو میں نے اپنا بایاں ہاتھ اپنی برساتی پر رگڑا۔ کسی ہارن کی آواز سنائی دی۔ کوئی چیز مجھے چھو کر تیزی سے آگے نکل گئی اور میں دوہرا ہو گیا۔ شاید بازو ہارن کی آواز سے ڈر گیا تھا۔ انگلیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

''فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خاصا دور تھا۔ اسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ یہ بجنے لگا تھا۔''

چونکہ میں ایک ایسی چیز اٹھائے ہوئے تھا ے جو میرے لیے اہم تھی، میں نے دونوں جانب دیکھ لیا تھا۔ ہارن کی آواز اتنی دور سے آئی تھی کہ مجھے خیال گزرا کہ یہ کسی اور کے لیے ہے۔ یہ جس سمت سے آئی تھی، میں نے ادھر دیکھا لیکن مجھے کوئی شخص نظر نہ آیا۔ مجھے صرف ہیڈ لائٹس کا یہ رنگ کتنا عجیب ہے! جب میں سڑک پار کر چکا اور اسے گزرتے دیکھ چکا تو میں فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ کار کوئی بھڑکیلے عنابی رنگوں میں ملبوس نوخیز دوشیزہ چلا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا اور پھر سر جھکا کر مجھے سلام کیا ہو۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ لڑکی اپنا بازو واپس لینے آ گئی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس کے لیے ایک بازو کے

ساتھ کار چلانا قریب قریب ناممکن ہو گا۔ لیکن میں جو کچھ اٹھائے جا رہا تھا، کیا کار والی حسینہ نے اسے دیکھ نہیں لیا تھا؟ کیا اس نے اپنے نسوانی وجدان سے اس کا اندازہ نہیں لگا لیا تھا؟ مجھے یاد رکھنا ہو گا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچنے سے پہلے میرا اس کی کسی اور ہم جنس سے ٹاکرا نہ ہونے پائے۔ عقبی روشنیاں بھی دھندلی قرمزی تھیں۔ میں ابھی تک کار دیکھ نہیں سکا تھا۔ خاکستری دھند میں لیونڈر کا دھبا اڑتا آیا اور آگے گزر گیا۔

''اس کے کار چلانے کا کوئی مقصد، قطعاً کوئی مقصد، نظر نہیں آتا۔ وہ محض کار چلانے کے شوق میں کار چلا رہی ہے۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔'' اور جب تک وہ کار چلاتی رہے گی، وہ یونہی چشم زدن میں نظروں سے اوجھل ہوتی رہے گی اور یہ اس کی کار کی پچھلی نشست پر کیا بیٹھا تھا؟''

بظاہر کچھ بھی نہیں۔ خالی پن نے جس طرح میرے حواس مختل کر دیئے ہیں، اس کا باعث یہ تو نہیں کہ میں لڑکیوں کے بازو اٹھائے پھر رہا ہوں؟ لڑکی جو کار چلا رہی تھی، وہ پیچی شبینہ دھند کے لیے جا رہی تھی اور اس لڑکی میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ہیڈ لائٹس کو قدرے قرمزی بنا دیا تھا۔ اگر یہ قرمزی روشنی اس کے اپنے جسم سے نہیں پھوٹ رہی تھی، تو پھر یہ کہاں سے آئی تھی؟ کیا اس بازو نے، جسے میں چھپائے ہوئے تھا، کسی عورت پر اتنا خالی پن طاری کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کی رات میں اکیلی کار چلانے نکل پڑی؟ کیا اس نے کار میں سر کی جنبش سے لڑکی کے بازو کو سلام کیا تھا؟ شاید ایسی راتوں میں فرشتے اور بھوت باہر نکل آتے ہوں اور عورتوں کا تحفظ کرتے پھر رہے ہوں۔ شاید وہ کار پر نہیں بلکہ قرمزی روشنی پر سوار ہو۔ اس کا یوں گھومنا خالی نہیں گیا تھا۔ اس نے میرا راز بھانپ لیا تھا۔

میرا مزید کسی شخص سے آمنا سامنا نہ ہوا اور اس میں بخیریت واپس اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ میں اپنے دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا اور کنسوئیاں لینے لگا۔ ایک جگنو کی روشنی تیزی سے میرے سر کے اوپر سے گزری اور آناً فاناً غائب ہو گئی۔ لیکن یہ روشنی اتنی بڑا اور اتنی تیز تھی کہ جگنو کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں پچھلی جانب سمٹ گیا۔ جگنوؤں سے ملتی جلتی مزید روشنیاں آتی اور گزرتی رہیں۔ ابھی انہیں دبیز دھند جذب بھی نہ کر پاتی کہ وہ غائب ہو جاتیں۔ کیا یہ دلدلی گیسوں سے پیدا ہونے والی آگ یا کسی قسم کی آتش مرگ تھی جو بھاگ کر مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گئی تھی اور میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی؟ لیکن پھر میں

نے غور سے دیکھا تو یہ مجھے چھوٹے چھوٹے پتنگوں کا انبوہ دکھائی دیا۔ دروازے کے قریب جو روشنی تھی، اس میں داخل ہونے کے بعد ان کے باریک پر جگنوؤں کی مانند چمکنے لگے تھے۔ یہ اتنے بڑے تھے کہ جگنو ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن پتنگوں کے اعتبار سے اتنے چھوٹے کہ خواہ مخواہ غلطی کا امکان پیدا ہو جاتا تھا۔

میں نے خودکار لفٹ میں سوار ہونے سے گریز کیا اور تیسری منزل تک پہنچنے کے لیے دبے پاؤں تنگ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چونکہ میں کھچو نہیں، مجھے تالا کھولنے میں دقت پیش آئی۔ میں جتنا زیادہ زور لگاتا، میرا ہاتھ اتنا ہی کپکپانے لگتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد دہشت عالم میں آدمی کے ساتھ ہوتا ہے۔ شاید کمرے کے اندر کوئی چیز میرا انتظار کر رہی تھی وہ کمرا جس میں تنہائی کی زندگی گزارتا چلا آیا تھا، اور کیا تنہائی کسی چیز کی موجودگی کا ثبوت نہیں تھی؟ اور لڑکی کے بازو کے ساتھ میں اکیلا رہ بھی تو نہیں گیا تھا اور شاید مجھے ڈرانے کے لیے میری تنہائی ہی میرا انتظار کر رہی ہو۔

''چلو، چل کر دیکھ لیتے ہیں۔'' آخر کار جب میں دروازہ کھول چکا، میں نے لڑکی کے بازو کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں اپنے کمرے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں روشنی جلاتا ہوں۔''

''کیا تم کسی چیز سے خوفزدہ ہو؟'' بازو کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ''یہاں کچھ ہے؟''

''تمھارے خیال میں کچھ ہو سکتا ہے؟''

''مجھے کسی چیز کی بو آ رہی ہے۔''

''بو؟ تمھیں لازماً میری بو آ رہی ہو گی۔ تمھیں یہاں تاریکی میں میرے عکس کی علامتیں نظر نہیں آ رہیں؟ ذرا غور سے دیکھو۔ شاید میری پرچھائیاں میری واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''یہ خوشگوار بو ہے۔''

''آہ منگولیا۔'' میں نے چہکتے ہوئے جواب دیا۔ میں خوش تھا کہ یہ میری تنہائی کی بوسیدہ بو نہیں تھی۔ میرے پرکشش مہمان کے لیے منگولیا کی کلی بالکل مناسب چیز تھی۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگی تھیں۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والی تاریکی میں بھی مجھے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں پڑی ہے۔

''اجازت ہو تو میں روشنی جلا دوں؟'' بازو کی کہی ہوئی یہ بات بہت عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ ''میں اس سے پہلے تمہارے کمرے میں کبھی نہیں آیا۔''

''شکریہ! مجھے بہت خوشی ہو گی۔'' اس سے پہلے میرے سوا میرے کمرے میں کبھی کسی نے روشنی نہیں جلائی تھی۔

میں بازو دروازے کے قریب سوئچ کے پاس لے گیا۔ چھت، میز، پلنگ، باورچی خانے اور غسل خانے کی پانچوں روشنیاں بیک وقت جل اٹھیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کی روشنی اتنی تیز ہو گی۔

مگنولیا کھل کر بہت بڑا پھول چکا تھا۔ اس صبح یہ محض شگوفہ تھا۔ یہ ابھی ابھی چٹخا ہو گا۔ اس کے باوجود اس کی چند پتیاں میز پر بکھری پڑی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں سفید پھول کی نسبت پتیوں کو زیادہ انہماک سے دیکھنے لگا۔ جب میں نے ان میں سے ایک دو اوپر اٹھائیں اور اپنی نگاہیں ان پر گاڑ دیں تو لڑکی کا بازو، جو میز پر رکھا ہوا تھا، متحرک ہو گیا۔ یہ آگے بڑھا اور اس کی کن کھجورے کی ٹانگوں جیسی انگلیوں نے پتیاں اپنی گرفت میں لے لیں۔ میں نے انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے لیے قدم آگے بڑھایا۔

''کتنی تیز بو ہے۔ یہ تو میری کھال میں گھسی جا رہی ہے۔ مجھے اس سے بچاؤ۔''

''تم تھک گئے ہو گے۔ ہمارا سفر آسان نہیں تھا۔ تمہیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟''

میں نے بازو بستر پر لٹا دیا اور خود اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں اسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

''کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے پسند آئی ہے۔'' بازو بستر کی چادر کا ذکر کر رہا ہو گا۔ چادر کا رنگ لاجوردی تھا اور اس پر تین رنگوں میں پھولوں کی چھپائی کی گئی تھی لیکن جو شخص وہاں اکیلا رہتا تھا، اس کے لیے یہ مناسب نہیں تھے کیونکہ یہ بے حد شوخ تھے۔ ''تو ہم یہاں رات گزاریں گے۔ میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا، چپ چاپ لیٹا رہوں گا۔''

''کیا؟''

''میں تمہارے ساتھ ہوں گا بھی اور ساتھ نہیں بھی ہوں گا۔''

ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت بہت ملائم تھی۔ اس کے ناخن، جن پر

بڑی احتیاط سے پالش کیا گیا تھا، مدھم گلابی تھے۔ ان کی نوکیں انگلیوں سے آگے نکلی ہوئی تھیں۔

میرے چھوٹے اور موٹے ناخنوں کے مقابلے میں لڑکی کے ناخنوں میں عجیب قسم کا حسن تھا جیسے ان کا کسی انسانی مخلوق سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جس عورت کی انگلیوں کے اسی طرح کے پورے ہوں، وہ شاید عام انسانوں سے بہت اوپر اٹھ جاتی ہے۔ یا وہ شاید خودنسائیت کی تلاش میں نکل جاتی ہو؟ سیپ کا غلاف جو اپنے اندر کی ساخت سے جگمگا اٹھتا ہے، شبنم میں نہائی ہوئی پھول کی پتی............جانی پہچانی مشابہتیں میرے ذہن میں آنے لگیں۔ پھر بھی کسی ایسی سیپ کا غلا یا پھول کی پتی میرے تصور میں نہ آئی جس کی شکل اور رنگت ان ناخنوں سے ملتی جلتی ہو۔ یہ ناخن لڑکی کی انگلیوں پر تھے، ان کا کسی بھی دوسری چیز سے مقابلہ ناممکن تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نازک سے نازک سیپ، کسی مہین سے مہین پتی سے زیادہ شفاف یہ ناخن اپنے اندر المیہ کی شبنم سموئے ہوئے ہیں۔ اس (لڑکی) کی توانائیاں دن رات اس المیہ سے بھرپور حسن کو چمکانے سجانے میں صرف ہوتی رہی تھیں۔ یہ میری تنہائی میں داخل ہو گیا تھا۔ شاید میری تمنا، میری تنہائی نے اسے شبنم میں تبدیل کر دیا تھا۔

میں نے اس کی چھنگلیا اپنے خالی ہاتھ کی انگشت شہادت پر ٹکا دی اور اس کو اپنے انگوٹھے سے رگڑتا ہوا اس کے لانبے، پتلے ناخن کو نگاہیں گاڑ کر دیکھنے لگاے۔ میری انگلی اس کے پوروں کو، جسے ناخن نے پناہ دے رکھی تھی، مس کرنے لگی۔ چھنگلیا اور کہنی دونوں خمیدہ ہو گئیں۔

''گدگدی ہو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہونا تو چاہیے۔''۔

میں نے یہ بات احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر کہہ دی تھی۔ مجھے معلوم تھا اگر ناخن لانبے ہوں تو عورت کی انگلیوں کے پورے بے حد حساس ہو جاتے ہیں اور یوں میں نے لڑکی کے بازو پر اپنا یہ راز فاش کر دیا تھا کہ میری دوسری عورتوں سے آشنائی رہ چکی تھی۔ میں ایک عورت کو جانتا تھا جو عمر کے اعتبار سے تو اس لڑکی سے،۔ جس نے اپنا بازو مجھے ادھار دیا تھا، کوئی خاص بڑی نہیں تھی لیکن وہ مردوں کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں اس سے کہیں آگے تھی۔ اسی نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اگر انگلیوں کے پوروں کو اس طرح

ناخنوں سے ڈھانپ دیا جائے تو وہ اکثر اوقات بے حد حساس ہو جاتے ہیں۔ عورتیں چیزوں کو انگلیوں کے پوروں سے نہیں بلکہ ناخنوں سے چھونے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جب ان انگلیوں کے پورے کسی چیز سے مس ہوتے ہیں، تو ان میں گدگدی ہونے لگتی ہے۔

اس دریافت پر میں نے تعجب کا اظہار کیا تھا اور وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی، ''فرض کرو تم کھانا پکا یا کھا رہے ہو اور کوئی چیز تمہاری انگلیوں سے چھو جاتی ہے اور تمہیں اپنا جسم سکڑتا محسوس ہونے لگتا ہے، تو تمہیں وہ بہت غلیظ معلوم ہونے لگتی ہیں۔''

کیا غلیظ کھانے کی چیز نظر آتی تھی یا ناخن کی نوک؟ جو چیز بھی اس کی انگلیوں سے چھوتی، اپنی ناپاکی کے سبب اس کے جسم میں اینٹھن پیدا کر دیتی۔ اس کی اپنی پاکیزگی ناخن کے لمبے سائے کے نیچے ایسے سے بھرپور شبنم کا قطرہ چھوڑ جاتی۔ تاہم یہ مفروضہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا اس کی دس کی دس انگلیوں میں سے ہر ایک کے ناخن کے نیچے الگ الگ شبنم کے قطرے نمودار ہو جاتے ہوں گے۔

یہ بات بالکل فطری تھی کہ مجھ میں ان انگلیوں کے پوروں کو چھونے کی خواہش اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ مجھے روکنے والی میری تنہائی تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جس کے متعلق جس کے متعلق توقع کی جا سکتی تھی کہ اس کے جسم پر نازک اور حساس مقامات بہت کم رہ گئے ہوں گے۔

اور جہاں تک اس لڑکی کا تعلق ہے جس نے مجھے اپنا بازو ادھار دیا تھا، اس کے جسم پر ایسے مقامات کی تعداد شمار و قطار سے باہر ہو گی۔ اگر میں اس طرح کی لڑکی کی انگلیوں کے پوروں سے چھیڑ چھاڑ کروں، تو مجھے شادی جرم کا نہیں بلکہ محبت کا احساس ہو گا لیکن اس نے مجھے اپنا بازو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کے لیے نہیں دیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ جس مروت کا مظاہرہ کیا تھا، مجھے اسے مسخرگی میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔

''کھڑکی۔'' میرا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ خود کھڑکی کھلی ہوئی ہے بلکہ جو چیز میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کا پردہ ہٹا ہوا ہے۔

''کیا کوئی چیز اندر جھانکے گی؟'' لڑکی کے بازو نے پوچھا۔

''کوئی مرد یا عورت۔ کوئی دوسری چیز نہیں۔''

''کوئی انسان تو مجھے نہیں دیکھے گا۔ اگر کوئی دیکھے گا تو وہ کوئی ذات ہو گی تمہاری''

''ذات؟ یہ کیا ہے؟ کہاں ہے یہ؟''

''بہت دور'' بازو نے کہا جیسے وہ تسلی دینے کے لیے گانا گا رہا ہو۔'' لوگ ذات کی تلاش میں دور دور ہو جاتے ہیں۔''

''کیا وہ اسے پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟''

''بہت دور'' بازو نے ایک بار پھر کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے بازو اور خود لڑکی ایک دوسرے سے لامتناہی طور پر دو ہوں۔ کیا بازو اتنی دور لڑکی کے پاس واپس جا سکے گا؟ کیا میں اسے اتنی دور سے واپس لا سکوں گا؟ بازو آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ اسے مجھ پر اعتبار تھا۔ کیا لڑکی بھی اتنے ہی پرسکون اعتماد کے ساتھ سوئی ہو گی؟ کیا اسے کڑواہٹ کا احساس تو نہیں ہو گا، کوئی ڈراؤنا خواب تو نظر نہیں آئے گا؟ جب اس نے اپنا بازو الگ کیا تھا تو کیا یوں دکھائی نہیں دیا تھا جیسے وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہو؟ بازو اب میرے کمرے میں تھا جہاں لڑکی کبھی نہیں آئی تھی۔ رطوبت نے کھڑکی پر کچھ اس قسم کا بادل تان دیا تھا جیسے کسی مینڈک نے اس پر اپنا پیٹ پھیلا دیا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ دھند نے بارش کو فضا کے درمیان میں روک رکھا ہے اور کھڑکی سے باہر رات فاصلے کا احساس کھو چکی تھی حالانکہ یہ غیر محدود فاصلے میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوئی چھت نظر آ رہی تھی نہ کسی ہارن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''میں کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔'' میں نے پردے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ بھی مرطوب ہو چکا تھا۔ میرا چہرہ، جو میرے تینتیس سال کی نسبت کم عمر دکھائی دیتا تھا، کھڑکی پر منڈلانے لگا۔ تاہم میں نے پردہ گرانے میں کوئی تامل نہ کیا۔ میرا چہرہ اوجھل ہو گیا۔

اچانک مجھے ایک بھول بھٹکی کھڑکی یاد آ گئی۔ ایک ہوٹل کی نویں منزل پر دو ننھی منی بچیاں، جو کھلی کھلی سکرٹیں پہنے ہوئے تھیں، کھڑکی میں کھیل رہی تھیں۔ ایک جیسے کپڑے پہنے وہ بالکل ایک جیسی لگ رہی تھیں، شاید وہ جڑواں بہنیں تھیں۔ وہ مغربی بچیاں تھیں۔ وہ شیشوں کو پیٹ رہی تھیں، اپنے کہنیوں سے انہیں دھکیل رہی تھیں اور ایک

دوسرے سے دھکم دھکا ہو رہی تھیں۔ ان کی ماں کھڑکی کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی اور سویٹر بننے میں مصروف تھی۔ اگر بڑا شیشہ ٹوٹ گیا یا ڈھیلا ہو گیا تو وہ نویں منزل سے نیچے گر پڑیں گی۔ صرف میرے دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ وہ خطرے کی زد میں ہیں۔ ان کی ماں بالکل بے فکر تھی۔ دراصل شیشہ اتنا ٹھوس اور مضبوط تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

''یہ خوبصورت ہے۔'' جب میں کھڑکی سے واپس آیا، بستر پر پڑے بازو نے کہا۔ شاید وہ پردے کا ذکر کر رہا تھا جس پر اس قسم کے پھول بنے ہوئے تھے جیسے کہ بستر کی چادر پر تھے۔

''اوہ! لیکن دھوپ سے اس کے رنگ مدھم پڑ چکے ہیں اور اب ختم ہوا چاہتے ہیں۔'' میں بستر پر بیٹھ گیا اور بازو اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔'' یہ بہت خوبصورت ہے۔ کسی بھی دوسری چیز کی نسبت زیادہ خوبصورت۔''

میں نے اس کی ہتھیلی اپنی دائیں پر رکھتے اور اس کا کندھا اپنے بائیں ہاتھ میں تھامتے اس کی کہنی کو ذرا خم دیا اور ایک بار پھر اس فعل کو دہرایا۔

''عقل سے کام لو۔'' بازو نے یوں کہا جیسے وہ ملائم انداز سے مسکرا رہا ہو۔''مزے لے رہے ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

بازو پر تبسم بکھر گیا، یہ روشنی کی رفتار سے آیا تھا۔ یہ بالکل اس تازہ مسکراہٹ کی مانند تھا جو لڑکی کے رخساروں پر نظر آئی تھی۔ میں اس مسکراہٹ سے واقف تھا۔ وہ اپنی کہنی میز پر جھکا کر ڈھیلے ڈھالے انداز سے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ لیتی اور اپنی ٹھوڑی یا رخسار ان پر ٹکا دیتی تھی۔ اگر کوئی نوخیز دوشیزہ یہ انداز اختیار کرتی تو وہ بہت بھدا اور ناشائستہ نظر آتا۔ لیکن اس لڑکی میں کچھ اس قسم کی ہلکی پھلکی دل پذیر خوبی تھی کہ ''میز پر کہنیاں'' جیسی ترکیبیں بالکل نامناسب معلوم ہونے لگیں۔ شانوں کی گولائی، انگلیاں، ٹھوڑی، رخسار، کان، دبلی پتلی لانبی گردن، بال، سبھی ایک ہی ہم آہنگ حرکت کے ساتھ سامنے آ جاتے اور دل پر چھریاں چلا دیتے۔ وہ اپنی انگشت شہادت اور چھنگلیا کو خم دے کر بڑی مہارت اور سبک دستی سے چھری اور کانٹا استعمال کر رہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً ان دونوں کو ذرا سا اوپر اٹھاتی، لقمہ اس کے ننھے منے ہونٹوں کے اندر جاتا اور وہ اسے اپنے حلق میں

اتار لیتی۔ میرے سامنے کھانا کھانے والی ہستی کم تھی۔ ہاتھوں، چہرے اور حلق کی دل لبھانے والی موسیقی زیادہ تھی۔ اس کے تبسم کی روشنی اس کے بازو کی جلد پر پھیل چکی تھی۔

بازو اسے لیے مسکراتا نظر آ رہا تھا کیونکہ جب میں نے اسے خم دیا تھا تو اس کے نازک لیکن ٹھوس عضلات پر انتہائی نرم و ملائم لہریں بننا لگی تھیں۔ یہ لہریں عام لہریں نہیں تھیں۔ یہ روشنی اور سائے کی لہریں تھیں جو اس کی ہموار اور مسطح جلد پر پھیل چکی تھیں۔ اس سے پہلے جب میں نے لانبے ناخنوں کے نیچے انگلیوں کے پوروں کو چھوا تھا، کہنی کے خمیدہ ہونے پر بازو پر جو روشنی پھیلی تھی، اس نے میری نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ یہی وہ چیز تھی، نہ کہ چھیڑ چھاڑ کا کوئی اضطراری جذبہ، جس نے مجھے اس کے بازو خمیدہ اور پھر سیدھا کرنے پر اکسایا تھا۔ میں رک گیا اور بازو کو، جو میرے گھٹنے پر پڑا تھا، غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر ابھی تک تازہ روشنیاں اور سائے بن اور مٹ رہے تھے۔

''تم پوچھتے ہو کہ کیا میں مزے لے رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تمہیں اپنے بازو میں تبدیل کرنے کی اجازت ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''بہرحال مجھے یہ کرنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

''اوہ؟''

''کر لوں۔''

''بخوشی۔''

میں نے سن لیا تھا کہ مجھے اجازت مل چکی ہے لیکن میں سوچنے لگا کہ میں اسے قبول کروں یا نہ کروں۔ ''ایک بار پھر کہو۔ کہو ''بخوشی۔''

''بخوشی، بخوشی۔''

مجھے یاد آ گیا۔ یہ آواز ایک ایسی عورت کی آواز کی مانند تھی جس نے اپنے آپ کو میرے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ عورت اتنی حسین وجمیل نہیں تھی جتنی کہ وہ لڑکی تھی جس نے اپنا بازو بازو مجھے ادھار دیا تھا۔ شاید اس میں کوئی معمول سے ہٹ کر بات تھی۔

''بخوشی۔'' اس نے مجھ پر اپنی نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیاں اس کے پپوٹوں پر رکھ دی تھیں اور یوں اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اس کی

آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ''یسوع رونے لگا۔ پھر یہودی کہنے لگے دیکھو وہ اس (عورت) سے کتنا پیار کرتا ہے!''

اصل کہانی میں ''اس'' مرد کے لیے استعمال ہوا تھا، عورت کے لیے نہیں۔ یہ مرحوم لعزر (1) کی کہانی تھی۔ چونکہ اپنے آپ کو میرے سپرد کرنے والی خود عورت تھی، اسے کہانی غلط طور پر یاد رہ گئی تھی یا پھر اس نے جان بوجھ کر مرد کو عورت بنا دیا تھا۔

اس کے الفاظ نے، جو اس موقع کے لیے بالکل نامناسب تھے، مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نگاہیں گاڑ کر اسے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا: کیا اس کی بند آنکھوں سے آنسو تو نہیں بہنے لگیں گے؟

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے کندھے اوپر اٹھا دیئے۔ میں نے اسے اپنے بازو سے دھکیل کر نیچے گرا دیا۔

''تم مجھے چوٹ پہنچا رہے ہو!'' اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھتے ہوئے کہا۔

سفید تکیے پر خون کا چھوٹا سا دھبا بن گیا تھا۔ اس کے بالوں میں مانگ ڈال کر میں نے اپنے ہونٹ خون کے قطرے پر رکھ دیئے جو اس کے سر پر اکٹھا ہو رہا تھا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔'' اس نے اپنے بالوں کی تمام پنیں نکال لیں۔ ''میرا خون بہت جلدی نکل آتا ہے۔ ذرا سے لمس سے بھی۔''

دراصل ایک پن اس کے سر کی جلد میں گھس گئی تھی اور وہی خون نکلنے کا سبب بنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے شانے کپکپانے لگے ہیں لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اگرچہ میرا خیال ہے کہ مجھے اس بات کی تفہیم ہے کہ جب کوئی عورت اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کرتی ہے۔ تو وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ تاہم اس فعل میں کوئی نہ کوئی ایسی بات رہ جاتی ہے جس کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ یہ فعل اس کے لیے کیا معنی رکھتا ہے؟ وہ اسے کیوں کرنا چاہتی ہے؟ اسے پہل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کا جسم اسی فعل کے لیے بنا ہوا ہے، میں اس سپردگی کو حقیقتاً کبھی قبول نہیں کر سکا۔ اب بھی، جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے یہ عجیب معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس کی انجام دہی

کے لیے مختلف عورتیں جو طریقے استعمال کرتی ہیں، آپ چاہیں تو انہیں ایک دوسرے سے غیر مشابہ قرار دے سکتے ہیں، چاہیں تو انہیں مشابہ یا بالکل ایک جیسے کہہ سکتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ عجیب نہیں ہے؟ مجھے اس سب کچھ میں جو غرابت نظر آتی ہے، وہ کسی نوخیز مرد کا تجسس یا شاید کسی سال خوردہ شخص کی مایوسی اور جھلاہٹ ہے۔ یا شاید ایک قسم کی روحانی نقاہت ہے جس میں میں مبتلا ہوں۔

سپردگی کے فعل میں اسے جس ذہنی اذیت میں سے گزرنا پڑا تھا، وہ سب عورتوں میں مشترک نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ تو یہ واردات صرف ایک بار ہوئی تھی۔ وہ پہلی دھاگا کٹ چکا تھا، سنہری پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔

''بخوشی۔'' بازو نے کہا تھا اور یوں مجھے دوسری لڑکی یاد آ گئی تھی۔ لیکن کیا درحقیقت یہ دونوں آوازیں ایک جیسی تھیں۔ کیا وہ سننے میں محض اس لیے ایک جیسی معلوم نہیں ہوئی تھیں کہ الفاظ وہی تھے؟ کیا بازو نے اس جسم کی، جس کا یہ جزو تھا، اصلیت معلوم کرتے کرتے اس سے آزادی حاصل کر لی تھی، اور کیا الفاظ کوئی ذمے داری قبول یا پچھتاوے کا اظہار کیے بغیر اپنے آپ کو سپرد کرنے اور ہر قسم کے فعل کے لیے آمادہ ہونے کا اظہار نہیں تھے؟ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں نے دعوت مان لی اور اس بازو سے اپنا بازو تبدیل کر لیا، تو میں لڑکی کے لیے ناقابل بیان اذیت کا باعث بن جاؤں گا۔

میں اپنے گھٹنے پر پڑے بازو کو غور سے دیکھنے لگا۔ کہنی کی اندرونی جانب سایہ تھا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اسے چوس سکوں گا۔ میں نے سائے کو لپیٹنے کے لیے اسے اپنے ہونٹوں میں بھینچ لیا۔

''اس سے گدگدی ہوتی ہے۔ عقل سے کام لو۔'' بازو میرے ہونٹوں سے گریز کرتے ہوئے میری گردن کے گرد لپیٹ گیا۔

''عین اس وقت جب مجھے عمدہ مشروب پینے کو مل رہا تھا۔''

''اور تم کون سا مشروب پی رہے تھے؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تم کیا پی رہے تھے؟''

''روشنی کی مہک؟ جلد کی۔''

معلوم ہوتا تھا کہ دھند مزید دبیز ہوگئی ہے۔ مگنولیا کے پتے بھی مرطوب دکھائی دینے لگے تھے۔ ریڈیو سے اور کون کون سے انتباہ سننے کو ملیں گے؟ میں اپنے ٹیبل ریڈیو کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ بازو کو اپنی گردن میں حمائل کئے ریڈیو سننا بالکل ہی ناقابل برداشت ہوگا۔ تاہم مجھے شبہ ہونے لگا کہ مجھے کچھ اس قسم کی باتیں سننے کو ملیں گی: شاخوں اور خود ان کے اپنے پاؤں اور بازوؤں کے بھیگ جانے کی وجہ سے چھوٹے پرندے زمین پر گر پڑے ہیں اور اڑنے کے قابل نہیں رہے۔ جو کاریں پارکوں میں سے گزرنا چاہتی ہیں، انہیں احتیاط برتنا چاہیے، کہیں وہ ان کے نیچے کچلے نہ جائیں اور اگر نیم گرم ہوا چلنا شروع ہوگئی تو غالباً دھند کا رنگ تبدیل ہو جائے گا۔ عجیب وغریب رنگوں کی دھندیں زہریلی اور بے حد ضرر رساں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر دھند گلابی یا قرمزی ہو جائے تو سامعین کو اپنے دروازے مقفل کر لینا چاہئیں۔

''رنگ تبدیل ہو جائے؟'' میں بڑبڑانے لگا۔ ''گلابی یا قرمزی ہو جائے؟''

میں نے پردہ کھینچا اور باہر دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دھند اپنے کھوکھلے وزن سے نچلی جانب دباؤ ڈال رہی ہے۔ کیا یہ ہوا کے باعث ہے کہ مہین تاریکی، جو کہ معمول کی شبینہ تاریکی سے مختلف ہے، ادھر ادھر حرکت کرتی لگ رہی ہے؟ معلوم ہوتا تھا کہ دھند کی دبازت غیر محدود ہے، اور پھر بھی اس سے آگے کوئی بھیانک چیز بل کھا رہی اور مڑ تڑ رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے جب میں ادھار بازو اٹھائے گھر آ رہا تھا تو اس کار کی، جسے عنابی رنگوں میں ملبوس عورت چلا رہی تھی، اگلی اور پچھلی روشنیاں غیر واضح طور پر دھند میں ابھری تھیں۔ اب مجھے ہلکے قرمزی رنگ کا کوئی بہت بڑا لیکن دھندلا گولا اپنی جانب آتا محسوس ہوا۔ میں تیزی سے پردے سے پرے ہٹ گیا۔

''آؤ، بستر پر لیٹ جائیں۔ ہم بھی۔''

کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب دنیا میں کوئی بھی اور شخص جاگ نہیں رہا۔ جاگنا دہشت کے مترادف تھا۔

اپنی گردن سے بازو کو اتارنے اور اسے بستر پر لٹانے کے بعد میں نے نیا سوتی شبینہ کمونو پہن لیا۔ بازو مجھے لباس تبدیل کرتے دیکھتا رہا۔ اگر کوئی دوسرا مجھے لباس تبدیل

کرتے دیکھ لے تو میں شرما جاتا ہوں۔ اس سے پہلے کسی عورت نے بھی مجھے اپنے کمرے میں کپڑے اتارتے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے بازو سے بازو اٹھائے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ بالکل میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ پھر میں نے ہلکے سے اپنی چھاتی پر رکھ لیا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔

گاہے بگاہے مجھے بارش کی مدھم سی آواز سنائی دے جاتی۔ یہ آواز اتنی زیادہ مدھم ہوتی کہ معلوم پڑنے لگتا کہ دھند بارش میں تبدیل نہیں ہوئی بلکہ خود قطرے بنا رہی ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں جو انگلیاں پکڑ رکھی تھیں، وہ کمبل کے نیچے پہلے کی نسبت زیادہ گرم ہو گئیں۔ اس سے میرے جسم میں انتہائی پرسکون سنسنی دوڑ گئی۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ ان کی گرمی میرے اپنے درجہ حرارت تک نہیں پہنچی تھی۔

''سو گئے ہو؟''

''نہیں۔'' بازو نے جواب دیا۔

''اتنے چپ چاپ تھے کہ مجھے خیال گزرا تم شاید سو گئے ہو۔''

''تم مجھ سے کیا کرانا چاہتے ہو۔''

میں نے اپنے کمونو کے بٹن کھولے اور بازو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ درجہ حرارت کے فرق کا واضح احساس ہونے لگا۔ کسی سبب حبس آلود، یخ بستہ رات میں جلد کی ہمواری خوشگوار لگ رہی تھی۔

روشنیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں انہیں بجھانا بھول گیا تھا۔

''روشنیاں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا اور بازو میرے سینے سے نیچے گر پڑا۔

میں نے اسے جلدی سے اٹھا لیا۔ ''روشیاں بجھاؤ گے؟'' میں نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم اندھیرے میں سوتے ہو یا روشنیاں جلا کر؟''

بازو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے یقیناً معلوم ہو گا۔ پھر اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ مجھے لڑکی کے شبینہ معلومات کا علم نہیں تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کی دو تصویریں بنائیں۔ ایک اس کے اندھیرے میں سونے کی اور دوسری روشنیوں میں سونے کی، اور دونوں کا آپس میں موازنہ کرنے لگا۔ کسی طرح بھی انہیں جلائے رکھنا چاہتا تھا۔

میں بازو پر نگاہیں جمانا چاہتا تھا۔ بازو کے سونے کے بعد میں جاگنا اور اسے بغور دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن انگلیاں دروازے کے قریب سوئچ بند کرنے لگیں۔

میں واپس چلا گیا اور بازو کو اپنے سینے کے قریب رکھ کر اندھیرے میں لیٹ گیا۔ میں چپ چاپ لیٹا رہا اور اس کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔ پتا نہیں وہ اندھیرے سے غیر مطمئن تھا یا اس سے خوف زدہ تھا، وہ میرے پہلو میں ہاتھ کھولے لیٹا ہوا تھا اور پھر کچھ ہی دیر میں پانچوں انگلیاں میری چھاتی پر چڑھنے لگیں۔ کہنی اپنے آپ ہی خمیدہ ہو گئی اور بازو مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

لڑکی کی کلائی میں مدھم سی نبض چل رہی تھی۔ یہ میرے دل پر پڑی تھی۔ چنانچہ دونوں نبضوں کی آوازیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ شروع میں اس کی نبض کی رفتار میری نبض کی رفتار سے قدرے دھیمی تھی لیکن اس کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ دھڑکنے لگیں۔ پھر مجھے صرف اپنی ہی سنائی دینے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تیز کون سی ہے اور سست کون سی۔

اگر میں نے بازو کو اپنے بازو سے تبدیل کرنے کی کوشش کی تو نبض اور حرکتِ قلب کی اس یکسانیت کا دورانیہ شاید بہت مختصر ثابت ہو۔ یا یہ سو گیا ہے؟ میں نے ایک مرتبہ کسی عورت کو کہتے سنا تھا کہ عورتوں پر ہم بستری کے دوران میں سرخوشی کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ ان کے لیے اتنی راحت رساں نہیں ہوتی جتنی وہ جو انہیں اپنے مردوں کے پہلوؤں میں پرسکون نیند سونے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے کبھی کوئی عورت میرے پہلو میں اتنے سکون کی نیند نہیں سوئی تھی جتنا کہ یہ بازو سو رہا تھا۔

مجھے اپنے دل کے دھڑکنے کا اس لیے شعور تھا کیونکہ اس کے اوپر نبض چل رہی تھی۔ وہ دھڑکنوں کے درمیانی وقفے کے دوران میں کوئی چیز برق رفتاری سے کہیں دور بھاگ جاتی اور پھر اسی برق رفتاری سے واپس آ جاتی۔ جب مجھے دھڑکن سنائی دیتی تو معلوم ہوتا کہ فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ تاہم یہ چیز خواہ کتنا ہی دور، لامحدود طور پر دور، چلی جاتی، اسے اپنی منزل پر کچھ نہ ملتا۔ اگلی دھڑکن اسے واپس بلا لیتی۔ مجھے خوف زدہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں ہوا نہیں۔ پھر بھی میں اپنے تکیے کے قریب اندھیرے میں سوئچ ٹٹولنے لگا۔

اسے آن کرنے سے پہلے میں نے کمبل خاموشی سے پچھلی جانب لپیٹ دیا۔ بازو بے سدھ سویا پڑا رہا، اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ انتہائی مدھم

سفید رنگ کی سلیم الطبع پٹی نے میرے ننگے سینے کو گھیر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خود گوشت پوست سے بالکل اسی طرح نکل رہی ہے جس طرح ننھے منے گرم گرم سورج کے طلوع ہونے سے پہلے روشنی نمودار ہوتی ہے۔

''میں نے روشنی جلا دی۔ میں نے اپنے ہاتھ انگلیوں اور شانے پر رکھے اور بازو سیدھا کر دیا۔ میں نے خاموشی سے اسے اپنے ہاتھوں میں الٹایا اور کندھے کی گولائی سے بازو کے اوپر کے حصے تک، جہاں یہ پتلا ہونے لگتا ہے، کہنی کے اندر معمولی نشب تک، وہاں سے بازو کی تنگ ہوتی گولائی سے کلائی، ہتھیلی اور ہاتھ کی پشت اور انگلیوں تک روشنی اور سائے کا جو کھیل جاری تھا، اسے نگاہیں گاڑ کر دیکھنے لگا۔

''میں اسے لے لوں گا۔'' مجھے علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے ہیں۔ بے خودی کے عالم میں میں نے اپنا بازو اتارا اور اس کی جگہ لڑکی کا بازو لگا لیا۔

ہلکی سی ہچکچاہٹ کی آواز آئی۔ یہ بازو کی تھی یا میری، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میرے کندھے میں ہلکی سی اینٹھن ہوئی۔ چنانچہ میں جان گیا کہ تبدیلی کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔

لڑکی کا بازو۔ جواب میرا تھا۔ کپکپا رہا تھا اور سانس لینے کے لیے ہوا تلاش کر رہا تھا۔ میں نے اسے خم دیا اور اپنے منہ کے قریب کر لیا۔

''تکلیف پہنچی ہے؟ تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟''

''نہیں۔ بالکل نہیں۔'' الفاظ بے قاعدگی سے نکل رہے تھے۔

بجلی کی طرح میرے جسم میں کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ میں نے انگلیاں اپنے منہ میں ڈال لیں۔

پتا نہیں کیسے لیکن بہرحال میں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا، لیکن لڑکی کی انگلیاں میری زبان پر تھیں اور میں جو کچھ بھی کہتا، وہ الفاظ کی صورت اختیار نہ کر پاتا۔

''خوب۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' بازو نے جواب دیا۔ کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔'' مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ تم کر سکتے ہو۔ پھر بھی..........''

مجھے کوئی چیز کھٹکی۔ مجھے تو محسوس ہو رہا تھا کہ لڑکی کی انگلیاں میرے منہ میں ہیں، لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں، جو اب میرے دائیں ہاتھ کی تھیں، میرے

ہونٹوں یا دانتوں کو محسوس نہیں کر پا رہی تھیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو جھٹکا دیا لیکن مجھے اس جھٹکے کا احساس نہ ہوا۔ بازو اور کندھے کے مابین رشتہ منقطع ہو چکا تھا، رکاوٹ آ گئی تھی۔

''خون گردش نہیں کر رہا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کر رہا ہے یا نہیں کر رہا؟''

پہلی مرتبہ مجھے خوف نے گھیر لیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا اپنا بازو میرے قریب پڑا تھا۔ مجھ سے علیحدہ ہونے کے بعد یہ اتنا بدزیب ہو گیا تھا کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم بات، کیا نبض تو نہیں رک گئی؟ لڑکی کا بازو گرم تھا اور اس کی نبض چل رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں میرا اپنا بازو یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے یہ سرد ہو رہا ہو اور اس میں اکڑاہٹ پیدا ہو رہی ہو۔ لڑکی کے بازو سے میں نے اپنا بازو پکڑا۔ میں نے اسے پکڑ تو لیا لیکن پکڑنے پر جس تجسس کا احساس ہوتا ہے، وہ مفقود تھا۔

''نبض چل رہی ہے؟'' میں نے بازو سے پوچھا۔ ''کیا یہ ٹھنڈا ہو گیا ہے؟''

''ذرا سا۔ مجھ سے ذرا سا زیادہ ٹھنڈا۔ میں بہت گرم ہو چکا ہوں۔'' آواز کے اتار چڑھاؤ میں خاص طور پر ایک قسم کی نسوانیت تھی۔ اب جب کہ بازو میرے شانے کے ساتھ منسلک ہو چکا تھا اور میرا اپنا بن چکا تھا، یہ اتنا نسوانی معلوم ہو رہا تھا جتنا کے پہلے نہیں ہوا تھا۔

''نبض رکی نہیں؟''

''تمہیں اتنا شکی نہیں ہونا چاہیے، اعتبار کرنا چاہیے۔''

''کس کا؟''

''تم نے اپنا بازو میرے بازو سے تبدیل کر لیا۔ بتاؤ، کیا یا نہیں؟''

''کیا خون گردش کر رہا ہے؟''

''اے عورت! تو کسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے؟'' تم اس عبارت سے واقف ہو؟''

''اے عورت! تو کیوں رو رہی ہے؟ تو کسے ڈھونڈ رہی ہے؟''

''اکثر اوقات رات کو جب میں خواب دیکھ رہی ہوتی ہوں اور میری آنکھ کھل

جاتی ہے تو میں منہ ہی منہ میں اسے دہرانے لگتی ہوں۔''

بہرحال اس مرتبہ کی ''میں'' اس دل فروز بازو کی مالکہ تھی جو اب میرے کندھے پر پیوست تھا۔ انجیل کے یہ الفاظ یوں ادا ہوئے تھے جیسے کسی ادبی مقام پر کسی ابدی آواز نے کہے ہوں۔

''کیا اسے (لڑکی کو) سونے میں مشکل پیش آئے گی؟'' میں بھی خود لڑکی کا ذکر کرنے لگا تھا۔ کیا وہ ڈراؤنے خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوگی؟ دھند کچھ اس قسم کی ہے کہ اس میں ڈراؤنے خواب جوق در جوق آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن رطوبت خود بدروحوں کو بھی کھانسنے پر مجبور کر دے گی۔

''تاکہ تم انہیں سن نہ سکو۔'' لڑکی کے بازو نے، جس کے ہاتھ میں ابھی تک میرا بازو تھا، میرے کان میں کہا۔

یہ اب میرا دایاں بازو تھا، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی تھی، وہ اس لیے نہیں تھی کیونکہ میں یہ چاہتا تھا بلکہ اس کا ذمے دار وہ خود، اس کا دل، تھا۔ لیکن اس کے باوجود علیحدگی کسی لحاظ سے بھی اتنی مکمل نہیں تھی۔

''نبض۔ نبض کی آواز۔''

میں نے خود اپنے دائیں بازو کی نبض سنی۔ لڑکی کا بازو، میرا اپنا بازو، اپنے ہاتھ میں پکڑے میرے کان کے قریب آ گیا تھا اور میری اپنی کلائی میرے کان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ جیسا کہ لڑکی کے بازو نے کہا تھا، میرا اپنا بازو ٹھنڈا تھا۔ وہ اس کی انگلیوں اور میرے کان کی نسبت اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس کا بمشکل ادراک ہو پاتا تھا۔

''میں بدروحوں کو دور رکھوں گا۔'' لڑکی کی چھنگلیا کا نازک ناخن میرے کان میں بھنبھنایا۔ میں نے بے اعتباری سے اپنا سر ہلایا۔ میرے بائیں بازو نے جو شروع سے میرا تھا، میری دائیں کلائی کو، جو درحقیقت لڑکی کی تھی، جھٹکا دیا۔ جب میں نے اپنے سر کو پچھلی جانب جھٹکا دیا، میری نگاہ لڑکی کی چھنگلیا پر پڑی۔

اس کے ہاتھ کی چار انگلیاں اس بازو کو، جو میں نے اپنے دائیں کندھے سے اتارا تھا، پکڑے ہوئے تھیں۔ صرف چھنگلیا، کیا ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ صرف اسے آزادانہ حرکت کی اجازت حاصل تھی؟ ہاتھ کی پشت کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ ناخن کی نوک نے

میرے دائیں بازو کو نرمی سے چھوا۔ چھنگلیا کچھ اس طرح خمیدہ تھی جو امکانی طور پر صرف کسی لڑکی کے لچک دار ہاتھ میں ہوسکتی تھی۔ میرے جیسے مرد میں، جس کے جوڑ سخت ہو چکے ہوں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے جوڑ پر یہ ایک اور دائیں زاویے پر اور اس سے اگلے جوڑ پر بالکل ہی ایک اور زاویے پر جھکی ہوئی تھی۔ یوں اس نے ایک مربع کی شکل اختیار کر لی تھی جس کا چوتھا پہلو انگوٹھی کی انگلی نے متشکل کیا تھا۔

اس نے میری آنکھ کے عین سامنے ایک مستطیل دریچہ بنا دیا تھا، مگر یہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے دریچہ کہنا زیادتی ہے۔ آپ چاہیں تو آپ اسے روزن یا عدسہ کہہ لیں، لیکن پتا نہیں کیوں، میرے ذہن میں دریچہ ہی آیا۔ اس قسم کا دریچہ جس میں بنفشہ کا پھول جھانک سکتا ہے۔ چھنگلیا کا دریچہ، انگلی کے کناروں کا عدسہ، یہ جو کچھ بھی تھا، اتنا سپید تھا کہ اس میں مدھم سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی آنکھ کے قریب کر لیا۔ میں نے دوسری آنکھ بند کر لی۔

''پیپ شو؟'' (2) بازو نے پوچھا۔ ''اور تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟''

''میرا تاریک پرانا کمرا۔ اس کی پانچ روشنیاں۔'' فقرہ ختم بھی نہیں ہو پایا تھا کہ میں چلانے لگا، ''نہیں، نہیں! مجھے یہ نظر آ گیا ہے۔''

''اور تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟''

''یہ غائب ہو گیا ہے۔''

''اور تمہیں کیا نظر آیا تھا؟''

''رنگ۔ بنفشی دھبا اور اس کے اندر چھوٹے چھوٹے دائرے، چھوٹے چھوٹے سرخ اور سنہری منکے۔ یہ بڑی تیزی سے دائرے میں گھوم رہے تھے۔''

''تم تھک چکے ہو۔'' لڑکی کے بازو نے میرا بازو نیچے رکھ دیا اور اس کی انگلیاں نرمی سے میرے پپوٹے سہلانے لگیں۔

''کیا یہ سرخ اور سنہری منکے کسی عظیم دندانے دار پہیے (Cogwheel) کی شکل میں گھوم رہے تھے؟ کیا مجھے کوگ وھیل میں کوئی چیز نظر آئی تھی، کوئی ایسی چیز جو آئی اور غائب ہو گئی؟''

مجھے معلوم نہیں کہ آیا میں نے واقعی کوئی چیز دیکھی تھی یا یہ محض لمحاتی فریب نظر تھا

جس کی ذہن میں یاد باقی نہ رہ سکی۔ مجھے بالکل یادنہیں آ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کیا تھا۔

''کیا تم مجھے فریب نظر دکھانا چاہتے تھے؟''

''نہیں۔ میں تو اسے مٹانے آیا تھا۔''

''گزرے ہوئے ایام کا۔خواہشات اور تاسفات کا۔''

میرے پپوٹوں پر اس کی انگلیوں کی حرکت رک گئی۔

میں نے ایک متوقع سوال پوچھ لیا۔''جب تم اپنے بال نیچے گراتی ہو تو کیا ان سے تمہارے شانے ڈھک جاتے ہیں؟''

''ہاں، وہ ڈھانک دیتے ہیں۔ میں انہیں گرم پانی میں دھوتی ہوں لیکن اس کے بعد، آپ چاہیں تو اسے میری انوکھی ادا قرار دے سکتے ہیں، میں ان پر ٹھنڈا پانی ڈالتی ہوں۔ میرے کندھوں اور بازوؤں، بلکہ میری چھاتیوں کو بھی، جب ٹھنڈے بال چھوتے ہیں، تو اس سے میرے جسم میں جو جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، وہ مجھے پسند ہے۔''

یہ دوبارہ بولنے والی بہرحال لڑکی ہوگی۔ اس کی چھاتیوں کو کبھی کسی مرد نے چھوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سرد بالوں کے چھونے پر اسے ٹھنڈک کا جو احساس ہوتا ہوگا تو اسے بیان کرنے میں اسے دقت پیش آتی ہوگی۔ کیا بازو، جو اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا، شرم وحجاب سے بھی ناتا توڑ چکا تھا؟

میں نے چپکے سے کندھے پر نرم و ملائم گولائی، جو اب میری تھی، اپنے بائیں ہاتھ میں لے لی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی چھاتیوں کی گولائی، جو ابھی بڑی نہیں ہوئی تھی، میرے ہاتھ میں آ گئی ہو۔ شانے کی گولائی چھاتیوں کی نرم و ملائم گولائی بن گئی تھی۔

اس کا ہاتھ ملائمت سے میرے پپوٹوں پر پڑا تھا۔ ہاتھ اور انگلیاں نرمی سے چمٹی ہوئی تھیں اور اندر دھنسی جا رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے لمس سے پپوٹوں کا اندرون گرم ہو رہا ہو۔ حرارت میری آنکھوں میں دھنس گئی۔

''دورانِ خون اب شروع ہو گیا ہے۔'' میں نے چپکے سے کہا۔''یہ جاری ہے۔''

''یہ اس قسم کی حیرت کی چیخ نہیں تھی جیسی وہ تھی جب میں نے دیکھا تھا کہ میرا بازو اس کے بازو سے تبدیل ہو گیا ہے۔ لڑکی کے بازو یا میرے کندھے میں نہ کپکپاہٹ تھی اور نہ تشنج۔ میرے خون نے کب بازو میں گردش شروع کی تھی؟ اور کب لڑکی کے خون

نے مجھ میں؟ کندھے کا انقطاع کب ختم ہوا تھا؟ لڑکی کا صاف ستھرا خون اب، عین اس لمحے، مجھ میں گردش کر رہا تھا، لیکن جب بازو جس میں یہ غلیظ مردانہ خون گردش کر رہا ہو گا، لڑکی کو واپس کیا جائے گا تو کوئی ناخوشگوار صورت حال تو پیدا نہیں ہو گی؟ اور اگر یہ اس کے کندھے سے منسلک نہ ہوا تو پھر کیا ہو گا؟

''اس قسم کی بے وفائی نہیں ہونا چاہیے۔''

''معاملہ ٹھیک ہی رہے گا۔'' بازو نے سرگوشی کی۔

اس حقیقت سے کہ بازو اور میرے کندھے کے مابین خون کی گردش شروع ہو گئی تھی، مجھے کوئی ڈرامائی انداز سے آگہی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ کو، جو میرے دائیں شانے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، اور خود شانے کو، جو اب میرا ہو چکا تھا، اس کی فطرتاً تفہیم ہو گئی تھی۔ وہ اسے جان چکے تھے اور اس علم نے انہیں گہری نیند سلا دیا۔

میں سو گیا۔

میں کسی عظیم موج پر ہاتھ پاؤں مارے بغیر تیر رہا تھا۔ چاروں اور محیط دھند کی رنگت مدھم قرمزی ہو گئی تھی اور جہاں میں، اکیلا میں، عظیم موج پر تیر رہا تھا، وہاں ننھی منی ہلکی سبز لہریں بننے لگی تھیں۔ میرے کمرے کی سرد، تاریک اور ناخوشگوار تنہائی عنقا ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کی انگلیوں نے مگنولیا کی پتیاں پکڑ رکھی ہیں۔ مجھے یہ نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن یہ ان کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم نے تو انہیں پھینک دیا تھا۔ پھر وہ انہیں کب اور کیسے اٹھا لائی تھی؟ پھول کی سفید پتیاں صرف ایک روز کی تھیں اور ابھی گری نہیں تھیں۔ پھر دوسری پتیاں کیوں گری تھیں؟ عنابی رنگوں میں ملبوس عورت کی کار سڑک کے عین درمیان میں میرے گرد بہت بڑا دائرہ بناتی تیزی سے آگے نکل چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا یہ ہماری، میری اور بازو کی، نیند کا جائزہ لینے آئی تھی۔

ہماری نیند غالباً گہری نہیں تھی لیکن اس سے پہلے مجھے کبھی احساس نہیں تھا کہ نیند اتنی نیم گرم، اتنی شیریں ہو سکتی ہے۔ میں ہمیشہ نیند میں کروٹیں لیتا رہتا تھا اور کبھی جی بھر کر نہیں سو پاتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کسی بچے کی نیند سو سکتا ہوں جیسے کہ اب سو رہا تھا۔

لانبا، تنگ اور نازک ناخن نرمی سے میری ہتھیلی کھرچنے لگا۔ اس ہلکے پھلکے لمس

نے مجھے گہری نیند سلا دیا۔ میں غائب ہو گیا۔

اچانک میری چیخ نکل گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں تقریباً بستر سے نیچے گر پڑا اور میں نے لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے تین چار قدم اٹھائے۔ مجھے کسی کراہت انگیز چیز کے لمس نے جگایا تھا۔ یہ میرا دایاں بازو تھا۔

اپنے آپ کو سنبھالتے میں نے بستر پر بازو کی طرف دیکھا۔ میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ میرا دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا اور میرا سارا جسم کپکپانے لگا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بازو دیکھا، اگلے لمحے میں نے لڑکی کا بازو جھٹک کر اپنے کندھے سے اتارا اور اپنا دوبارہ پیوست کر لیا۔ میرا یہ فعل کچھ اس قسم کا تھا جیسے میں نے اچانک اضطراری، شیطانی جذبے کے تحت قتل کا ارتکاب کر دیا ہو۔

میں بستر کے قریب جھک گیا، اپنا سینہ اس کے ساتھ لگایا اور اپنے اس ہاتھ سے، جو دوبارہ میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا، اپنے پاگل دل کو سہلانے لگا۔ جب دھڑکن کی رفتار کم ہو گئی تو مجھ پر گمبھیر اداسی طاری ہو گئی۔ میں اس اداسی سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔

''اس کا بازو کہاں ہے؟'' میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

یہ پلنگ کی پائنتی پر پڑا تھا۔ کمبل کے ڈھیر پر اس کی ہتھیلی کا رخ اوپر کی جانب تھا۔ آگے کو نکلی ہوئی انگلیاں غیر متحرک تھیں۔ مدھم روشنی میں بازو کا رنگ ہلکا سفید تھا۔

خوف و دہشت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میں نے اسے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں اسے یوں چمٹائے ہوئے تھا۔ جیسے آدمی کسی ایسے بچے کو چمٹا لیتا ہے جس کا رشتہ حیات منقطع ہو رہا ہو۔ میں نے انگلیاں اپنے ہونٹوں سے لگا لیں۔

کاش عورت کی شبنم، لانبے ناخنوں اور انگلیوں کے پوروں کے بیچ سے ٹپک پڑے!

حواشی:

(1) لعزر (Lazarus): بائبل میں دو اشخاص کا ذکر آیا ہے جو ہم نام تھے۔ لوقس کی انجیل میں (باب نمبر 16، آیات نمبر 19 تا 31 جس لعزر کو بیان کیا گیا ہے، وہ سدا کا روگی بھکاری تھا۔ یوحنا کی انجیل میں (باب نمبر 11، آیات نمبر 1 تا 44) جس لعزر کا ذکر آیا ہے، وہ مریم اور مارتھا کا بھائی تھا۔ یہ مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ نہیں تھی، بلکہ ان کی مریدنی تھی۔ اس نے حضرت عیسیٰ کو کہلا بھیجا: ''اے خداوند! جسے تو عزیز رکھتا ہے، وہ بیمار ہے۔'' لیکن حضرت عیسیٰ کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ اپنی آمد پر انہوں نے پوچھا: ''تم نے اسے کہاں رکھا ہے؟'' انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ لعزر مر چکا تھا۔ وہ بہت رنجیدہ تھے اور ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ (ویسے انہوں نے بعد میں اسے دوبارہ زندہ کر دیا تھا)۔ اس پر ان کے ساتھ آئے ہوئے یہودیوں نے بقول انجیل یوحنا کہا: ''دیکھو، وہ اس کو کیسا عزیز تھا۔'' (آیت نمبر 26) کہانی کے متن، میں اسی آیت کی طرف اشارہ ہے۔

(2) پیپ شو (Peepshow) ایک قسم کا ڈبا جس کے اندر متحرک یا غیر متحرک تصویریں ہوتی ہیں۔ ان تصویروں کو چھوٹے سے سوراخ پر آنکھیں جما کر دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی زمانے میں میلوں ٹھیلوں پر ان تصویروں کو دکھانے کا عام رواج تھا۔ آج کل ان کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ تصویریں یا فلمیں عام طور پر جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہوتی ہیں۔

اینڈوشوساکو

ایک دن پہلے

اینڈو شوساکو (Endo Shusaku) (1923) جاپان کے ایک رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کے اس پس منظر نے انکی تحریروں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ ابھی وہ گیارہ سال کے تھے کہ ان کی ماں کی تحریک پر، جو کٹر مذہبی عورت تھی، انہیں بپتسمہ دیا گیا اور یوں انہیں جتا دیا گیا کہ وہ عیسائی ہیں اور عیسائی ہی رہیں گے۔

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران میں اینڈو نے فرانسیسی کیتھولک فکشن کا مطالعہ کیا اور پھر 1950ء میں وہ اڑھائی سال کے لیے فرانس چلے گئے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جو اولین جاپانی طلبا مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے گئے تھے، اینڈو ان میں شامل تھے۔ مغرب میں مشرقی اور مغربی ثقافتوں، مشرقِ بعید کی کثرت پرستی اور مغرب کی وحدانیت کے مابین جو کشمکش پائی جاتی ہے، اس نے ان کے ضمیر کو سخت کچوکے لگائے اور انہوں نے اس کے ردعمل کے طور پر 1955ء میں اپنا ناول ''سفید فام'' تحریر کیا جس نے پورے جاپان میں تہلکہ مچا دیا اور انہیں آکوتا گاوا انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اسی سال ان کا دوسرا ناول ''زرد آدمی'' شائع ہوا۔ اس میں جاپان کی اخلاقی زبوں حالی کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں اور جب 1958ء میں ان کا تیسرا ناول ''سمندر اور زہر'' منظر عام پر آیا، جس میں جاپان کے اخلاقی ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے، تو سارے ملک میں ہاہا کار مچ گئی۔

جاپان میں عیسائیت سترہویں صدی میں آئی تھی۔ شروع شروع میں جو لوگ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائی بنے، انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور حکام کے ہاتھوں انہیں طرح طرح کی ایذائیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن ان میں سے بعض لوگ جس استقلال سے اپنے نئے عقیدے پر ڈٹے رہے اور بعض لوگ جس طرح بشری کمزوریوں کا شکار ہوئے، اینڈو نے اسے اپنی بیشتر کہانیوں اور متعدد ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے ان ناولوں میں ''خاموشی'' (یہ 1966 میں چھپا۔ اس کا اردو ترجمہ مسعود اشعر نے کیا اور ''مشعل'' نے شائع کیا ہے) اور ''سمورائی'' (1980) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی اس مجموعے میں شامل کہانی ''ایک دن

پہلے'' بھی اسی نوعیت کی ہے۔ کہانی کی مرکزی چیز حضرت عیسیٰ یا حضرت مریمؑ کا جیبی مجسمہ ہے۔ جاپانی میں اس قسم کے مجسمے کو''فومائی'' (Fumie) کہا جاتا ہے اور یہ عام طور پر لکڑی یا تانبے سے بنایا جاتا ہے۔ سترہویں صدی میں مقامی جاپانی حکام عیسائیوں کا کھوج لگانے کے لیے انہی مجسموں کو استعمال کیا کرتے تھے۔ جو لوگ اپنی جان بچانے، ایذا سے بچنے یا کسی دوسری وجہ سے مجسمے کو پاؤں تلے روند دیتے، انہیں رہا کر دیا جاتا، خواہ ان کے دلی جذبات کچھ اور ہی کیوں نہ ہوتے لیکن جو یہ حرکت کرنے سے انکار کر دیتے، انہیں جیلوں میں بند کر دیا جاتا اور طرح طرح کی ایذائیں ان اک مقدر بنتیں۔ اینڈو کے نزدیک ''فومائی'' انسانوں کے خارجی رویے............ بزدلی یا غداری اور داخلی خواہشات کے مابین مستقل تقسیم کی علامت ہے اور اسی تقسیم کو انہوں نے اپنی اس کہانی میں اجاگر کیا ہے۔

اگرچہ اینڈو کی اکثر و بیشتر کہانیوں کے موضوعات عیسائی عقائد ہیں لیکن انہوں نے ان کے پردے میں بشری کمزوریوں کو جس سادگی لیکن پرکاری کے ساتھ طشت از بام کیا ہے، اس نے ان کا درجہ عام مذہبی کہانیوں سے بہت اوپر اٹھا دیا ہے اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ سچے فنکار کی تخلیق ہیں۔

مغرب میں اینڈو کو ''جاپانی گراہم گرین'' کہا جاتا تھا لیکن حال ہی میں ان کی کتابوں کے ایک درجن سے زیادہ یورپی زبانوں میں تراجم کے بعد ان کے متعلق نقادوں کی رائے تبدیل ہونے لگی ہے اور ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر اگلی صدی کے شروع ہوتے ہوتے گراہم گرین کو ''برطانوی اینڈو'' کہا جانے لگے تو وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کر رہا تھا۔

میں کچھ دنوں سے چاہ رہا تھا کہ وہ فومائی (Fumie) مجھے مل جائے اور اگر مستقلاً نہیں مل سکتا تو بھی کم از کم اس کی ایک جھلک ہی دیکھنے کو مل جائے۔ اس فومائی یا جیبی مجسمے کا مالک صوبہ ناگاساکی کے ضلع سونوکی کے گاؤں دائیمائیو کا باشندہ توکوجیروتھا۔ یہ مجسمہ دراصل مصلوب مسیح کا تانبے کا نقش تھا جو بارہ انچ لمبے آٹھ انچ چوڑے لکڑی کے تختے پر جڑا ہوا تھا۔

جاپان میں عیسائیوں کو مختلف ادوار میں ایذائیں پہنچائی جاتی رہی تھیں۔ اس ایذا رسانی کا سلسلہ یوراکمی کے چوتھے محاصرے کے بعد ختم ہوا اور یہ فومائی اسی محاصرے کے دوران میں استعمال ہوا تھا۔ امریکہ اور جاپان کے مابین 1858ء میں جو معاہدہ طے پایا تھا، اس کی رو سے یہ توقع قائم ہوگئی تھی کہ فومائی کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے گا لیکن بظاہر یہ توقع نقش برآب ثابت ہوئی اور معاہدے کی تکمیل کے بعد عیسائیوں کو کچلنے کی نئی تحریک شروع ہوگئی اور اس کے دوران میں اسے خوب خوب استعمال کیا گیا۔

میرے دل میں اس فومائی کو حاصل کرنے کی تحریک تب پیدا ہوئی جب میں نے ایک کیتھولک کتابچے میں ضلع سونوکی کے گاؤں تاکاشیما کے باسی توگورو کے متعلق پڑھا جو چوتھے محاصرے کے دوران میں اپنے مذہب سے منحرف ہوگیا تھا۔ اس کتابچے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابچے کے مصنف نے اپنے آپ کو ان تاریخی حقائق کو بیان کرنے تک محدود رکھا تھا جن کا تعلق عیسائیوں کو مچلنے کے اقدامات سے تھا اور اس نے توگورو کے متعلق بہت کم معلومات فراہم کی تھیں لیکن میری توجہ کا مرکز وہی بن گیا تھا۔

اتفاق سے ان دنوں فادر این، جن سے سکول کے ایام سے میری دوستی چلی آ رہی تھی، ناگاساکی میں موجود تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں توگورو کے متعلق اپنے احساسات کے بارے میں خط لکھا۔ اپنے جواب میں انہوں نے فومائی کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس امر کا بطور خاص ذکر کیا کہ دائیمائیو کا گاؤں ان کے مذہبی حلقے میں واقع ہے اور محاصرے کے زمانے کا فومائی اسی گاؤں کے ایک باشندے کی، جس کا نام مسٹر فوکائے ہے، ملکیت میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جن سرکاری کارندوں نے عیسائیوں کو کچلنے کی مہم میں حصہ لیا تھا، ان میں مسٹر فوکائے کے اسلاف بھی شامل تھے۔

طے یہ پایا تھا کہ جس روز میرا تیسرا آپریشن ہونا ہے، میں اس سے ایک دن پہلے فومائی دیکھ سکوں گا۔ خیال یہ تھا کہ میرا دوست فادر انوئے ناگاساکی جائے گا اور اسے اپنے ساتھ لے آئے گا۔ تاہم یہ سب کچھ محض میری خاطر نہیں کیا جانا تھا۔ فادر انوئے کے ذمے یہ فریضہ لگایا گیا تھا کہ وہ یہ مجسمہ یوت سویا کے مقام پر جے یونیورسٹی کے اس شعبے میں پہنچا دے گا جس کے فرائض میں عیسائیوں کی دستاویزوں، تصویروں اور دوسری یادگار

اشیاء کو محفوظ کرنا شامل ہے۔ مجھے اس فیصلے پر مایوسی تو ہوئی تاہم مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس قسم کی نادر قیمتی اشیا کا محفوظ کرنا ضروری ہے۔ فادرانوئے نے میری بیوی کو ٹیلی فون پر بتایا کہ اسے اس بات کی اجازت مل جائے گی کہ وہ اسے یونیورسٹی پہنچانے سے پہلے مجھے اس کی ایک جھلک دکھا سکے۔

جب میں ہسپتال کے کمرے میں فادر انوئے کا انتظار کر رہا تھا تو مجھے اونگھ آ گئی۔ کرسمس قریب آ رہی تھی اور مجھے چھت پر کرسمس کے گیت گانے والوں کی ٹولی ریاض کرتی سنائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً نرسنگ سکول کی طالبات تھیں۔ میں گاہے بگاہے اپنی آنکھیں ذرا سی کھولتا، دور فاصلے پر ان گانے والیوں کی آواز سنتا اور انہیں دوبارہ بند کر لیتا۔

مجھے احساس ہوا کہ کوئی شخص آہستگی سے میرے کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا شاید میری بیوی آ گئی ہے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ اگلے روز میرا جو بڑا آپریشن ہونا تھا، وہ اس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہو گی۔ چنانچہ میرے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ وہ آ گئی ہو گی۔

''کون ہے؟''

ایک ادھیڑ عمر شخص نے، جس نے سموری کوٹ اور کوہ پیماؤں کی ٹوپی پہن رکھی تھی، اندر جھانک کر دیکھا۔ میں اسے نہیں جانتا تھا۔ میں نے پہلے تو ایک نظر اس کی غلیظ ٹوپی سے سموری کوٹ تک ڈالی اور پھر نگاہیں جھکا کر اس کے تسمے دار بوٹوں کا جائزہ لینے لگا۔ دریں اثنا میرے دل میں خیال آیا کہ اس شخص کو لازماً فادر انوئے نے بھیجا ہو گا۔

''آپ گرجے سے آئے ہیں؟''

''کیا؟''

''آپ کو فادر نے بھیجا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا، لیکن اس نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

''نہیں۔ میں نے وارڈ میں معلوم کیا تھا اور انہوں نے بتایا آپ شاید خریدنا چاہیں گے۔''

''خریدنا؟ کیا؟''

''آپ کو چھ سوین میں چار مل جائیں گے۔ میرے پاس کتابیں بھی ہیں۔ لیکن

میں آج انہیں نہیں لایا۔''

میرے جواب کا انتظار کرنے کی بجائے وہ اپنی کمر کو بل دیتا اور اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹے سائز کا کاغذی لفافہ نکالتا نظر آیا۔ لفافے کے اندر چار فوٹو تھے جن کے کنارے زرد ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ یقیناً سستی دھلائی تھی۔ دھندلی تصویروں میں کسی مرد کی غیر واضح شکل کسی عورت کی غیر واضح شکل سے بغل گیر ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ پلنگ کے قریب واحد کرسی پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تصویر نواحی آبادی کے کسی سستے اور بے کیف کمرے میں اتاری گئی تھی۔

''آپ کو معلوم ہے کل میرا آپریشن ہونا ہے؟''

''اسی لیے تو میں انہیں لایا ہوں۔'' اس کے پاس ہمدردی کا کوئی بول نہیں تھا۔ فوٹوؤں سے اپنی ہتھیلی کو کھرچتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ''چونکہ آپ کا آپریشن ہونا ہے، آپ انہیں خوش بختی کے تعویذ کے طور پر خرید سکتے ہیں۔ انہیں خرید لیں، آپ کا آپریشن لازماً کامیاب رہے گا۔ کیا خیال ہے سرکار؟''

''آپ اس ہسپتال میں اکثر آتے رہتے ہیں؟''

''یقیناً۔ یہ میرا علاقہ ہے۔''

پتا نہیں وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدگی سے بات کر رہا تھا لیکن اس کے انداز گفتگو سے کچھ اس قسم کا ضرورت سے زیادہ اعتماد جھلک رہا تھا جو ڈاکٹر اپنے مریضوں سے باتیں کرتے وقت اختیار کر لیتا ہے۔ مجھے یہ شخص پسند آیا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ مجھے ان تصویروں میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''خیر..........'' اس کی شکل وصورت سے تاسف جھلک رہا تھا۔ ''سرکار! اگر آپ کو یہ پوز پسند نہیں، پھر کس قسم کا چاہیے؟'' میں نے اسے سگرٹوں کی ڈبیا تھما دی تھی۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور ٹرٹرانے لگا۔

کہیں بھی آدمی نہ تو اتنا بور ہوتا ہے اور نہ اس کے دل میں اس قسم کی تصویریں اور کتابیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے جتنی کہ ہسپتال میں۔ گھوم پھر کر اس طرح کی اشیاء بیچنے کے لیے اس سے بہتر مقام اور کہیں نہیں مل سکتا کیونکہ پولیس کو کبھی شبہ تک نہیں ہوتا۔ اس شخص نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ علاقہ تقسیم کر لیا تھا اور وہ ہسپتالوں کے چکر لگاتا

رہتا تھا۔

''چند دن پہلے روم نمبر ایچ میں ایک شخص مقیم تھا۔ اس نے جب آپریشن سے پہلے یہ تصویریں دیکھیں تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اب میں اطمینان کی موت مر سکوں گا۔''

میری ہنسی نکل گئی۔ مجھے یہ شخص ان رشتے داروں کی نسبت، جو اپنے چہروں پر کرب کا نقاب اوڑھے دبے پاؤں ہسپتال کے کمروں میں داخل ہوتے ہیں، زیادہ پسند آیا۔ جب وہ اپنا سگریٹ ختم کر چکا تو اس نے ایک اور اپنے کان کے پیچھے پھنسایا اور باہر نکل گیا۔

پتا نہیں کیا بات تھی لیکن میری طبیعت شگفتہ ہو چکی تھی۔ پادری تو نہیں آیا تھا البتہ پھیری والا ضرور پہنچ گیا تھا، اور وہ بھی فومائی کی بجائے فحش تصویریں لے کر۔ آج کا دن میرے لیے ایک ایسا دن ہونا چاہیے تھا جب مجھے بہت سی باتوں کے متعلق سوچنا تھا، بہت سے امور کو طے کرنا تھا۔ کل کا آپریشن میرے سابقہ دونوں آپریشنوں کی نسبت مختلف ہو گا۔ ڈاکٹر پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کر چکے تھے کہ میرا خون کثیر مقدار میں بہے گا اور میری زندگی بھی داؤ پر لگی ہو گی کیونکہ میرے پھیپھڑوں کی جھلیاں جڑ گئی تھیں۔ خطرہ اتنا زیادہ تھا کہ انہوں نے آپریشن کرانے یا نہ کرانے کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اپنے چہرے کو اتنا ٹھس بنا لوں گا کہ دیکھنے والے کو یوں معلوم ہو جیسے میں نے اس پر پلاسٹک کا غلاف چڑھا لیا ہو لیکن فحش تصویریں بیچنے والے نے مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وہ اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی اسے خاک میں ملا چکا تھا۔ پھر بھی اپنے طریقے سے وہ مٹیالی تصویریں، جن پر زرد زرد شکلیں تھیں، خدا کی موجودگی کا ثبوت تھیں۔

جب جاگیردار کے کارندوں نے تاکا شیما پر حملہ کیا تھا، دیہاتی اپنی شام کی عبادت میں مصروف تھے۔ فطری طور پر انہوں نے سنتری مقرر کر رکھے تھے لیکن سنتریوں نے ابھی خطرے کی گھنٹیاں بجانا شروع ہی کی تھیں کہ پولیس کے سپاہی دگڑ دگڑ فارم ہاؤس کے گرجے میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

اسی رات چاند کی روشنی میں دس اشخاص کو جن میں کسان تنظیم کے دو رہنما بھی شامل تھے، یورا کمی پہنچا دیا گیا۔ اسے خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی، ان میں توگورو بھی تھا۔ ابتدا ہی سے اس کے ساتھیوں کو پریشانی اور خدشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ توگورو استقامت کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا اور اپنے مذہب سے منحرف ہو جائے گا۔ پختہ عقیدے کے مالک باشندوں کے اس گاؤں میں توگورو بالکل ہی مختلف قسم کا شخص تھا اور اس کی شکل دیکھتے ہی دوسروں کو غصہ آ جاتا تھا۔ اپنے لحیم شحیم جثّے کے باوجود توگورو بزدل تھا۔

ماضی میں مختلف اوقات پر پڑوس کے دیہاتوں کے نوجوان توگورو کو بہلا پھسلا کر جھگڑوں میں گھسیٹ لیا کرتے تھے۔ اگرچہ تن و توش کے اعتبار سے وہ عام آدمی سے دگنا تھا، لیکن ایسے مواقع بھی آ جاتے تھے جب اسے چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا جاتا تھا اور اسکے جسم سے سارے کپڑے اتار لیے جاتے تھے اور وہ محض لنگوٹی پہنے چھپتا چھپاتا واپس تاکاشیما چلا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر اسے جو چیز مزاحمت سے روکے رکھتی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ وہ مار کھانے پر عیسائیوں کی طرح دوسرا گال بھی پیش کرنے کا قائل تھا بلکہ وہ مقابلے سے اس لیے کتراتا تھا کیونکہ وہ اپنے مخالفوں سے خوف کھاتا تھا۔ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ تاکاشیما کے دیہاتی اس سے بدظن ہونے لگے اور پھر اسے حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ تیس کے پیٹے میں داخل ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر کا واحد شخص تھا جسے دلہن نہیں مل سکی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔

دسوں قیدیوں میں گاؤں میں کاچّی کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ وہ بااصول آدمی تھا اور جس روز یورا کمی میں پوچھ گچھ شروع ہوئی، اس سے ایک شام پہلے اس نے توگورو کا حوصلہ خاص طور پر بڑھانے کی کوشش کی۔ ''خداوند اور مریم مقدس ہمیں ہمت اور حوصلہ عطا کریں گے۔ جو لوگ اس دنیا میں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، انہیں جنت میں جگہ ملنے کی ضمانت حاصل ہے۔'' کاچّی نے اسے یقین دلایا۔ توکورو کی ہمت ڈھے چکی تھی اور وہ دوسروں کو کسی آوارہ کتے کی خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، تاہم اپنے ہم مذہبوں کے زور دینے پر وہ ان کے ساتھ مل کر حمدیں گانے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے یورا کمی کے مجسٹریٹ کی عدالت میں تفتیش شروع ہو گئی۔ قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا اور انہیں ایک ایک کر کے گھسیٹ کر ٹھنڈے تفتیشی

کمرے میں، جس کا فرش بجری سے بنا ہوا تھا، پہنچا دیا گیا۔ افسر فومائی لے آئے۔ جو لوگ اپنا مذہب ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، ان کی تیر انداز کی کمان کے ساتھ بے رحمی سے پٹائی ہوئی۔ لیکن جب توگورو کی باری آئی، اس پر ابھی کمان اٹھائی بھی نہیں گئی تھی کہ اس نے اپنا غلیظ پاؤں مسیح کے چہرے پر رکھ دیا اور اسے مسل ڈالا۔ توگورو نے اپنی پرملال، افسردہ اور جانوروں جیسی آنکھوں سے تیزی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جن کے بال بکھرے ہوئے اور جسم خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر افسر اسے دھکے دیتے مجسٹریٹ کی عدالت سے باہر لے گئے۔

''اب ہم آپ کی شیو کریں گے اور آپ کے خون کا نمونہ حاصل کریں گے۔''
اس مرتبہ میرے کمرے میں کوئی نرس آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دھات کی ٹرے اور ٹیکا لگانے کی سرنج تھی۔ اس کا کام جسم کے اس حصے سے باریک بال کاٹنا تھا جہاں کل آپریشن ہونا تھا اور یہ بھی دیکھنا تھا کہ میرے لیے کون سا خون موزوں رہے گا۔

جب اس نے میرے پاجامے کا نیفہ اٹھایا تو یخ ہوا میری جلد میں گھس گئی۔ میں نے اپنا بازو اٹھایا اور جب وہ میری بغل میں ریزر چلا رہی تھی تو میں پوری کوشش کرنے لگا کہ میری ہنسی نہ نکل پائے۔

''اس سے گدگدی ہوتی ہے!''

''جب غسل کریں تو یہاں خوب اچھی طرح صفائی کر لیں۔ یہ بالکل سرخ ہوگئی ہے۔''

''میں اسے دھو نہیں سکتا۔ جب سے سابقہ آپریشن ہوا ہے، یہاں جلد بہت حساس ہوگئی ہے۔ میں اسے رگڑ نہیں سکتا۔''

میری پشت پر خاصا بڑا نشان ہے۔ یہاں میرے کندھے کے آر پار خاصا بڑا چیرا لگایا گیا تھا۔ یہ جگہ پھول چکی ہے کیونکہ یہاں ایک ہی جگہ دو مرتبہ چیرا دیا گیا تھا۔ کل پھر اسی جگہ نشتر چلے گا اور میرا جسم خون سے تربتر ہو جائے گا۔

توگورو کی روگردانی کے بعد باقی نو آدمیوں نے اپنا مذہب چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں کچھ دیر ناگاساکی کی جیل میں رکھا گیا اور پھر اگلے سال 1868ء میں

انہیں کشتی میں سوار کیا گیا اور اونوبیچی کے قرب تسویاما پہنچا دیا گیا۔ اس شام خوب مینہ برسا اور بے چھت کی کشتی میں وہ سب شرابور ہو گئے۔ چونکہ قیدیوں کے پاس صرف وہی کپڑے تھے جو وہ پہنے ہوئے تھے، وہ سردی سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے قریب سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئے۔ جب کشتی ناگاساکی سے روانہ ہوئی تو ایک قیدی کو، جس کا نام ہنجی تھا، ایک شخص نظر آیا جو گودی کے مزدوروں کا لباس پہنے ہوئے تھا اور پانی کے کنارے کھڑا تھا۔

''دیکھو، وہ تو گوروتو نہیں؟''

ان سے دور کھڑا تو گوروان کی طرف انہی افسردہ اور رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو انہوں نے تب دیکھی تھیں جب وہ اپنے مذہب سے منحرف ہو رہا تھا۔ قیدیوں نے اپنی نظریں یوں جھکا لیں جیسے وہ کسی گندی اور غلیظ چیز پر پڑ گئی ہوں اور کسی نے بھی اپنے منہ سے ایک لفظ تک نہ کہا۔

ان نو اشخاص کو قید خانہ تسویاما سے کوئی چوبیس میل دو پہاڑیوں میں واقع تھا۔ اپنی کوٹھری سے انہیں افسروں کا بنگلہ اور ایک چھوٹا سا تالاب نظر آ جاتا تھا۔ شروع شروع میں انہیں کوئی خاص تنگ نہ کیا گیا اور افسران کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے۔ انہیں دن کے دوران میں جو دو بار کھانا ملتا تھا، وہ کم از کم اتنا ٹھیک ٹھاک ضرور ہوتا تھا کہ یہ فاقہ کش کسان اپنے آپ کو احسان مند محسوس کرتے۔ افسر نرم و گداز لہجے سے ہنستے اور انہیں بتاتے کہ اگر وہ اپنا وبال جان مذہب ترک کر دیں تو وہ اور بھی بہتر کھانا کھا سکیں گے اور پہلے کی نسبت زیادہ گرم کپڑے پہن سکیں گے۔

اس سال کے موسم خزاں میں غیر متوقع طور پر چودہ پندرہ نئے قیدی پہنچ گئے۔ وہ سبھی بچے تھے اور تاکاشیما سے آئے تھے۔ شروع میں قیدی حکام کی اس حرکت پر حیران رہ گئے تاہم انہیں خوشی بھی ہوئی کیونکہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد انہیں اپنے خاندانوں کے بعض ارکان سے ملنے کا موقع مل گیا تھا لیکن بہت جلد وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ حکام نے یہ اقدام انہیں نفسیاتی طور پر اذیت پہنچانے کے لیے کیا تھا اور وہ پکار اٹھے کہ بچوں کو خواہ مخواہ ناروا سلوک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

کبھی کبھی قیدیوں کو ملحقہ کوٹھری سے، جہاں بچوں کو مقید کیا گیا تھا، رونے کی،

آوازیں سنائی دیتیں۔ ایک شام ایک قیدی، جس کا نام فوجی فوسا تھا، بچوں کی کوٹھری کی تنگ کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دو لڑکے، جن کے جسم سوکھ کر کانٹا بن چکے تھے، کا بلی مکھیاں پکڑتے اور اپنے منہ میں ڈالتے نظر آئے۔ صاف ظاہر تھا کہ بچوں کو کھانے کے نام کی شاید ہی کوئی چیز دی جا رہی تھی۔ جب دوسرے لوگوں نے یہ خبر سنی، ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

انہوں نے افسروں کے پاؤں پکڑ لیے اور ان سے رو رو کر التجائیں کرنے لگے کہ وہ ان کا نصف ''بڑھیا'' کھانا لے لیا کریں اور بچوں کو دے دیا کریں۔ لیکن ان کی درخواست پائے تحقیر سے ٹھکرا دی گئی۔ تاہم انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ اپنے وبال جان مذہب سے تائب ہو جائیں تو انہیں اور ان کے بچوں کو اتنی عمدہ غذائیں فراہم کر دی جائیں گی کہ وہ سب دنوں میں موٹے تازے ہو کر اپنے پیارے گاؤں واپس جا سکیں گے۔

''لیجئے، سب ہو گیا۔''

نرس نے سرنج باہر کھینچ لی۔ جب میں اس جگہ کو سہلا رہا تھا جہاں سوئی چبھوئی گئی تھی تو وہ خون سے بھری ہوئی شیشی اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے روشنی میں اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کا خون سیاہی مائل ہے۔ ٹھیک؟''

''اگر یہ سیاہی مائل ہے تو کیا اس کا مطلب ہے اس میں کوئی خرابی ہے؟''

''جی نہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی یہ سیاہی مائل ہے۔''

جب وہ باہر چلی گئی تو ایک نوجوان ڈاکٹر جسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا، اندر آ گیا میں بستر میں بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ آپ جیسے لیٹے تھے، بس ویسے ہی لیٹے رہیں۔ میں ڈاکٹر اوکویاما ہوں۔ میں آپریشن سے پہلے مریضوں کو بے ہوش کرتا ہوں۔''

تو یہ ڈاکٹر اوکویاما اگلے روز میرے آپریشن میں مدد کرے گا۔ وہ میرے سینے پر سیٹتھوسکوپ رکھنے کی رسمی کارروائی پوری کرنے لگا۔

''اپنے سابقہ آپریشنوں کے دوران میں آپ جلدی ہوش میں آ گئے تھے؟''

میرے حالیہ آپریشن کے دوران میں ڈاکٹروں نے میری پانچ پسلیاں کاٹ دی

تھیں۔ مجھے یاد تھا کہ جونہی آپریشن اختتام کو پہنچا تھا، میری بے ہوشی کی کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ اس قسم کا درد ہو رہا تھا جیسے کوئی شخص میری چھاتی پر قینچی سے ٹھوکیں مار رہا ہو۔ میں نے اپنی اس اذیت کا ذکر ڈاکٹر اوکویاما سے کیا۔

''اس مرتبہ براہ مہربانی مجھے کم از کم آدھا دن بے ہوش رکھیں۔ پچھلی مرتبہ ناقابل برداشت تکلیف ہوئی تھی۔''

نوجوان ڈاکٹر کے سارے چہرے پے مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''پھر ہم یہی کرنے کی کوشش کریں گے۔''

جب یہ واضح ہو گیا کہ قیدی اپنے مذہب سے منحرف نہیں ہوں گے تو اذیت رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نو کے نو آدمیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں بند کر دیا گیا جن میں وہ بیٹھ تو سکتے تھے لیکن اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہل جل نہیں سکتے تھے۔ سانس کے لیے ان کے ڈبوں میں ان کے سروں کے نزدیک سوراخ ڈال دیئے گئے۔ انہیں حوائج ضروریہ کے علاوہ ڈبوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

اتنے میں موسم سرما شروع ہو گیا۔ سردی اور ضعف نے قیدیوں کا کچومر نکال دیا۔ تاہم اس کی تلافی کے طور پر انہیں ملحقہ کوٹھری میں ہنسی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ افسر چونکہ خود باپ تھے، ان کے دل پسیج گئے تھے اور انہوں نے بچوں کو کھانا دینا شروع کر دیا تھا۔ اپنے اپنے انفرادی ڈبوں میں نو آدمی بند چپ چاپ بیٹھے ان ہنسی کی آوازوں کو سنتے رہتے۔

گیارہویں مہینے کے اختتام پر ایک قیدی، جس کا نام کومے کیچی تھا، انتقال کر گیا۔ ان نو اشخاص میں اس کی عمر سب سے زیادہ تھی۔ وہ سردی اور کمزوری برداشت نہیں کر سکا تھا۔ کاشچی اس بوڑھے شخص کا بہت احترام کرتا تھا اور قید خانے میں جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تھا تو وہ ہمیشہ اس سے مشورہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی موت نے اس کے دل و دماغ پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ کاشچی کے اپنے ڈبے میں جو سوراخ تھا، اس میں سے جھانکتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اس کا اپنا عزم کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ اپنی زندگی میں پہلی بار اسے

اپنے دل میں غدار توگورو کے خلاف نفرت کا احساس ہوا۔

ایک بار پھر دروازہ آہستگی سے کھلا۔ فادر؟ نہیں۔ فحاشی کا سوداگر دوبارہ آ گیا تھا۔

''سرکار!''

''کیا؟ تم!''

''دراصل...... میں آپ کے لیے نیک شگون کا تعویذ لایا ہوں۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں خریدوں گا۔''

''اب کے میں تصویریں نہیں لایا۔ یہ جو میں لایا ہوں، اسے میں مفت آپ کی نذر کر دوں گا۔ پھر اگر آپ کا آپریشن کامیاب رہے، آپ تصویریں اور کتابیں خرید کر میرا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنی آواز اتنی مدھم کر لی تھی کہ بالکل کانا پھوسی بن گئی تھی۔ سرکار! میں آپ کے لیے عورت لا سکتا ہوں۔ اگرچہ یہاں کسی غیر متعلقہ شخص کو آنے کی بالکل اجازت نہیں، آپ دروازہ بند کر سکتے ہیں۔ آپ کے کمرے میں پلنگ ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی!''

''ہاں، ہاں۔''

وہ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے کوئی چیز پکڑے کھڑا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے میرے بستر کے قریب میز پر رکھ دیا۔ میں نے اس پر نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ یہ چھوٹی سی چوبی گڑیا ہے جو پھیری والے کے ہاتھوں کے پسینے اور میل سے غلیظ ہو چکی تھی۔

سردیوں کی آمد پر قیدیوں کو ڈبوں سے نکال لیا گیا تاہم ان کی صبحیں اور راتیں پھر بھی ٹھنڈی کی ٹھنڈی رہیں۔ اپنے عقب کے پہاڑوں سے انہیں کچھ اس قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کوئی چیز چیخ رہی ہو۔ دراصل یہ درختوں کی شاخیں اور تنے تھے جو سردی کی تاب نہ لا کر چٹخنے لگے تھے۔ قید خانے اور افسروں کے بنگلے کے مابین جو چھوٹا سا تالاب تھا، اس پر برف کی ہلکی تہہ جم چکی تھی۔

ایک روز جب شام ہوا چاہتی تھی، افسر آئے اور دو قیدیوں، سیاچی اور تت

سوگورو، کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے ان دونوں کو یخ بستہ تالاب میں پھینک دیا۔ جب ان کے سر سطح آب پر نمودار ہوتے تو وہ ان پر لاٹھیاں برسانے لگتے۔ جب سیاچی اور تت سوگورو اس اذیت ناک سلوک کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے، افسر انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھا کر واپس قید خانے میں لے آئے۔ باقی چھ آدمی کاشچی کی آواز میں آواز ملا کر یا مریم یا مریم! کا ورد کرنے لگے اور آخری دعا کے دوران میں ان کے گلے رندھ گئے اور وہ رو رو کر التجا کرنے لگے، ''یا مقدس مریم! یا مادر خداوند! اس آخری وقت میں ہم گنہگاروں کے لیے دعا فرمائیں۔''

عین اسی لمحے کاشچی کو کوٹھری کی کھڑکی میں سے ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص دکھائی دیا جو کسی بھک منگے کی طرح اپنے گردوپیش نظریں دوڑا رہا تھا۔ یہ شخص، جس کے سر اور داڑھی کے بال کسی جلا وطن کی طرح لاپروایانہ انداز سے بڑھے ہوئے تھے، اس کی طرف مڑا اور کاشچی کے منہ سے بے اختیار نکلا، ''یہ تو گورو ہے!''

دخل انداز کو باہر نکالنے کے لیے ایک افسر آ گیا لیکن تو گورو سر ہلانے لگا۔ اس کے رویے سے یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کوئی پرزور درخواست کر رہا ہو۔ آخر کار افسر نے اپنے ایک رفیق کار کو بلایا۔ وہ دونوں کچھ دیر آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ آخر کار وہ تو گورو کو جیل خانے کی واحد خالی کوٹھری میں لے گئے۔

''وہ تم میں سے ہے۔'' افسروں نے دوسرے قیدیوں کے سامنے اعلان کیا۔ ان کے چہروں سے صاف ٹپک رہا تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہوا کیا ہے۔ جب وہ چلے گئے تو آٹھوں قیدی چپ چاپ بیٹھ گئے اور تو گورو کے اندھیرے میں پاؤں گھسیٹ کر چلنے پھرنے کی آواز سننے لگے۔

''تم کیوں آ رہے ہو؟'' آخر کار کاشچی نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو سب کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ مبہم انداز سے بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اسے خیال آیا کہیں تو گورو حکام کو جاسوس تو نہیں؟ اگر وہ جاسوس نہ بھی نکلا، تو بھی اس کی موجودگی قیدیوں کے حوصلے کو، جو پہلے ہی ڈانواں ڈول ہو چکا تھا، مزید پست کر دے گی۔ کاشچی نے مرحوم کومے کیچی سے سنا تھا کہ حکام اس قسم کے عیارانہ ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

تو گورو کا جواب غیر متوقع تھا۔ اس نے انہیں نرمی سے بتایا کہ وہ اپنی مرضی سے

یہاں آیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو حکام کے سپرد کر دیا ہے۔

''تم؟......''

جب دوسروں نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور اس کا مذاق اڑایا، تو گورو ہکلا کر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ تاہم کاشچی نے ان سب کو چپ کرا دیا۔

''تمہیں معلوم ہے تمہیں یہاں اذیتیں دی جائیں گی؟ اگر تم ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہارا واپس چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔''

توگورو خاموش رہا۔

''مجھے خوف آ رہا ہے۔'' توگورو بڑبڑایا۔

پھر اس کے منہ سے بے اختیار عجیب وغریب بات نکل گئی۔ وہ اس لیے یہاں آیا تھا کیونکہ اسے کوئی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے یقیناً کوئی آواز سنی تھی۔ اس آواز نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ایک بار دوسروں کے پاس چلا جائے۔''ان کے پاس تسویاما چلے جاؤ۔ اگر تم اذیت سے ڈرتے ہو،تم دوبارہ بھاگ سکتے ہو۔ جاؤ، تسومایا چلے جاؤ۔'' اشک بار، ملتجی آواز نے کہا تھا۔

اس رات جو واحد آواز سکوت کو توڑ رہی تھی، وہ پہاڑوں پر شاخوں کے چٹخنے کی تھی۔ قیدیوں نے توگورو کی کہانی پوری توجہ سے سنی۔ ان میں سے ایک نے شکایتی لہجے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا،''خوب کہانی گھڑ کر لایا ہے۔ کیا خیال ہے ساتھیو؟'' اسے محسوس ہوا تھا کہ توگورو نے یہ کہانی اس لیے تراشی ہے تاکہ اس نے دو سال قبل اپنے دوستوں اور ہم وطنوں کے ساتھ جو غداری کی تھی، وہ اسے بھول جائیں اور اسے معاف کر دیں۔''اگر تم اذیت سے ڈرتے ہو، تم دوبارہ بھاگ سکتے ہو۔'' معلوم ہوتا تھا کہ اپنے آپ کو مشکل صورت حال سے نکالنے کے لیے یہ بنا بنایا بہانہ اس کے بڑے کام آئے گا۔

کاشچی اس انداز سے متفق ہونے کے لیے نیم رضا مند تھا لیکن اس کی ذات کا دوسرا حصہ یہ ماننے سے انکاری تھا کہ توگورو ڈھونگ رچا رہا ہے۔ اس رات اسے کسی کل نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ اندھیرے میں توگورو کے جسم کو ادھر ادھر کروٹیں بدلتا سنتا رہا۔

اگلے روز حکام توگورو کو قید خانے سے نکال کر باہر لے گئے اور انہوں نے اسے تالاب میں دھکیل دیا۔ جب توگورو کی بچگانہ چیخوں کی آوازیں قیدیوں کی کانوں تک پہنچیں

تو وہ سب مل کر عقاید کا ورد کرنے لگے۔ انہوں نے دعا کی کہ خداوند! اس کمزور شخص کو شکتی دے۔ لیکن آخر میں انہوں نے جو آواز سنی، اس نے ان کی دعاؤں پر پانی پھیر دیا تھا۔ توگورو نے حکام کے سامنے اپنے مذہب سے دست برداری کا اعلان کر دیا تھا اور اسے تالاب سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

تاہم کاشچی کو یہ جان کر تسلی ہوگئی کہ اس کا یہ شبہ کہ توگورو جاسوس ہے، غلط فہمی پر مبنی تھا۔ ''سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا۔

جب حکام نے توگورو کو رہا کیا تو کسی کو معلوم نہیں کہ اس کے بعد اس پر کیا بیتی۔ 1871ء میں نئی حکومت نے آٹھوں قیدیوں کو رہا کر دیا۔

فادر انوئے پہنچ گئے۔ انہوں نے فحاشی کی تجارت کرنے والے پھیری والے کی طرح آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر آ گئے۔ اگرچہ باہر سردی تھی، ان کے چہرے پر پسینے کی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ہم اپنے سکول کے دنوں میں دوست ہوا کرتے تھے اور اکٹھے فرانس گئے تھے۔ بار برداری کے بحری جہاز میں ہم سامان کے خانے میں قلیوں اور فوجی سپاہیوں کے ساتھ سویا کرتے تھے۔

''میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔''

''آپ کو فومائی نہیں مل سکا؟''

''نہیں۔'' اعلیٰ مذہبی حکام نے اپنے حکم میں ترمیم کر دی تھی اور کسی دوسرے پادری کو فومائی ناگاساکی سے جے یونیورسٹی کے آرکائیوز ڈیپارٹمنٹ تک پہنچانے کا فریضہ سونپ دیا تھا۔

انوئے کی پیشانی پر پیدائشی گہرا سرخ نشان تھا۔ وہ مرکزی ٹوکیو کے کسی چھوٹے سے گرجا کے دوسرے درجے کے پادری تھے۔ ان کے اوور کوٹ کی آستینیں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور ان کی سیاہ پتلون کے گھٹنے پھٹنے کے قریب تھے۔ جیسا کہ میں نے تصور کیا تھا، ان کی شکل کسی نہ کسی طور کوہ پیماؤں کی ٹوپی پہنے شخص سے مشابہ تھی۔ لیکن میں نے انہیں اس ٹاکرے کے متعلق کچھ نہ بتایا۔

انوئے نے مجھے بتایا کہ وہ فومائی کی زیارت کر چکے ہیں۔ اس کا چوبی فریم تقریباً

گل سڑ چکا تھا۔ تانبے کی تختی پر منقش یسوع کی تصویر پر سبزی مائل زنگار نمایاں ہونے لگا تھا۔ یہ غالباً یوراکمی کے کسی دیہی مزدور نے بنائی تھی۔ چہرہ کسی بچے کا گھسیٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ناک اور آنکھیں اس قدر گھس چکی تھیں کہ انہیں پہنچانا مشکل ہو رہا تھا۔ فوکائی وائیمائیو میں مسٹر فوکائے کے مکان کے گودام میں لاوارث پڑا تھا۔

اپنے سگرٹوں کے کش لگاتے ہوئے ہم نے گفتگو کا موضوع تبدیل کر دیا۔ سینٹ یوحنا کی انجیل میں یسوع کے آخری کھانے کا منظر جس طرح بیان کیا گیا ہے، میں نے فادر انوئے سے اس کی تشریح چاہی۔ اس عبارت نے مجھے کچھ عرصے سے کافی پریشان رکھا تھا۔ یسوع نے غدار یہوداہ کو شراب میں بھگویا ہوا نوالہ پکڑاتے ہوئے جو کچھ کہا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا: ''پھر اس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا.......... پس یسوع نے اس سے کہا کہ جو کچھ تو کرتا ہے، جلد کر لے۔''

''جو کچھ تو کرتا ہے، جلد کر لے۔'' صاف ظاہر ہے کہ یہ ان کے ساتھ اس کی غداری کا حوالہ ہے لیکن یسوع نے یہوداہ کو لگا کیوں نہ دی؟ کیا یسوع نے اتنی وی واضح سنگ دلی سے غدار کو جھٹک دیا تھا؟ میں یہی جاننا چاہتا تھا۔

فادر انوئے نے کہا کہ ان الفاظ سے یسوع کے انسانی پہلو کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہوداہ سے محبت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے غدار کو اپنے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھے پایا تو وہ اپنی نفرت کو دبا نہ سکے۔ انوئے کا عقیدہ تھا کہ یہ جذبہ محبت اور نفرت کے اس پیچیدہ مرکب سے مشابہ ہے جو آدمی تب محسوس کرتا ہے جب وہی عورت، جس سے وہ محبت کرتا ہے، اس سے غداری کی مرتکب ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں تھا۔

''یسوع یہاں حکم نہیں دے رہے۔ ممکن ہے امتداد زمانہ کے ساتھ ترجمہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہو۔ یہ کچھ اس طرح ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں: ''تمہیں بہر حال یہ کرنا ہی ہے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتا۔ چنانچہ جاؤ اور کر ڈالو۔'' کیا ان کا مطلب یہی نہیں تھا جب انہوں نے کہا تھا، میری صلیب اسی مقصد کے لیے ہے اور پھر انہوں نے اس صلیب کا ذکر کیا جو انہیں اٹھانا تھی؟ مجبوری کے عالم میں انسان جو خطرناک سے خطرناک تر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، یسوع ان سب سے آگاہ تھے۔''

معلوم ہوتا تھا کہ چھت پر کرسمس کی حمدیں گانے کی جو مشق ہو رہی تھی، وہ اب

ختم ہو گئی ہے۔ ہسپتال کی سہ پہر پر سکوت تھی۔ فادر انوئے کے اعتراضات کے باوجود میں اپنے قدرے بدعتی عقائد پر سختی سے قائم رہتے ہوئے اس فومائی کے متعلق سوچنے لگا جسے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں اپنے آپریشن سے پہلے اس کی زیارت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا اور مجھے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا۔ فادر انوئے خبر لائے تھے کہ بوسیدہ لکڑی کے فریم میں جڑا ہوا مسیح کا نقش اپنی تابندگی کھو چکا ہے۔ جن لوگوں نے اسے اپنے پاؤں تلے روندا تھا، انہوں نے اس کی شکل بگاڑ دی تھی اور یوں آہستہ آہستہ مسیح کا چہرہ دھندلا ہو گیا تھا لیکن خراب صرف مسیح کی تانبے کی تصویر نہیں ہوئی تھی بلکہ اصل نقصان اس سے کہیں زیادہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ جب توگورو نے اسے اپنے پاؤں تلے روندا تھا، تو اسے ذہنی تکلیف ہوئی ہو گی، میں اسے سمجھتا ہوں۔اس قسم کے متعدد لوگوں کی ذہنی اذیت تانبے کے مسیح کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ اور وہ چونکہ انسانوں کے مصائب برداشت نہیں کر پاتے تھے، اس لیے انہیں اتنا رحم آیا کہ وہ زیر لب پکار اٹھے، ''جو کچھ تو کرتا ہے، جلد کر لے۔'' وہ جس کا چہرہ پاؤں تلے روندا گیا اور وہ جس نے اسے پاؤں تلے روندا، دونوں اسی طرح آج بھی پہلو بہ پہلو زندہ ہیں۔

پھر بھی میری حالت یہ تھی کہ پھیری والا جو چھوٹے چھوٹے فوٹو، جن کے کنارے مڑے تڑے تھے اور جن کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی، لایا تھا، وہ ابھی تک مبہم طور پر میرے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں موجود تھے۔ جس طرح ان تصویروں میں عورت اور مرد کے غیر واضح اجسام کراہ رہے اور آپس میں بغل گیر ہو رہے تھے، اسی طرح تانبے کی پلیٹ پر منقش مسیح کا چہرہ اور لوگوں کا گوشت پوست ایک دوسرے سے پیوست ہو رہے تھے۔ دونوں چیزیں عجیب و غریب طریقے سے ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ اس تعلق کو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے جس میں مذہبی مسائل سوال و جواب کی صورت میں سمجھائے جاتے ہیں اور جس کا مطالعہ راہبات کی صحبت میں بچے گرجوں کے عقبی باغات میں کرتے ہیں جہاں ابلتے ہوئے جام کی خوشبو مہکتی ہے۔ میں کئی سال تک ان سوال و جواب کی کتابوں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا اور اس کے باوجود میں تقریباً تیس سال کے بعد صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو واحد چیز سیکھی ہے، وہ محض یہی ہے۔

جب فادر انوئے رخصت ہو گئے تو میں آرام سے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اپنی

بیوی کا انتظار کرنے لگا۔کبھی کبھار تاریک بادلوں کو چیرتی ہلکی پھلکی دھوپ میرے کمرے کو روشن کر دیتی۔ برقی ہیٹر پر دوا کے برتن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔کوئی چیز فرش پر گری اور معمولی سے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ جو چیز گری تھی، وہ خوش بختی کا تعویذ تھا جو پھیری والے نے مجھے دیا تھا: ننھی منی چوبی گڑیا جو اتنی ہی غلیظ تھی جتنی کہ خود زندگی۔

ابے کیرا

دوست

ابے اکیرا (Abe Akira) 1934ء میں ہیروشیما میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بیشتر زندگی ٹوکیو کے قریب کوگے نوما میں گزری۔ جب وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں طالب علم تھے، انہوں نے فرانسیسی ادب کو بڑے مضمون کے طور پر منتخب کیا اور فرانس کے مشہور ناول نگار ستاں دال (ان کے عظیم ناول Le Rouge et le noir) کا اردو میں ترجمہ محمد حسن عسکری نے دو جلدوں میں تھا) کو اپنے مطالعے کا خاص موضوع بنایا۔ تعلیم کے دوران میں یونیورسٹی ڈراموں میں بھی زوروشور سے حصہ لیتے رہے۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ابے اکیرا اکیرا ٹوکیو کی ایک براڈ کاسٹنگ کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے دوران میں وہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو دونوں کے لیے پروگرام تیار کرتے رہے۔ دریں اثناء ان کی کہانیوں کا بھی ادبی حلقوں میں چرچا ہونے لگا تھا۔ چنانچہ انہوں نے 1971ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا سارا وقت تصنیف و تالیف پر صرف کرنے لگے۔

ابے اکیرا کے باپ کی زندگی اچھی نہیں گزری تھی بلکہ ایک لحاظ سے انہیں ناکام انسان ہی کہا جانا چاہیے وہ جنگ عظیم دو میں فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے لیکن جاپان کی شکست نے انہیں اتنا مایوس کیا کہ وہ شکست خوردہ قوم کی جیتی جاگتی علامت بن گئے۔ ابے اکیرا اپنے باپ کی حالت دیکھ کر کڑھتے بھی تھے اور خفت بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کا ایک ناول ''کمانڈر کی چھٹی'' اور متعدد کہانیاں اپنے باپ ہی کی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔

ابے اکیرا کی اکثر کہانیوں اور ناولوں کا تعلق جاپان کی اس مخصوص صنف ادب سے

ہے جسے ''میں۔ناول'' کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے ناول میں مصنف اپنے ذاتی تجربے کا واضح اور بھرپور انداز سے استعمال کرتے ہیں۔ ایبے اکیرا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اگرچہ ان کی بیشتر کہانیوں کے موضوعات پاگل پن، خودکشی اور شرم و ندامت جیسے گمبھیر مسائل ہیں، تاہم وہ روز مرہ کے واقعات اور غیر اہم تفصیلات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ حیات و ممات کی گتھیاں نہیں سلجھاتے اور نہ جذباتیت اپنے قریب پھٹکنے دیتے ہیں۔ وہ معمولی انسانوں کی معمولی مصروفیات اور دلچسپیوں کو آپس میں گوندھ کر ایسا فن پارہ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس میں نفسیاتی گہرائی بھی ہوتی ہے اور وسیع تر دنیا کی چاشنی بھی۔

ایک روز اتفاق سے یوہرا شیما میرے دفتر آ گیا۔

''ہتوری کی حالت خاصی پتلی ہے۔'' اس نے چھوتے ہی کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے کام پر بھی نہیں جا رہا۔'' ''تو وہ پھر بستر سے لگ گیا ہے؟'' اپنے ڈیسک پر بیٹھے میری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ ہتوری کی بیماری میرے اور یورا شیما کے مابین پاس ورڈ (Password) بن چکی تھی۔

''اس مرتبہ اس کی حالت واقعی خستہ نظر آ رہی ہے۔''

''بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ یورا شیما نے کرسی گھسیٹ لی۔ ہم کتنی مرتبہ اس کے متعلق گفتگو کر چکے ہیں؟ میں ہنسا ضرور تھا حالانکہ میرا ارادہ اپنے دوست کی بدقسمتی کا مذاق اڑانے کا قطعاً نہیں تھا۔ ہم نے ہتوری کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے مسئلے کے بارے میں اکثر باتیں بھی کرتے رہے تھے لیکن سچ پوچھیں تو ہمارے لیے یہ موضوع ہمیشہ ہی اذیت ناک رہا تھا۔ ''تو وہ پھر بستر سے لگ گیا ہے؟'' کہنے کو تو میں نے یہ الفاظ کہہ دیئے تھے لیکن ان کی گونج سے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اتنا سنگدل ہو گیا ہوں کہ اب میں اس قسم کی بے اعتنائی کے کلمات بھی کہہ سکتا ہوں۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے ہتوری کو بڑے شگفتہ عالم میں دیکھا تھا حالانکہ اس وقت وہ کچھ اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے وہ رات ہماری صحبت میں گزاری تھی۔ ہم تو وسکی سے شغل کر رہے تھے لیکن وہ بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بار بار گولیاں نکالتا

جو ڈاکٹر نے اسے دی تھیں اور انہیں اپنے حلق میں اتار لیتا۔

ہتوری کو خود بھی اپنے مسئلے کا احساس تھا۔ ''میں بالکل گھبرا جاتا ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ میں دوسروں کی سنتا ضرور ہوں لیکن جواب نہیں دے پاتا۔ میں الفاظ استعمال نہیں کرتا...... بس آنکھیں جھپکاتا رہتا ہوں۔ لوگ مجھ سے باتیں کرتے ہیں لیکن میں انہیں جواب نہیں دے سکتا اور نہ انہیں بتا سکتا ہوں کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ میں ہمہ وقت دل کی بس دل میں رکھتا ہوں۔

کسی کو اسے بتانے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ وہ ہسپتال میں داخل ہو جائے۔ وہ خود ہی وہاں پہنچ جاتا۔ وہ کم از کم ایک مہینہ اور بعض اوقات تو تین تین چار چار مہینے اپنے کام پر حاضر نہ ہوتا۔ اس کی غیر حاضری پر کسی کو تعجب نہ ہوتا۔ ہر شخص کو اس کی ''چھٹیوں'' کا علم ہو جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے کیمرا کاروں کو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ ہوتا تھا کیونکہ جب ہتوری کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو اسے سٹوڈیو کا بہترین عکاس تصور کیا جاتا تھا۔ جب ہم تینوں اکٹھے کام کر رہے ہوتے یا مے نوشی کے لیے کسی ریستوران میں بیٹھ جاتے، ہتوری کے منہ کو اچانک چپ لگ جاتی اور اس پر میں اور یوراشیما پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ جب اس کے مرض میں علامتیں بدتر ہونے لگیں تو اس نے آنکھیں جھپکانا بھی بند کر دیں۔ وہ شیر خوار بچے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگتا اور اپنے گرد و پیش کی ہر چیز فراموش کر دیتا۔ وہ اپنی سوجی ہوئی لال انگارا آنکھیں ایک ہی جگہ یوں مرکوز کر دیتا جیسے وہ انسان نہ ہو، کوئی مجسمہ ہو۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہوتا، اس کے لیے ہم جزوی طور پر اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتے۔ وہ گم صم ہو جاتا تھا۔ ہمیں چاہیے تو یہ تھا کہ ہم اسے آرام کا موقع دیتے۔ اس کی بجائے ہم اس کی بیماری کو نظر انداز کر دیتے اور جیسا کہ ہمارا ہمیشہ وتیرہ رہا تھا، ہم رات کو اسے اپنے ساتھ گھمانے پھرانے لے جاتے۔

جب وہ کام پر آتا بھی تو ہمیں صاف نظر آ جاتا کہ وہ اور زیادہ اپنے آپ میں گم رہنے لگا ہے۔ ایک مرتبہ جب ہم اس کے ساتھ کسی ڈاکومنٹری فلم پر کام کر رہے تھے تو اس نے عجیب و غریب اشیا کی تصاویر بنانا شروع کر دیں۔ ہمیں جن لوگوں کی فلم بنانے کیلئے بھیجا گیا تھا، وہ بتدریج ان سے اکتا گیا اور اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔ وہ فلم کا رول

(Roll) نکالتا، کیمرے میں ڈالتا اور پوری احتیاط اور انہماک سے عکاسی شروع کر دیتا۔ یوں اس نے یکے بعد دیگرے کئی رول صرف کر دیئے۔ وہ ہر اس چیز پر............ کسی مڑے تڑے اور گلے سڑے درخت کا کھوکھلا ابھار، کوئی شکستہ پرنالا، کسی بچے کی پرانی ٹرائیکل جسے وہ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا، ہوا میں پھڑ پھڑاتے پتے...... جو اسے نظر آتی، اپنا کیمرا مرکوز کر دیتا لیکن جس موضوع پر ہمیں فلم بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔

ہم میں سے بعض لوگ اس سے ہمدردی جتاتے ضرور تھے لیکن کسی کو بھی اس کے صحت یاب ہونے کی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ جو اشخاص ہتوری کی مہارت، قابلیت اور شہرت سے خار کھاتے تھے، اب انہیں اس کے جانشین بننے کا موقع مل گیا۔ اس کی بیماری نے انہیں کامل موقع فراہم کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے زیادہ اہمیت کی فلموں سے ہٹا دیا گیا۔ ''وہ اپنے آپ میں نہیں۔'' وہ جواز پیش کرتے اور اسے غیر اہم کام تفویض کر دیتے جو نو آموزوں کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ ہتوری اتنا منجھا ہوا اور تجربہ کار کیمرا کار تھا کہ اسے اپنی تنزلی قبول کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ ہمیں نظر آ رہا تھا کہ تذلیل اور پریشانی اسے آہستہ آہستہ اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں۔

اگرچہ اسے کوئی خاص ذمے داری نہیں دی گئی تھی پھر بھی وہ صبح سویرے اپنے دفتر پہنچ جاتا اور پورے آٹھ گھنٹے اپنی ڈیسک پر گزر دیتا۔ وہ وہاں بیٹھا سگرٹوں کا دھواں اڑاتا اور خلا میں گھورتا رہتا۔ اس کے رخسار پھول چکے تھے۔ وہ کسی سے شاذ ہی کبھی بات کرتا تھا۔ اس کی ڈیسک پر کاغذ کا پرزہ...... بلکہ گرد کا ذرہ تک نہ ہوتا۔ وہ پوری طرح صحت یاب ہونے سے پہلے یہ اپنی ''چھٹیوں'' سے واپس آ جاتا۔ اسے چاہیے تھا کہ ابھی وہ مزید انتظار کرتا، لیکن وہ اپنے اوپر جو جبر کرتا تھا، اس سے معاملہ مزید بگڑ جاتا اور اسے دوبارہ ہسپتال میں داخل ہونا پڑتا۔ پہلے وہ سال کے دوران میں ایک مرتبہ ہسپتال میں داخل ہوتا تھا، پھر وہ دو دو تین تین بار ہونے لگا۔ اب اس کے ہسپتال میں قیام کے وقفے مختصر سے مختصر تر ہونے لگے اور اس کی دفتر سے غیر حاضری کے ایام بڑھتے چلے گئے۔

یورا شیما نے آنے سیپ ہلے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اب ہتوری کی طبیعت کیسی ہے، اس کی بیوی کو ٹیلی فون کیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس نے کیا جواب دیا تھا۔

وہ ہچکچایا۔ ''میرا خیال ہے وہ نہیں چاہتی کہ ہم اسے ملنے جائیں۔'' اس نے کہا۔

''اوہ!''

''ادویات کے استعمال سے اس کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔'' یورا شیما نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چہرہ وہ نہیں رہا جو ہوا کرتا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ اب دوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔'' مجھے کوفت ہونے لگی تھی کیونکہ یورا شیما نے اپنی آواز جبلی طور پر دھیمی کر لی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں کوئی دوسرا شخص اس کی بات نہ سن رہا ہو۔

''تمہارے خیال میں وہ ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہو گا؟''

''شاید۔'' معلوم ہوتا تھا کہ اسے جواب دینے میں تامل ہے اور اس کے لہجے سے بے اطمینانی جھلک رہی تھی۔

آخر کار ہم نے ہسپتال جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں موجودہ حالت میں ہتوری کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں ہم ایک مرتبہ پہلے وہاں جا چکے تھے۔ ایک سہ پہر اسے ملنے کی غرض سے ہم ذرا قبل از وقت دفتر سے کھسک گئے تھے۔ جب ہم شام کو اس سے رخصت ہوئے تو ہم نے کہیں ایک آدھ گھونٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہماری آپس میں بات تو کوئی نہ ہوئی لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ اسے اس حالت میں دیکھ کر ہم سیدھے گھر نہیں جا سکتے۔ وہ مے نوشی کا شوقین تھا لیکن چونکہ یہ اس کے لیے ممنوع قرار دی جا چکی تھی اس لیے ہم نے سوچا کہ اس کا حصہ بھی ہم خود ہی پی لیتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بار بار کہتے تو یہی رہے کہ جو کچھ ہم دیکھ کر آئے ہیں، اس سے طبیعت بجھ گئی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم نے خوب لطف اٹھایا۔

''کیا خیال ہے ہم کچھ زیادہ ہی تو نہیں پی گئے؟'' میں نے یورا شیما سے پوچھا

''وہ بہت جلد دائمی معذور بن جائے گا اور ہم پھر بھی اپنا غم ڈبونے یہاں آتے رہیں گے۔''

ہم اس کے لیے کیا کر سکتے تھے؟ میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ یورا شیما کو بھی میرے جواب سے یہی محسوس ہوا کہ میرے خیال میں ہتوری کے صحت یاب ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ پرامید تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ

اس کے ذہن پر کوئی احساس جرم سوار نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہتوری صحت یاب ہو جائے تاکہ وہ دوبارہ اس کے ساتھ کام کر سکے۔ جب ہتوری موجود نہیں ہوتا تھا، اس کا کام پوری طرح معیار کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔

ہم جو کچھ محسوس کرتے تھے، اس کے باوجود ہم سمجھ گئے کہ ہم ہتوری کے متعلق جس تشویش کا اظہار کر رہے ہیں، وہ اس کی بیوی کو پسند نہیں۔ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ہمارا تعلق اس کمپنی سے تھا جو اس کے شوہر کی بیماری کی ذمہ دار تھی۔ جیسے اس کی اپنی صورت حال کافی مشکل نہ ہو اسے اپنے بچوں کو بھی جو ابھی ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے، سکول لے جانا اور وہاں سے واپس لانا پڑتا تھا۔ ہتوری اکثر ہمارے ساتھ اپنی بیوی کے متعلق باتیں کیا کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عام قسم یک گھریلو عورت ہے۔

''جس محلے میں ہم رہتے ہیں، وہاں آبادی بہت گنجان ہے۔'' ہتوری نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا۔ ''اتنی گنجان کہ آدمی اپنے گھر میں بھی ٹھیک سے آرام نہیں کر سکتا۔ جب ہم نے شادی کے بعد یہ مکان بنوایا تھا، اس وقت اردگرد کا علاقہ تقریباً غیر آباد تھا۔ ایک رات میری بیوی غسل کر رہی تھی کہ کوئی شخص کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ وہ چیخیں مارنے لگی اور میں باہر بھاگا لیکن وہ پہلے ہی کہیں غائب ہو چکا تھا......وہ مجھے بتایا کرتی تھی کہ وہ کتنا تنہا محسوس کرتی ہے۔ یاد ہے اس زمانے میں سٹوڈیو نیا نیا بنا تھا؟ یہ ہمارے لیے سب کچھ تھا۔ ہم دن رات کام کیا کرتے تھے۔ ہماری بیویوں کو ہماری صاف ستھری قمیصیں اور جانگیے دفتر لانا پڑتے تھے............ہمیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ گھر جا سکیں۔ اپنی شادی کے پہلے سال کے دوران میں میں ہمہ وقت سفر میں رہا۔ ہنی مون کے لیے کس کے پاس وقت تھا؟ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ ایک رات جب مجھے گھر جانے کا موقعہ مل ہی گیا اور میں سٹیشن سے باہر نکلا، میری بیوی ہمارا بچہ بازوؤں میں اٹھائے گیٹ کے باہر کھڑی رو رہی تھی۔ حالات اتنے خراب تھے تم کسی روز میرے گھر آؤ۔ تمہیں مل کر میری بیوی بہت خوش ہو گی۔''

ایک روز جب میری چھٹی تھی، میں واقعی انہیں ملنے چلا گیا۔ اگرچہ ہتوری کی بیوی کوتاہ قامت تھی لیکن وہ قابل اعتبار قسم کی عورت دکھائی دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہاتھوں میں تھامے گیٹ پر کھڑی رو رہی ہو گی۔ مجھے احساس ہوا

کہ ہتوری کو ایک ایسے شخص کا قرب حاصل ہے جس پر وہ بھروسا کر سکتا ہے اور مجھے یوں لگا جیسے میرے کندھوں سے بوجھ اتر گیا ہو۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، وہ بولی، ''یہ صبح سے خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق پریشان ہو رہے ہیں۔ کبھی کہتے، تمہیں انوئے کے لیے غسل خانے کی خوب اچھی طرح صفائی کرنی چاہیے اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی اس کام میں جیت جاتے ہیں۔ پھر خود ہی راہداری میں جھاڑن پھیرنے لگتے۔ کبھی وہ باورچی خانے میں آ دھمکتے اور مجھ سے پوچھنے لگتے، تم نے یہ خریدا؟ وہ خریدا؟''

آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ ہی لیا، یہ مسٹر انوئے کیا شے ہیں؟''

وہ خاصی مہمان نواز تھی لیکن وہ مجھے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی جیسے کوئی چیز اسے پریشان کر رہی ہو۔ شاید مجھے غلطی لگی ہو لیکن شروع میں مجھے اس کے لہجے میں تمسخر جھلکتا نظر آیا جیسے اسے اس بات پر جلن ہو کہ ہم مرد ایک دوسرے کے کیوں اتنا قریب ہیں۔

''یہ ہمیشہ سے اسی طرح کے ہیں۔ یہ جس چیز میں بھی............خواہ یہ ان کا کام یا ان کے دوست کا............ مصروف ہوتے ہیں، اس میں پوری طرح کھب جاتے ہیں اور باقی سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں۔ اس سے مجھے تقریباً خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔'' اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑی بہن ہو اور اپنے سدا کے روگی بھائی کے متعلق گفتگو کر رہی ہو۔

اس رات میں اور ہتوری سلسلے میں کوئلے جلا کر اس کے سامنے بیٹھ گئے اور اپنے پاس چاولوں کی شراب کی بوتل رکھ لی۔ ہمارے پیچھے ہیٹر پڑا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے شراب کی بوتل اس پر کیتلی میں گرم کی تھی۔ جب ہم مے نوشی میں مشغول تھے، دو بلیاں، جنہیں اس کی بیوی اندر لے آئی تھی، ہمارے ارد گرد مٹر گشت کرتی پھر رہی تھیں۔ ہتوری انہیں یوں پکارنے لگا جیسے اسے ابھی ابھی ان کے نام یاد آئے ہوں۔ پھر اس نے خشک مچھلی کا ٹکڑا ان کے سامنے پھینک دیا۔ اس کا چہرہ لالوں لال ہو رہا تھا اور وہ بے حجاب گفتگو کیے جا رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں پہلی مرتبہ کب بیمار ہوا تھا؟ یہ تب کی بات ہے جب ہم سینڈائی کے قریب مچھیروں کے ایک گاؤں میں اپنی ڈیوٹی دینے گئے تھے۔ یمایا وہیں

تھا...... تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ ابھی تک میرے سیکشن میں کام کرتا ہے۔ ہمیں کسی تباہ شدہ بحری جہاز کی کہانی فلمانا تھی اور ہم قریب ہی ایک عام سے ہوٹل میں مقیم تھے۔ بھلا یہ کب کی بات ہے؟ مجھے ذرا سوچنے دیں...... خیر، ایک روز کام کے بعد ہم سب اکٹھے ہوٹل چلے گئے۔ ہم نے غسل کیا اور پھر پینے پلانے بیٹھ گئے۔ دوسرے تو مے نوشی کرتے رہے مگر پتا نہیں کیوں، میں اگلے روز کی فلم بندی کے متعلق سوچ بچار میں مستغرق ہو گیا۔ پھر میں اٹھا اور جس جگہ فلم بندی ہونا تھی، اس کا جائزہ لینے سمندر کے ساحل پر چلا گیا۔ تاہم وہاں مجھے کچھ خاص نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ رات ہو چکی تھی۔ جب اس بات کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو پھر مجھیا عتراف کر لینا چاہیے کہ میں پہلے ہی عجیب و غریب رویہ اختیار کرنے لگا تھا۔

''میں نے اندھیرے میں بندرگاہ پر نظر ڈالی اور واپس ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ درحقیقت یہ ہوٹل کم اور ہوسٹل زیادہ تھا، لیکن اس کے ساتھ باغیچہ ضرور تھا۔ وہاں سے آدمی سیدھا ساحل پر جا سکتا تھا۔ واپسی پر میں باغیچے میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے یمایا اور روشنی کا انچارج ایواما ایک درخت کے سائے میں باتیں کرتے سنائی دے۔ اسے کام کا جو معاوضہ ملتا ہے، وہ اس پر پورا نہیں اتر رہا۔ وہ تو اپنے فرائض بھی ڈھنگ سے سر انجام نہیں دے سکتا اور اوپر سے ڈھٹائی سے اپنے آپ کو ہم چوما دیگرے نیست سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ یمایا کہہ رہا تھا۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، مجھ سے ایک قدم بھی نہ اٹھایا جا سکا۔ اس روز میں نے ساحل پر سخت محنت کی تھی۔ میں نے اتنا کام کیا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اب گرا کہ اب گرا۔ میرا کوٹ اور پتلون پسینے میں شرابور ہو چکے تھے لیکن میں سارا دن بھاری بھرکم کیمرے کو ادھر ادھر اٹھائے پھرتا رہا اور جب میں واپس ہوٹل پہنچا، میرے دل میں جو واحد خیال سمایا ہوا تھا، وہ اگلے روز کا کام تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، اس کے کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے یمایا پر ہمیشہ اعتماد کیا تھا۔ میں ہمیشہ عین وہی کرتا رہا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ وہ خواہ مخواہ میرے خلاف ہو گیا اور میرے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ اگر وہ یہ سب کچھ میرے منہ پر کہتا تو قصہ مختلف ہوتا، لیکن جب میں وہاں موجود نہیں تھا اس نے کسی کو گھیر لیا اور اس کے سامنے میری برائیاں کرنے لگا۔ میری طبیعت سخت منغض ہوئی۔ مجھے بے حد دکھ پہنچا۔ میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ یمایا اس قسم کا آدمی ہے۔ اس باغیچے میں کھڑے کھڑے، جہاں ہاتھ کو

ہاتھ سجھائی دے رہا تھا، میں خواہش کرنے لگا، کاش میں نے اسے غلط سنا ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اگر میں صرف ایک منٹ پہلے یا بعد میں آیا ہوتا تو میں اسے یہ کہتے نہ سن پاتا...... میں درخت کے سائے میں چھپ گیا تا آنکہ یمایا اور ایواما باغیچے سے چلے گئے۔ پھر میں دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا اور دوسروں سے پہلے سو گیا۔'' ہتوری نے اس مقام پر اپنی گفتگو بند کر دی۔ اسے سانس لینے میں دقت پیش آ رہی تھی اور اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا تھا۔

''اگلے روز ہم اس مکان میں گئے جہاں وہ مچھیرا رہتا تھا جو ڈوب کر ہلاک ہوا تھا۔ ہم اس کی بیوہ کے متعلق فلم بنا رہے تھے۔ اپنے شیر خوار بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے وہ اپنے مرحوم شوہر کے تابوت سے چمٹ گئی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے سارا قصور میرا ہو۔ میں اس کے سامنے جھک گیا اور گڑگڑا کر معذرتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے بار بار التجا کی کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میں یہ کرنے پر مجبور تھا ورنہ میں زندہ نہ رہ سکتا گھٹنوں کے بل بار بار جھک کر میں اس سے معافی کی درخواستیں کرتا رہا۔

''میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا اور وہ مجھ پر ترس کھا کر رونے لگی۔ میرے ذہن میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ میں اس کے خاوند کو ہلاک کر چکا ہوں اور میرا اس کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے۔ میں اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوا۔ میں نے اپنا کیمرا اٹھایا اور ننگے پاؤں اس کے گھر سے بھاگ نکلا۔ میں واپس ہوٹل چلا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں...... میرا خیال ہے کہ یمایا نے فلم بندی کا کام منسوخ کر دیا تھا اور اس نے بذریعہ ٹیلی فون ٹوکیو سے درخواست کی تھی کہ ہماری واپسی کا بندوبست کیا جائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ بار بار کہہ رہا تھا ''ہتوری! فکر نہ کرو۔ ہم بہت جلد واپس چلے جائیں۔ فکر نہ کرو۔''

وہ باقی سب باتیں بھول چکا تھا۔ سینڈائی سے واپسی کے دوران میں وہ بظاہر لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا اتسونومیا کے سٹیشن پر گاڑی سے نیچے اترا اور پلیٹ فارم پر لیٹ گیا۔ وہ یمایا سے التجائیں کرنے لگا کہ وہ اسے ملازمت سے فارغ کر دے۔ کمپنی نے ہتوری کے عجیب وغریب رویے کے متعلق اس کی بیوی کو مطلع کر دیا اور جب وہ دیکھ چکی کہ وہ کتنا پریشان ہے، وہ زار وقطار رونے لگی۔

ہتوری کے متعلق خبر بہت جلد ساری کمپنی میں پھیل گئی۔ ہم جہاں بھی چسکی لگانے جاتے، اس کے ''بریک ڈاوَن'' کا مذاق اڑایا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں، اس کی اطلاع ہر شخص تک پہنچانے کے لئے یمایا اور ایواما کو ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

لیکن کیا واقعی یہ یمایا تھا جس نے ہتوری کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا؟ جو کچھ ہوا تھا کسی باغیچے کی تاریکی میں ہوا تھا اور اس کی صحت یا عدم صحت معلوم کرنے کا کوئی طریقہ دستیاب نہیں تھا۔ یمایا کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ بڑا حیلہ کار آدمی ہے، لیکن پھر یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس کے دماغ کسی نہ کسی حد تک سازشی ہیں۔ یہ فرض کر لینا قرین انصاف نہیں ہوگا کہ جس شخص نے ہتوری کو تباہی کے غار میں دھکا دیا تھا وہ لازماً یمایا تھا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شروع ہی سے قرائن بتا رہے تھے کہ یمایا اور ہتوری کی جوڑی کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

ہتوری کی بیماری کے متعلق تمام ملازمین مختلف نظریات پیش کرتے رہتے تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس نے معمول سے کہیں زیادہ الم ناک کہانیاں فلم بند کی تھیں: زخمی بچے، پریشان مائیں، بے یار و مددگار معذور اشخاص کیا تھا جس کی اس نے عکاسی نہیں کی تھی؟ اور یہ چیزیں بالآخر اس کے اعصاب کو لے ڈوبیں۔ ہتوری کو بتایا جاتا تھا کہ اس نے کسی چیز کی فلم بندی کرنا ہے اور اسی سے وہ اپنی روزی کماتا تھا، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ قائم تھی کہ اس نے ضرورت سے زیادہ رنج وغم کے مناظر دیکھے تھے۔ مصائب کے شکار لوگوں کی حالت دیکھ کر اس کا دل کڑھتا رہتا تھا اور ان دکھوں کا ذمے دار وہ خود کو گرداننے لگتا تھا۔ بعض اشخاص کا خیال تھا وہ اتنا حساس ہے کہ اپنے پیشے کے لیے موزوں نہیں۔ دوسرے اس کی کیفیت کو تھکاوٹ کی علامت قرار دیتے تھے اور یہیں معاملہ ختم کر دیتے تھے۔

لیکن یمایا کس قسم کا آدمی تھا؟ ایک مرتبہ میں نے عارضی طور پر اس کے لیے کام کیا تھا اور مجھے یاد رہے کہ ہمیں کہیں باہر جانا تھا اور مجھے پانچ منٹ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ یمایا کو معلوم تھا کہ میں اسے دھوکا نہیں دوں گا بلکہ وہ مجھ پر انحصار کر سکتا ہے، چنانچہ میں نے سوچا کہ وہ میرا انتظار کرے گا۔ لیکن وہ میرے بغیر ہی روانہ ہوگیا اور اپنے ساتھ ایک اور کیمرا کار کو لے گیا۔ اس نے مجھے ایک منٹ کی رعایت دینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ میں بھاگم بھاگ ان کے پیچھے گیا اور وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ اپنی تمام تر عجلت کے باوجود

اس نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا تھا۔ وہاں وہ آرام سے بیٹھا دھوپ تاپتا اور دوسروں کے ساتھ سگریٹ نوشی کرتا رہا تھا۔ دراصل وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

جب میں نے معذرت چاہی، اس نے کہا، ''ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔'' وہ مسکرانے لگا اور مجھے یوں لگا جیسے اس کا واقعی وہی مطلب ہو جو وہ کہہ رہا تھا لیکن پھر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور علیحدگی میں مجھ سے کہنے لگا تا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی بات نہ سن سکے۔'' دیکھو، بڑے صاحب آئے تھے اور تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے معاملہ سنبھال لیا اور تمہارے متعلق انہیں کوئی خاص بات نہ بتائی۔'' اس کی باتیں تسکین بخش معلوم ہوتی تھیں جیسے سب کچھ ٹھیک طرح طے ہو گیا ہو۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے سٹوڈیو سے روانہ ہونے سے پہلے سپروائزر کو خاص طور پر بتایا تھا کہ میں ابھی دفتر نہیں پہنچا۔

''کیسا عجیب آدمی ہے!'' میں نے سوچا۔ ''پکا موقع پرست۔ اس سے اسے کیا حاصل ہو گا؟'' یہ تو صاف نظر آ رہا تھا کہ ہتوری کی حالت خستہ ہے لیکن یمایا کے اپنے مسائل تھے۔ وہ اپنے عملے کے ارکان کو کس کر رکھتا تھا اور انہیں کوئی ڈھیل دینے کا ارادہ نہیں تھا، لیکن اس کا اپنا یہ حال ہے کہ کئی کئی دن چھٹی پر رہتا تھا۔ جب کبھی اس کا اپنا کوئی پروگرام ٹی وی پر پیش ہوتا، وہ اگلی صبح دفتر آنے سے گریز کرتا۔ کون جانے، اسے شاید شرم کا مبہم سا احساس ہوتا ہو گا جو اسے رفقائے کار کا سامنا کرنے سے روک دیتا ہو گا۔

اس بات کو صرف چند ہی روز گزرے تھے جب یمایا کو سیکشن چیف مقرر کر دیا گیا تھا۔

جب میں اس شام ہتوری کی کتھا سن رہا تھا، مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے لیے اپنے آپ کو قابو میں رکھنا آسان نہیں۔ اس کی بیوی اور بچے سو سکے تھے۔ لیکن اس سہ پہر اس کی بیوی کی آنکھوں میں جو بے یقینی جھلک رہی تھی اور جس طرح وہ چوکس دکھائی دے رہی تھی، وہ مجھے یاد تھی۔ وہ لازماً اس خوف میں مبتلا ہو گی کہ اس کا شوہر ساری رات مجھ سے باتیں کر کے گزار دے گا۔

یمایا کے ساتھ جو واقعہ اسے پیش آیا تھا، جب وہ اسے بیان کر چکا، وہ حیران کن حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا میں سوپ پینا پسند کروں گا۔ ''سوپ میں

اپنی بیوی سے بہتر بناتا ہوں۔'' اس نے باورچی خانے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا، وہ جن دو بلیوں کو پکڑے ہوئے تھا، وہ اس کی گود سے نیچے گر پڑیں۔ انہوں نے اپنے جسم پھیلائے اور اپنی لمبی دمیں اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ مجھے اس کے فریج کا دروازہ کھولنے، بند کرنے اور چھوٹی گٹھی اور لمبے ڈنٹھل والے کچے پیاز کو کترنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں سوچنے لگا کیا اس نے مجھے اسی لیے بلایا تھا کہ وہ یمایا کے متعلق کسی کو اپنا راز دان بنا سکے؟

سب سے چھوٹے بیٹے کی ڈیسک کمرے کے کونے میں پڑی تھی اور پنسل سے بنایا ہوا کسی مہیب جانور کا خاکہ دیوار پر چسپاں تھا۔'' ڈائینو سار: سارس عظیم: قد دو سو فٹ۔'' تحریر کسی بچے کی معلوم ہوتی تھی۔ بعد ازاں جب ہم اس کے بیٹھے کے متعلق باتیں کر رہے تھے، ہتوری نے ڈیسک کی دراز کھولی اور مجھے دکھانے کے لیے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا۔ استاد نے دائیں ہاتھ کے اوپر کے کونے میں A ظاہر کرنے کے لیے تین سرخ دائرے بنا دیئے تھے۔'' اس نے سکول میں میرے متعلق مضمون لکھا تھا۔'' ہتوری نے بتایا۔ مضمون کا عنوان ''میرے ابا جان'' تھا:

''میرے ابا جان ٹی وی کیمرا کار ہیں۔ ہم دونوں کی آپس میں زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں اکثر دوسرے مقامات کے دورے پر رہتے ہیں۔ جب وہ گھر آتے ہیں تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں، ''میں بہت تھک گیا ہوں۔'' جب میں انہیں گھوڑا بنا کر ان پر سواری کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ مجھے ڈانٹ دیتے ہیں اور کہتے ہیں، ''اترو یہاں سے۔'' حالانکہ وہ اکثر اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں، پھر بھی مجھے اپنے ابا جان پسند ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کیوں؟''

ہتوری کے بیٹے کو جی نے معصومانہ انداز سے اپنے ہم جماعتوں سے پوچھا تھا: ''آپ کو معلوم ہے، کیوں؟'' تاہم یہ جاننے کے لیے کہ اس کے پیچھے کیا عناصر کام کر رہے ہیں، مجھے اس مضمون کو صرف ایک بار پڑھنے کی ضرورت پیش آئی۔ جب سے ہتوری کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی، کمپنی اسے فلم بندی کے مقامات پر بھیجنے سے گریز کرنے لگی تھی۔ شاید ہتوری کی بیوی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بیٹے کو، جو پہلی جماعت کا طالب علم تھا، معلوم ہونے پائے کہ اس کا باپ ہسپتال میں بیمار پڑا ہے۔

جب میں نے سٹوڈیو میں ملازمت کی درخواست دی تھی، مجھے داخلے کے امتحان میں گزرنا پڑا تھا۔ مجھے کسی ایسے شخص کی سفارش بھی درکار تھی جو وہاں کام کرتا تھا۔ وہاں ایک بھی آدمی ایسا نہیں تھا جس سے میں براہ راست بات کرسکتا۔ تاہم میں نے اپنے بعض واقف کاروں کو نیچ ڈالا اور مجھے ایک شخص سے، جس کا نام ہیرا ماتسو تھا، متعارف کرا دیا گیا۔ اس وقت وہ اس ڈیپارٹمنٹ میں قائم مقام منیجر تھا، جس کا کام اشتہاری فلمیں بنانا تھا۔

مجھے موسم خزاں کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں ہیرا ماتسو سے ملنے گیا تھا۔ میں نے اپنے تعلیمی ادارے کی وردی ڈھونڈ کر پہن لی تھی اور جب میں پہاڑی پر چڑھ کر اس کے دفتر پہنچا تو اپنے ہی پسینے کی بو سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے ہیرا ماتسو انیکسی میں ملا۔ کمرے میں کھڑکی نہیں تھی اور جب میں نے دروازہ کھولا، فضا میں ایسی ٹونی (Acetony) کی بو بسی ہوئی تھی جو فلم کے مختلف ٹوٹوں کو جوڑنے والی سریش سے نکل رہی تھی۔ یہ مبہم طور پر سیبوں کی مہک سے ملتی جلتی تھی۔ کمرے کے درمیان میں سولہ ملی میٹر کا کیمرا اور ایک میز، جس پر فلمیں ایڈٹ کی جاتی تھیں اور جس پر فلموں کے خالی ڈبے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، رکھی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک غلیظ کاؤچ تھا۔ اس میں غالباً پسو رینگتے پھر رہے تھے۔ اگر میرا حافظہ ٹھیک کام کر رہا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس سہ پہر ہیراماتسو کسی لڑکی کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ بہرحال وہ صرف قمیص میں ملبوس کسی نوخیز دوشیزہ کے ساتھ کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس دوشیزہ نے اپنے چہرے پر سرخی پاؤڈر کی دبیز تہہ جما رکھی تھی اور وہ غالباً کسی اشتہاری فلم میں کام کر رہی تھی۔

بھاری کینسائی لہجے میں بات کرتے ہوئے ہیرا ماتسو نے میرا اس سے تعارف کرایا۔ ''اس سے ملو...... یہ انوئے ہے۔ کالج میں اپنی کلاس میں اول آیا تھا۔'' اس نے دوشیزہ کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اس لڑکی نے میری موجودگی پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن پھر اس کا دل پسیج گیا اور اس کے منہ سے کچھ اس قسم کی بات نکلی، ''اوہ! واقعی؟'' اور پھر اس نے اپنے اکتاہٹ سے بھرپور لہجے میں مزید کہا، ''مجھے سمارٹ لوگ قطعاً پسند نہیں۔'' اس نے میری جانب دیکھا اور تلافی کرنے کی کوشش کی، ''مجھے افسوس ہے۔ سچی بات منہ سے نکل گئی۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کوئی خاص ذہین نہیں ہو۔'' ہیرا ماتسو نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورت جو اس سے کھسیانا کر دینے والی حد تک بے تکلف تھی، اس کا کھلونا بن کر لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنا ہاتھ اس کے جسم پر پھیرنے لگی۔ چنانچہ ٹیلی ویژن کی دنیا کے ساتھ یہ میرا اولین تعارف تھا۔

ہیرا ماتسو نے بخوشی مجھے تعارف خط دے دیا لیکن جب میں رخصت ہو رہا تھا، اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا، ''ایک بار پھر سوچ لو، تمہارے جیسے شخص کا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اگر تمہاری دو تین بیویاں نہیں، پھر میری طرح تمہیں بھی یہ جگہ راس نہیں آئے گی۔''

اس بات کو دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے کہیں بیچ میں میں نے شادی کر لی تھی۔ تب سے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ ہیرا ماتسو نے البتہ مدتوں پہلے سٹوڈیو چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے دوسروں کا کام پسند نہیں۔ مفروضہ طور پر اس نے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا، لیکن وہ کرتا کیا تھا، مجھے درحقیقت بالکل معلوم نہیں۔ سٹوڈیو میں متعدد اشخاص نے اس کی مثال پر عمل کیا اور انہوں نے سوچے سمجھے بغیر اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔ ایک نے تو اپنے ساتھی کی بیوی پھانس لی۔

میرا خیال ہے کہ ہیرا ماتسو نے استعفیٰ کے پس پردہ اس واقعے کو بھی دخل حاصل تھا جس میں ایک لڑکے کا بھی نام آتا تھا۔ اس لڑکے کا نام کودو تھا۔ یوراشیما اور میری طرح کودو نے بھی کوئی دس سال پہلے امتحان دیا تھا اور ہمارے ساتھ کمپنی کی ملازمت اختیار کی تھی۔ اس سال ہم تینوں سمت چالیس اشخاص نے سٹوڈیو میں کام شروع کیا تھا۔ جب کودو نے تین مہینے کا تربیتی کورس ختم کر لیا، اسے ہیرا ماتسو کے ماتحت اشتہاری فلموں کے شعبے میں تعینات کر دیا گیا۔ اگلے سال کی گرمیوں میں اس نے خودکشی کر لی۔ کمپنی نے نئے ملازمین کو مختلف شعبوں میں تعینات کرنے کے سلسلے میں تقریب منعقد کی تھی۔ کودو کے ساتھ میری پہلی ملاقات اسی تقریب کی صبح ہوئی تھی۔ یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہم اس سے پہلے نہ تو ایک دوسرے کے شناسا تھے اور نہ کبھی ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ابتدائی امتحان ہم سب نے اکٹھے دیا تھا لیکن چونکہ نئے نئے تھے، اس لیے ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ تربیت کے دوران میں ہمیں کبھی انفرادی انٹرویو کے لیے، کبھی جسمانی

امتحان کے لیے اور کبھی تربیتی لیکچروں کے لیے، جن کا سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا، بلایا جاتا رہا۔ آپ کا خیال ہو گا کہ ان مصروفیات کے دوران میں ہماری کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جانا چاہیے تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی ہماری پہلی ملاقات تھی۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ ہوا کیا تھا لیکن اس صبح مجھے راستے میں کہیں رکنا پڑ گیا، جس سے مجھے تاخیر ہو گئی اور سٹوڈیو پہنچنے کے لیے دوڑ لگانا پڑی۔ ایک اور ملازم بھی دیر سے آیا تھا اور جب میں پہنچا، وہ استقبالیہ میں متعین گارڈ کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا۔ وہ بھاری بھرکم اور بے ڈول آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال باریک کٹے ہوئے تھے اور اس نے فولاد کی کمانی کی عینک پہن رکھی تھی۔ وہ خوب دل کھول کر قہقہے لگا رہا تھا حالانکہ بعض اوقات یہ بتانا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ہنس کس بات پر رہا ہے۔ میں نے سٹوڈیو پہنچنے کے لیے اس لیے دوڑ لگائی تھی کیونکہ مجھے اس بات پر خفت محسوس ہو رہی تھی کہ میں تعیناتی کی تقریب میں وقت پر نہیں آ سکا تھا۔ اس کے برعکس کودا ذرا بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے وہ ناپسندیدہ قسم کا آدمی محسوس ہوا۔

گارڈ نے ہمیں قریبی ہال کی طرف بھیج دیا جو اس تقریب کے لیے کرائے پر لیا گیا تھا۔ کودو اور میں اکٹھے دفتر سے روانہ ہوئے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ صرف مجھے جلدی پہنچنے کا احساس ہے۔ کودو نے اپنی رفتار بڑھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور مزے مزے سے چلتا رہا۔ وہ اپنے کندھے جھکا رہا تھا اور اس نے اپنا سر پچھلی جانب جھکا رکھا تھا۔ شاید وہ اسی طرح اپنی عینک کو گرنے سے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے راستے میں ایک لفظ تک نہ کہا اور ہم یونہی ہال میں داخل ہو گئے۔

اس کے باوجود کودو کے ساتھ میری دوستی کا آغاز اسی صبح ہوا۔ وہ سٹوڈیو میں میرا پہلا دوست تھا۔ ہمیں مختلف شعبوں میں تعینات کیا گیا تھا لیکن ہم لنچ کرنے اکثر اکٹھے باہر جایا کرتے تھے۔ ہماری دوستی کی بنیاد محض اس حقیقت پر تھی کہ اس تقریب میں ہم دونوں تاخیر سے پہنچے تھے۔

شروع شروع میں مجھے کودو کا رویہ قطعاً پسند نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو خواہ مخواہ چڑانا اس کی عادت ہے۔ اس کے اطوار کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ شخص دوسروں سے علیک سلیک کر کے ان پر احسان جتا رہا ہے اور اگرچہ اس کے قہقہے پرشور ہوتے تھے

لیکن ان میں بھی اس کی یہ آرزو جھلکتی نظر آتی تھی کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے اور ان سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دے گا۔ وہ ہم لوگوں سے، جو اس کے ساتھ کمپنی میں ملازم ہوئے تھے، عمر میں کچھ بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کالج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد مختلف جز وقتی ملازمتیں کی تھیں اور تو اور وہ دیہاڑی دار مزدور کی حیثیت سے بھی کام کر چکا تھا اور امریکی فوج کے کسی اڈے پر مشینوں کی دیکھ بھال کرنے والے شعبے میں بائلر مین بھی رہ چکا تھا۔

ایک روز مجھے شدید زکام ہو گیا۔ کودو نے اس کے علاج کے لیے مجھے کوئی نمک استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ جب ہم کہیں جا رہے تھے، اس نے مجھے بتایا کہ نمک میں کوئی ایسی چیز ہے جو خون کو گاڑھا کر دیتی ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ اسے ہی استعمال کرتا ہے۔ جب اس کی موت واقع ہوئی، مجھے اس کے بارے میں جو بات سب سے اچھی طرح یاد تھی، وہ اس کی یہی نمک کے متعلق گفتگو تھی۔

جب بھی ہم اکٹھے لنچ کرتے، ہم ایک قریبی ریستوران میں چلے جاتے جہاں گاہکوں کی تواضع بھنے ہوئے گوشت سے کی جاتی تھی۔ اس ریستوران کو ایک عورت چلاتی تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اسے یہ کاروبار شروع کئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔
''میں تمہیں ایک اچھی جگہ دکھاتا ہوں۔'' جب ہم پہلی مرتبہ اکٹھے نکلے تھے، اس نے مجھ سے کہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر وہ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے کیوں ملا رہا ہے۔ وہ ریستوران کا ہے کو تھا، کھوکھا نما عورت تھی جو گلی کے بالکل اختتام پر واقع تھی اور اس پر نام کی تختی تک موجود نہیں تھی۔ دیکھنے میں یہ کوئی گودام معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں ایک ایسے کاؤنٹر پر بیٹھ کر کھانا کھانا پڑا جہاں بمشکل تین آدمیوں کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ میں نے تین گھٹیا جگہ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مالکہ، جس سے اپنی پشت پر شیر خوار بچہ باندھ رکھا تھا، گوشت بھون رہی تھی جبکہ ایک نوعمر لڑکا اس کے پاؤں کے آس پاس کھیل کود میں مصروف تھا۔ اس عورت کے چہرے کی ناشگفتگی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس نے بہت برے حالات میں زندگی گزاری ہے۔ شاید اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔
اس علاقے میں بھی یہ ریستوران پکار پکار کر اپنی بدنمائی کا اعلان کر رہا تھا۔ تاہم

اس میں ایک بات تھی۔ وہاں گاہکوں کی پلیٹ میں عام ریستورانوں کی نسبت کہیں زیادہ گوشت ہوتا تھا۔ ہمارے کھانا کھانے کے دوران میں اگر شیر خوار بچہ ہمارے سروں پر چیخیں نہ مار رہا ہوتا تو ماں کا دھیان دوسرے بچے کی طرف منتقل ہو جاتا اور وہ بالکل ہمارے سامنے اسے جھڑکنے لگتی۔ لیکن جہاں قیمتیں اتنی کم ہوں، وہاں آپ اچھی فضا یا عمدہ سروس کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے باوجود عورت کو اس غلیظ جگہ گاہکوں کو کھینچنے میں خاصی دقت پیش آتی۔ اسے اتنا تجربہ نہیں تھا کہ اپنے کاروبار کو منافع بخشی بنا سکتی۔ چنانچہ کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ریستوران بند ہو گیا اور اس کی جگہ دوبارہ گودام قائم ہو گیا۔ کبھی کبھار مجھے یہ یاد آ جاتا، اور میں یہ دیکھنے کے لیے کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے ٹہلتا ٹہلتا ادھر جا نکلتا۔

جب تک یہ کھوکھا نما ریستوران کھلا رہا، کودو ہر روز وہاں جاتا رہا۔ وہ آخر تک اس کا انتہائی قابل اعتماد گاہک رہا ہوگا۔ جب بھی ہم وہاں کھانا کھانے جاتے، وہ کہتا، ''یہ اچھی عورت ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟'' شاید اسے اپنے نہاں خانہ دل میں اس بدقسمت عورت کے لیے کشش محسوس ہوتی ہو گی جو انتہائی معمولی ریستوران چلا کر انتہائی قلیل روزی کما رہی تھی۔ جتنا عرصہ میری اس سے دوستی رہی، وہ صرف تب تمام احتیاط بالائے طاق رکھتا اور اپنی ساری پوشیدہ خواہشوں اور غموں کی منکشف کرتا جس سے اس کی لن ترانیوں کی تکذیب ہو جاتی جب وہ اس عورت کے متعلق گفتگو کر رہا ہوتا۔

کودو نے خودکشی کرنے سے تین دن پہلے اپنے منصوبے کے بارے میں ہیرا ماتسو کو آگاہ کر دیا تھا۔ ہیرا ماتسو کودو توقع کے برعکس ایک سہ پہر میرے دفتر آ دھمکا۔ بظاہر تو یہی نظر آ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ حسب معمول اسی انداز کی شکایتیں کر رہا تھا جو وہ تب کرتا تھا جب کوئی شخص اپنے کام میں کسی کوتاہی کا مرتکب ہوتا تھا۔

''خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، وہ یہ حرکت کر کے رہے گا۔ میں نے اس سے کہا تھا، تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے، تمھاری مت ماری گئی ہے۔ لیکن کیا فائدہ؟ مجھے مت روکیں۔ میں جس طرح مرنا چاہتا ہوں، کم از کم مجھے اسی طرح مرنے تو دیں۔ وہ بس یہی کہتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کیا جائے۔''

''وائے! وہ اپنے آپ کو ہلاک کیوں کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ مگر میرا سوال مضحکہ خیز تھا بلکہ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ مضحکہ خیز ہی نہیں، احمقانہ بھی تھا۔

''کون جانے؟ اس نے مجھے کوئی تفصیلات نہیں بتائیں۔'' ہیرا ماتسو نے جواب دیا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں کہ گڑ بڑ کیا ہے۔ جب ہم پینے پلانے اکٹھے باہر جاتے ہیں، وہ چند ایک بہت اچھے لطیفے سناتا ہے اور ہم خوب دل کھول کر ہنستے ہیں۔ میری نسبت اس کی عورتوں سے خوب نبھتی ہے۔'' ہیرا ماتسو کے لہجے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی نافرمان چھوٹے بھائی پر غصے ہو رہا ہو۔ لیکن مجھ پر یہ بات عیاں تھی کہ وہ درحقیقت بے حد پریشان ہے۔ اس کے لیے یہ بات ہضم کرنا آسان نہیں تھا کہ کودو شاید خودکشی کر لے گا...... زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ نظر اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ کودو بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے ہیرا ماتسو جیسا افسر ملا ہے۔

''اب وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سٹوڈیو میں ہے اور ایک اشتہاری فلم پر کام کر رہا ہے۔ مجھ پر ایک مہربانی کرو۔ جاؤ اور اس سے ملو۔''

جب ہیرا ماتسو کمرے سے باہر نکل گیا، میں اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگتا نچلی منزل پر چلا گیا۔ وہاں سے میں دھیرے دھیرے چلتا سٹوڈیو کی طرف بڑھنے لگا جہاں کودو کام کر رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، میں نے بڑے لاپرواہانہ انداز سے اندر جھانک کر دیکھا جیسے میں وہاں اتفاق سے محض یہ دیکھنے پہنچ گیا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ چار پانچ آدمیوں کا گروہ...... یہ غالباً اداکار یا ایجنٹ تھے...... سٹوڈیو کے کونے میں چھوٹے سے سیٹ (SET) کے گرد کھڑا تھا۔ کودو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم جب میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، وہ اپنی ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹکائے کنٹرول روم میں ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہے یا نہیں اور میں اس سے بات کیے بغیر سٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ ''یہ اس کا آخری کام تو نہیں؟ کیا وہ واقعی آج رات خودکشی کر لے گا؟'' میں بے چارگی کے عالم میں وہاں کافی دیر کھڑا رہا۔ مجھے اپنے آپ پر کوئی فخر نہیں تھا۔

مجھے یاد نہیں کہا سروز کس چیز کا اشتہار بن رہا تھا۔ شاید یہ امرت دھارا قسم کی کوئی دوا تھی یا ہو سکتا ہے کہ کوئی نئے برانڈ کا سوپ ہو جو گرم پانی میں ڈالتے ہی تیار ہو جاتا ہے۔ بہرحال یہ جو کچھ بھی ہو، مجھےس سے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جس روز کودو کا انتقال ہوا، وہ اس دن بھی اپنی موت سے پہلے حسب معمول سٹوڈیو میں کام کر رہا تھا۔

ہیرا ماتسو نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح کودو کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے راضی کر لے۔ یہ اس کی سادگی تھی کہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس نے جو منصوبہ بنایا ہے، وہ کامیاب رہے گا۔ تاہم وہ اس سے زیادہ موثر ترکیب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اپنے منصوبے کے مطابق وہ کودو کو اپنے ساتھ مے خانے لے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کودو چند جام چڑھائے گا، شانت ہو جائے گا اور پھر اپنے ارادے پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ہیرا ماتسو نے محض ایک ہی مے خانے میں بیٹھنے پر اکتفا نہ کیا۔ وہ اسے یکے بعد دیگرے مختلف شراب خانوں میں گھماتا اور ہر جگہ پلاتا رہا۔ ''یہ کام مت کرو میری خاطر۔'' وہ ساتھ ساتھ اسے سمجھاتا اور اس سے التجائیں بھی کرتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کودو نے ان جذباتی نصیحتوں اور التجاؤں کو مضحکہ خیز خیال کیا ہو گا تاہم وہ ان سے متاثر ضرور ہوا۔ آخر کار اس نے لڑکھڑاتے لہجے سے کہا ''اگر آپ کا یہی اصرار ہے، پھر میں اس کے متعلق ایک بار پھر سوچوں گا۔'' ہیرا ماتسو نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ نگرانی میں نرمی سے کام لے سکتا ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ساری رات کودو کے ساتھ چپکا رہے گا اور اسے ہرگز آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ تاہم اب وہ قدرے شانتی محسوس کر سکتا تھا۔ جب انہوں نے آدھی رات کے وقت کسی نکڑ پر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا، ہیرا ماتسو کو پورا اطمینان ہو چکا تھا کہ کودو کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا، جب کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ ہیرا ماتسو پر کچھ جلدی ہی نشہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس کودو، جو اس سے عمر میں کہیں چھوٹا تھا، پوری طرح اپنے حوس میں تھا۔

آخر میں کودو ہیرا ماتسو سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ طوعاً وکرہاً ہی سہی، اسے بہرحال اس شام ہیرا ماتسو کے ساتھ جانا ہوگا۔ اگر اس نے انکار کیا، اس کا افسر

رات کو کمرے میں آ دھمکے گا اور اس کا تمام منصوبہ خاک میں ملا دے گا۔ کودو اس کے ساتھ پیتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ سوچتا رہا کہ وہ اپنے پروگرام کو کچھ اس طرح عملی جامہ پہنائے گا کہ ہیرا ماتسو کو اس کی موت کے متعلق کم از کم اگلے دن دوپہر تک کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ اس نے لازماً اسی قسم کا منصوبہ بنایا ہوگا۔ ہیرا ماتسو سے بچھڑنے کے بعد کودو رات ہی کو اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس نے چند نیند آور گولیاں لیں اور ہاون دستے میں کوٹ کر ان کا سفوف بنا لیا۔ اس نے بظاہر اس سفوف کو مختلف خوراک میں کھایا تا کہ اسے قے نہ ہو جائے اور یوں اس کی کوشش ناکام نہ ہو جائے۔ اس کے بستر کے قریب چند مختلف کتابیں پڑی تھیں۔ ان میں ایک طویل ناول تھا۔ یہ جنگ کے بعد کسی متنازعہ مصنف نے لکھا تھا جب ہم کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اس نے غالباً اسے کسی پرانی کتابوں کی دکان سے خریدا تھا۔ اس کا سرورق پھٹ چکا تھا اور اس کے صفحات مڑے تڑے ہوئے تھے۔

ہیرا ماتسو اس رات کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا اور اگلے دن وہ معمول سے کہیں بعد میں دفتر آیا تھا۔ اس نے فرض کر لیا تھا کہ کودو اس لیے غیر حاضر ہے کیونکہ وہ سو کر اپنا نشہ اتارنا چاہتا ہو گا۔ لیکن جب دوپہر تک اس کی شکل نظر نہ آئی، ہیرا ماتسو کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ لیکن اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ بھاگم بھاگ ہیرا ماتسو کے کمرے میں پہنچا۔ کودو ابھی تک زندہ تھا اور ہیرا ماتسو نے اسے جھٹ پٹ ہسپتال پہنچا دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اسے کچھ دیر کے لیے ہوش آ گیا تھا اور اپنے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات پیدا کر کے جیسے وہ سخت اذیت میں مبتلا ہو، اس نے ہیرا ماتسو سے سرگوشیوں میں کہا، ''آپ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟''

جب مجھے کودو کی موت کی اطلاع ملی، میرا گلا اچانک بے حد خشک ہو گیا۔ میں اپنے ذہن میں منظر کی تصویر بنانے لگا: آدی رات کا عالم، نیم روشن کمرا، کودو بڑی احتیاط سے نیند آور گولیاں پیس رہا ہے۔ س کی آہنی فریم کی عینک اس کی ناک پر پھسل رہی ہے اور وہ اسے اوپر چڑھا رہا ہے لیکن ان سب سے اہم ترین چیز، جسے میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا، وہ ناول تھا جس کے متعلق ہیرا ماتسو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کے بستر کے قریب پڑا تھا۔ یہ ناول کبھی میری پسندیدہ کتابوں میں شامل نہیں رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی زمانے میں میں نے اس کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھے ہوں لیکن میں نے اسے پڑھا نہیں تھا...... اس

خاص ناول نگار کے متعلق میرا تعصب اتنا شدید تھا کہ میرے نزدیک اس کی ایک سطر بھی سنجیدہ توجہ کی مستحق نہیں تھی۔ مزید برآں مجھے وہ لوگ بھی سخت ناپسند تھے جو بڑھ چڑھ کر اس کی تعریف کرتے تھے۔ کودو کے ساتھ میری دوستی بہت گہری نہیں تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے عالم نزع میں اس ناول کو اپنے بستر کے قریب رکھ کر مجھے کسی نہ کسی طرح مسترد کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تو میرے ساتھ ادب پر بحث کرنے کے لیے کوئی موقع تلاش کر سکتا تھا لیکن اپنی زندگی میں وہ ایک بار بھی اس موضوع کو اپنی زبان پر نہیں لایا تھا۔

کیا کوئی شخص کتاب کے لیے اپنی جان دے سکتا ہے؟ مجھے تو یہ تصور ہی ڈراؤنا...... تقریباً متشددانہ طور پر ڈراؤنہ...... معلوم ہو رہا تھا۔ میری ملکیت میں کبھی کوئی ایسی کتاب نہیں رہی جسکے لیے آدمی موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہو جائے اور کوئی ناول تو اس زمرے میں بالکل ہی نہیں آتا۔ کیا کوئی ناول کسی کی موت کا سبب بن سکتا ہے؟ یہ بات پہلے کبھی میرے دماغ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن کیا میں نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی نہیں کر رہا؟ ناول اپنی جان نثار کرنا مضحکہ خیز تصور ہے۔ کودو یقیناً کتاب کی خاطر نہیں مرا ہو گا۔ کتاب نے اسے خودکشی کرنے پر نہیں اکسایا ہو گا۔ البتہ مجھے جو بات یقینی طور پر معلوم ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بستر کے قریب ناول چھوڑ گیا تھا۔ اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں ہو گی کہ دوسرے لوگ اس سے شاید یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ اسے یہ کتاب بہت پسند تھی۔ درحقیقت ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کتاب پر کبھی کوئی خاص دھیان ہی نہ دیا ہو لیکن دیکھنے والے کے نزدیک یہ ''بوسیدہ'' کتاب، جو اس کے ٹھنڈے، بے جان جسم کے قریب پڑی تھی، کہیں زیادہ اہمیت اختیار کرنے لگی تھی۔

کودو نے اپنی خودکشی کے سلسلے میں کوئی تحریر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی بجائے اس نے کاغذ کے پرزے پر یہ الفاظ گھسیٹ دیئے تھے: ''مجھے مت چھوؤ۔ میں بھوت بن کر تم پر منڈلاتا رہوں گا۔'' جیسے وہ چاہتا ہو کہ کہیں اس کی ہدایات نظر انداز نہ ہو جائیں۔ اس نے اپنا یہ پیغام اس کے قریب رکھ دیا تھا جسے بعد میں اس کی میت بننا تھا جسے ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں بعد میں مسائل اٹھ کھڑا ہونا تھے لیکن اس کے الفاظ میں خودکشی کی تحریر سے کوئی مشابہت نہیں تھی۔ کاغذ کا پرزدہ اور لاش مل کر کسی نہ کسی طرح وحدت بن گئے تھے: ایک کے بغیر دوسرا ادھورا تھا۔

میرا ان تمام باتوں کے متعلق لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کودو کی موت پر میرے دل میں کسی قسم کے احساسات پیدا نہ ہوئے۔ اس کے مرنے کا مجھے نہ تو افسوس تھا اور نہ خوشی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسکے انتقال پر کسی شخص نے بھی کسی خاص تشویش کا اظہار نہ کیا۔ جب کبھی اس ک نام لیا جاتا، گنتی کے صرف چند ہی لوگ یاد کرسکتے کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا...... اکثر کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی شکل صورت کیسی تھی۔ اس نے موت کو گلے لگانے میں جس جلد بازی کا مظاہرہ کیا تھا، میں بس اسی سے متاثر تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ مرنے میں اتنی عجلت دکھاتے ہیں، وہ پس ماندگان کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ان کی موت ہمیں اچانک زبردستی احساس دلا دیتی ہے کہ زندگی کئے جانا کتنی احمقانہ بات ہے۔ لاریب کودو کے خیال کے مطابق ہم ایسے نکتہ چین ہیں جو خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دیتے رہتے ہیں اور یوں مسلسل ایک دوسرے کے متعلق غلط آرا قائم کرتے رہتے ہیں۔

جس دن ہمیں اس کی موت کے متعلق آگاہ کیا گیا، وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سہ پہر خاصی گزر چکی تھی اور سب لوگ ہونقوں کی طرح باری باری اس شعبے کا طواف کرنے لگے جس میں وہ اپنی زندگی میں کام کیا کرتا تھا۔ جب وہ سانحے کی تفصیلات سن لیتے، وہ بے یقینی کے عالم میں باہر آجاتے لیکن اس کے بعد ان کی ہمت بحال ہو جاتی اور وہ ایک بار پھر پوچھنے لگتے، ''کودو مر گیا؟ پھر وہ کام پر نہیں آیا کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ ریٹائر ہونے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے لیکن میں تو زندہ ہوں اور ابھی تک میری صحت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔'' میں اس قسم کی غیر بناوٹی سوچ کو تسلیم کرسکتا تھا: میرا خیال تھا یہ مردانہ رویہ ہے۔

تاہم کچھ دوسرے لوگ کودو کی ڈیسک کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ ان کے چہرے سپاٹ اور ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھے۔ وہ سگریٹ پھونک پھونک کر سوچ رہے تھے کہ اس نے یہ کیسے کیا۔ وہ اس کے ایک رفیق کار سے، جس سے اس کا کوئی خاص یارانہ نہیں تھا اور جو اس کی لاش دیکھنے اس کے گھر چلا گیا تھا، ایک ایک تفصیل اگلوا رہے تھے۔ ''کتنا بھیانک!'' ان کے منہ سے نکلتا اور نیا سگریٹ سلگا لیتے۔ کیا ان کا واقعی یہ مطلب تھا؟ کیا وہ صحیح معنوں میں پریشان ہوئے تھے؟ میں نہیں سمجھتا کہ انہیں رتی برابر

افسوس ہوا ہو گا۔ وہ بظاہر تشویش کا اظہار کر رہے تھے لیکن حقیقتاً یہ محض ریاکاری تھی۔ جب ہمارا کوئی رفیق کار انتقال کر جاتا ہے، کیا ہم واقعی صم بکم ہو جاتے ہیں ؟ کیا دوسرے کی موت پر ہم مفلوج ہو جاتے ہیں؟ نہیں، الزام ہم پر نہیں دھرا جا سکتا۔ سارا قصور مرنے والے کا ہے۔ یہ وہ ہے جو ہمارا تمسخر اڑاتا ہے۔

اپنے طریقے سے میں بھی احمق تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دوسروں سے مختلف ہوں۔ میرا خیال تھا میں ایک ایسی بات جانتا ہوں جو انہیں معلوم نہیں اور میں انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلانا چاہتا تھا، ''تم کتنے احمق ہو! تم اب پریشان ہو؟ مجھے تین دن پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ مر جائے گا۔'' جب وہ وہاں بیکار کھڑے تھے، میں انہیں بتانا چاہتا تھا، ''بند کرو یہ سب کچھ! کافی ہو چکا! اب گھر جاؤ!''

ہتوری کے بیمار پڑ جانے کے بعد مجھے اور یورا شیما کو مختلف شعبوں میں تعینات کر دیا گیا۔ چونکہ ہتوری کو اپنی سابقہ ذمے داری پر ہی برقرار رکھا گیا تھا، ہمیں محسوس ہونے لگا جیسے ہم نے اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو۔ ایک سہ پہر میں تسوتسومی کے ساتھ چائے پینے چلا گیا جو سٹوڈیو میں جزوقتی ملازمت کرتی تھی۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسے ملنے گئی تھی، مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نوجوان خاتون تن تنہا اس قسم کے ہسپتال میں جانے کی ہمت نہیں کرے گی، لیکن اپنی لاپروائی پر مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ مجھے ہتوری کی عیادت کرنے جانا چاہیے تھا۔ جب تسوتسومی باتیں کر رہی تھی تو وہ یہ کہتے محسوس ہو رہی تھی کہ سب سے پہلے یورا شیما اور مجھے اس کی بیمار پرسی کے لیے جانا چاہیے تھا، لیکن چونکہ ہم نہیں گئے تھے، اس لیے ہماری جگہ وہ چلی گئی تھی۔

''مجھے دیکھ کر ہتوری بہت خوش ہوا۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی شاید ہی اسے کبھی ملنے آتی ہے۔ اس نے مجھے اپنا کمرا دکھایا۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں میں ٹھہرتا ہوں۔ ہم سب یہاں دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ اس نے مجھے عجیب و غریب مریضوں کے گروہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا جو وہاں پہنچ گیا۔

ان مریضوں میں سے ایک مجھے اپنی بنائی ہوئی تصویریں دکھانا چاہتا تھا۔ دوسرا مجھ سے پوچھنے لگا، میری نظم پڑھنا چاہو گی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان سے کیسے نپٹوں۔ پھر ان سب کے اجسام اور کپڑوں سے واہیات قسم کی بو آ رہی تھی...... ہتوری اور

میں باہر لان میں چلے گئے اور اندھیرا چھانے تک باتیں کرتے رہے۔ ایک موقع پر اس نے جیب سے ماؤتھ آرگن نکالا اور مجھے اس پر ایک دھن سنانے لگا۔ وہ دھن بہت خوبصورت اور ماہرانہ انداز سے نکال رہا تھا اور مجھے خاصی پسند آ رہی تھی...... پھر اس نے مجھ سے گانے کی فرمائش کی اور کہا کہ اگر میں مراتا ہائیڈیو کا، بادشاہ گانا چاہوں تو وہ مجھے سنگت دے گا۔ مجھے اس نغمے کے الفاظ یاد نہیں تھے لیکن وہ مجھے انہیں سکھانے پر اصرار کرتا رہا۔ میں دھن گنگنانے لگی جب کہ وہ گیت کے الفاظ دہراتا رہا۔ گیت کچھ اتنا اداس محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا اور ہتوری مجھے سڑک تک پہنچانے میرے ساتھ چل پڑا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے ملنے دوبارہ آؤں۔ میں نے سوچا ایک مرتبہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں دوبارہ گئی تو میرے لیے اپن اس فعل کا جواز پیش کرنا مشکل ہو گا۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور مجھے خواہ مخواہ کی خفت اٹھانا پڑے گی۔ آخر میں اس کی بیوی تو ہوں نہیں۔ بلکہ ہتوری سے میرا کسی قسم کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔ چنانچہ اگر میں دوبارہ آ گئی، تو بہت عجیب لگے گا۔ آپ کا خیال ہے؟'' تسوتسومی نے مری ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔

دراصل تسوتسومی ہتوری کے خاصا قریب تھی۔ وہ سٹوڈیو میں اس کی مدد کیا کرتا تھا اور اس کی نجی زندگی میں دلچسپی لیتا رہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ یوں سلوک کرتا تھا جیسے وہ اس کا کفیل ہو بلکہ وہ تو یہاں تک چلا گیا کہ اس نے اس کی شادی طے کرانے کی بھی کوشش کی۔ شادی کے دفتر میں بھیجنے کے لیے اس نے اس کی تصویر کھینچنے کے لیے ضرورت سے کہیں زیادہ وقت صرف کیا۔ ایک روز جب میں اسے ملنے گیا، اس نے اتفاق سے یہ فوٹو مجھے بھی دکھائے۔ ہتوری پیشہ ور فوٹو گرافر تھا اور اس نے بہت عمدہ فوٹو بنائے تھے، لیکن تسوتسومی کوئی خاص پرکشش عورت نہیں تھی اور اس کے چہرے پر کس قدر بے چارگی ٹپکتی تھی۔

''کیا خیال ہے خوبصورت ہیں نا؟'' اس نے یکے بعد دیگرے متعدد شان دار فوٹو دکھاتے ہوئے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس نے پس منظر اور کمپوزیشن کے فن میں بڑی محنت کی ہے۔

''تم نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بہت نفیس لڑکی ہے۔'' ہتوری نے اضافہ کیا۔

یہ درست ہے کہ میں نے اس کی بات سے عدم اتفاق کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اگرچہ تسوتسومی نیک فطرت، بے ریا اور صاف باطن خاتون تھی، وہ بعض اوقات اپنے کام میں غلطی کر جاتی تھی اور اس پر کسی پشیمانی یا تشویش کا اظہار بھی نہیں کرتی تھی۔ یوراشیما نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس کے لکھنے کا ڈھب کچھ عجیب سا ہے۔ مثلاً وہ جاپانی میں ''جوتے'' کی تحریری علامت سیدھے رخ سے نہیں، الٹے رخ سے بناتی تھی۔

شادی کے انٹرویو کے لیے جو انتظامات کئے گئے تھے، ہتوری کی بیوی ان کے حق میں نہیں تھی۔ ''کوئی فائدہ نہیں...... خاص طور پر اس لڑکی کے معاملے میں۔ رشتے کی کامیابی کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔'' ان کی یہ گفتگو میں نے بھی سنی تھی۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے ہتوری کی بیوی کی نگاہوں میں وہ نوجوان، جس سے تسوتسومی کی شادی طے کرانے کی کوششیں ہو رہی تھیں، تمام اعلیٰ خوبیوں سے بہرہ ور ہے اور اسے بیوی تلاش کرنے میں قطعاً کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اس کے لہجے میں کینہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسکی باتیں سن کر مجھے بے چینی محسوس ہونے لگی۔

''تمہارا یہی خیال ہے!'' ہتوری نے اپنی بیوی سے پوچھا اس نے فوٹو ایک طرف رکھتے ہوئے مزید کہا، ''مجھے پتا نہیں۔ وہ بہت سلجھی ہوئی خاتون ہے۔ تمہارے خیال میں ان کی جوڑی اچھی نہیں ثابت ہوگی؟''

ہتوری، تسوتسومی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے شادی کے انٹرویو کا ذکر کئے بغیر اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے بطور ماڈل کام کرے۔ اس نے شادی کے انٹرویو کا ذکر کئے بغیر اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے بطور ماڈل کام کرے۔ اپنی بیوی کے سلسلے میں ہتوری کو جن پیچیدگیوں کا سامنا تھا، وہ ان سے قطعی لاعلم تھی۔

میں خوش تھا کہ تسوتسومی، ہتوری سے مل آئی تھی اور اسے گانا بھی سنا چکی تھی۔ جب وہ کام پر آتا تھا، وہ تسوتسومی کو لنچ کرانے یا چائے پلانے باہر لے جاتا تھا۔ جب وہ کام پر آتا تھا، وہ تسوتسومی کو لنچ کرانے یا چائے پلانے باہر لے جاتا تھا۔ جب وہ بیمار پڑ گیا تو وہ مجھے بعض اوقات تن تنہا کہیں جاتی نظر آتی۔ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ گھِس چکی ہو۔ میں سوچتا کیا وہ محسوس کرتی ہے کہ شادی کرانے کا موقعہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے؟ شاید اس نے شوہر پانے کی توقع ہی چھوڑ دی ہے۔ جب

ایک روز راہداری میں میرا اس سے اچانک آمنا سامنا ہو گیا، مجھے اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل حلقے نظر آئے۔ وہ بے حد لاغر دکھائی دے رہی تھی۔ جب میں نے پوچھا: ''طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے مبہم سا جواب دیا، تاہم بعد میں اس نے کچھ اس طرح جواب دیا جیسے یہ بات اسے ابھی ابھی سوجھی ہو، ''پتا نہیں میں کچھ عرصے سے کیوں تھکی تھکی رہنے لگی ہوں۔''

یوراشیما اور میں یونیورسٹی ہسپتال کے سامنے ٹیکسی سے اترے۔ جب ہم اس سفید عمارت کا جائزہ لینے کے لیے مڑے، معلوم نہیں ہتوری کہاں سے آٹپکا۔ جب ہم نے اسے عین اپنے سامنے کھڑا دیکھا، ہماری سٹی گم گئی۔ وہاں کی فضا ہی کچھ اس قسم کی تھی کہ ہم خواہ مخواہ ششدر رہ گئے۔

ہماری اس سے آخری ملاقات کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اس کی سوجن کم گئی تھی اور پہلی نظر میں وہ اچھا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بال کچھ عجیب سے نظر آ رہے تھے...... ہسپتال کے کسی ملازم نے انہیں کچھ زیادہ ہی مہین کاٹ دیا تھا اور اگرچہ آسمان پر کہیں کوئی بادل نہیں تھا، اس نے ربر کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ تاہم وہ باتیں نارمل انداز سے کر رہا تھا اور اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہے۔

ہتوری نے ایک سہ پہر مجھے سٹوڈیو میں ٹیلی فون کیا تھا۔ اس وقت میں اپنی ڈیسک پر نہیں تھا۔ کسی شخص نے مجھے پیغام دیا۔ ''آپ کو ایک آدمی نے، جو اپنا نام ہتوری بتاتا تھا، ٹیلی فون کیا تھا۔ اس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پی کر بہک چکا ہے۔ اس نے غالباً کسی شراب خانے سے ٹیلی فون کیا تھا۔'' لیکن ہتوری نے مجھے ہسپتال سے ٹیلی فون کیا تھا۔ دوائیوں سے اس کی زبان بھاری ہو گئی تھی اور اسے سن کر کسی اجنبی کو یہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ پی چکا ہے۔ جب میں نے ہتوری کو یہ سب کچھ بتایا، وہ کھل کر ہنسا اور جوشیلے انداز سے پوچھنے لگا، واقعی؟ اس کا واقعی یہی خیال تھا؟

جب ہماری اس سے ملاقات ہوئی، تقریباً تین بج چکے تھے۔ چونکہ وہ تسلی بخش طریقے سے صحت یاب ہو رہا تھا، اسے باہر گھومنے پھرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ چنانچہ ہم ہسپتال کی نزدیکی گلیوں میں مٹر گشت کرنے لگے اور پھر مزید باتیں کرنے کے لیے الگ کافی شاپ کے اندر چلے گئے۔ اگرچہ یوراشیما اور میں اس سے پہلے کبھی ہسپتال نہیں آئے

تھے، ہمیں معلوم ہوا کہ ہتوری پانچویں یا چھٹی منزل کے کسی وارڈ میں مقیم ہے۔

جونہی اس نے ہمیں دیکھا، وہ رکے بغیر گفتگو کرنے لگا۔ ''میرے کمرے میں یونیورسٹی کا کوئی آدمی ہے۔ وہ ہر شخص کو بتاتا رہتا ہے کہ وہ کسی مشہور پروفیسر کا صاحبزادہ ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا بے پرکی اڑا رہا ہے۔ وہ طلبا کا سرغنہ تھا اور ان کی کسی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا، لیکن پھر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی اور انجام کار وہ یہاں پہنچ گیا۔ اب وہ کراہنے اور آہیں بھرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتا رہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے عاجز آ چکا ہے اور مرنا چاہتا ہے۔ وہ صرف مجھے ہی اپنے گلے شکوے نہیں سناتا، بلکہ جو شخص بھی اس کے قابو آتا ہے، اس کے کان کھانے لگتا ہے۔ شکایتوں کے طومار باندھنے کے سوا اسے اور کوئی کام نہیں۔

''آخر ایک روز مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ دودھ پیتے بچوں کی حرکتیں چھوڑ دے۔ میں نے اس ڈرایا یا دھمکایا بھی۔ میں نے اخبار لپیٹا اور لائٹر سے اسے آگ لگا دی۔ پھر میں یہ مشعل اس کے چہرے کے قریب لے گیا اور چلا کر اس سے کہا، گاوَدی! اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ پھر میں نے ریزر بلیڈ اٹھایا، اپنی انگلی پر گہرا زخم لگایا اور اسے خون دکھایا۔ ''دیکھو!'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔ اب میرے سامنے مزید رونا دھونا بند کر دو!'' اس کا جسم کپکپانے لگا لیکن وہ دن اور آج کا دن، اب وہ میری موجودگی میں ہائے وائے نہیں کرتا!''

ہتوری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگا۔ اس کی ایک انگلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں اپنی ہتھیلی دکھائی۔ اس پر سرخ سیاہی سے سواستیکا کی شکل کا خاصا بڑا نشان بنا ہوا تھا۔ ہم نے اسے ٹوکے یا اپنی طرف سے ایک لفظ بھی کہے بغیر ادھر ادھر کی ہانکنے دیا۔ جب میں اس کی جوشیلی اور جذباتی گفتگو سن رہا تھا، مجھ پر اداسی نے غلبہ پا لیا۔ اس نے اخبار کو آگ لگا کر اور اپنی انگلی کو کاٹ کر ایک کمزور حریف کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا تھا۔ بہرحال ہتوری کا خیال تھا کہ وہ اسکی مدد کر رہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہسپتال میں لائٹر اور ریزر بلیڈ کہاں سے آ گیا۔

''جب سے میں یہاں آیا ہوں'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''تین آدمی خودکشی کر چکے ہیں۔ ان سب نے اپنے آپ کو پھانسی دی تھی'' پھر اس نے

دوبارہ موضوع تبدیل کر دیا۔'' یہاں بڑے کمرے میں ایک زبردست عورت مقیم تھی۔ میری اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ ذرا بزرگ قسم کی عورت ہے۔ یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ اور دوسری عورتوں سے قطعی مختلف ہے۔ وہ یقیناً کوئی ولی اللہ ہے۔ وہ ہے ہی نیک اور پارسا۔ وہ پوری طرح صحت یاب ہو گئی تھی اور ہسپتال کے حکام نے اسے فارغ کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مجھے یہاں سے چھٹی ملے گی، میں دوبارہ اس سے ملنا چاہوں گا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا نام اور پتا مجھے لکھ دے۔ اس کی تحریر دیکھو تو پکار اٹھو گے کتنی خوبصورت ہے...... اوہ، اس کا پتا؟ یار! مجھے اس کے مکان کا نمبر یاد نہیں رہا۔ ویسے وہ متا کا شہر کے محلے شمورن جا کو میں رہتی ہے اور اس کا اپنا نام ناکومورا جائیکو ہے۔''

''وہ بولتا رہا، بولتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا، ''میری طبیعت پہلے سے واقعی بہت بہتر ہے لیکن اب بھی کبھی کبھی میرے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ یہ میرے لیے ٹھیک نہیں۔ مجھے شانت رہنے کا گر سیکھنا ہو گا۔'' وہ مسلسل باتیں کرنے سے خاصا نڈھال ہو چکا تھا اور قرائن سے نظر آ رہا تھا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ اب اسے اپنی دوا کھا لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے چند گولیاں نکالیں اور ایک گلاس پانی سے اپنے حلق میں اتار لیں۔

''یہ چمک رہی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ یہ گھٹیا مذاق تھا۔ مجھے اس اوچھے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''ہاں، یہ چمک رہی ہے۔ تلوار کی طرح۔'' ہتوری نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

وہ گھبرائے گھبرائے اور ناخوشگوار انداز سے ہنسا اور خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں دراصل اس کی ایک ایسی بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو کبھی بے دھیانی میں اس کے منہ سے نکل گئی تھی اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے سر کے اندر شمشیر ہے اور یہ اس کی ذہنی کیفیت کے مطابق یا تو اپنی چمک دکھانے یا کھونے لگتی ہے۔ مجھے حالات تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس روز اس کا چہرہ بالکل اسی طرح سرخ ہو گیا تھا جس طرح کہ آج ہوا تھا۔ تلوار لازماً چمک رہی ہو گی۔ ''میں سب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''اپنی کمانیں اور تیر لے آؤ۔ دشمن کوئی بھی کیوں نہ ہو، میں اپنی اس تلوار سے اس کا گلا کاٹ دوں گا۔''

مجھے احساس ہوا کہ اسکے اندر جو ہتھیار ہے، اسے لازماً استعمال کیا جانا چاہیے تھا۔ جیسا کہ اس نے دھمکی دی تھی، اسے چاہیے تھا کہ وہ اسے نیام سے نکالتا اور ادھر ادھر لہراتا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس کے ساتھ یمایا اورا پنے دوسرے دشمنوں کوٹھکانے لگاتا۔ اگر اس نے محض اپنی تلوار ان پر برسائی ہوتی، تو اسے اس طرح ہسپتال میں بند نہ ہونا پڑتا جس طرح کہ وہ آج کل تھا۔ لیکن ہتوری کسی شخص پر بھی اپنی تلوار سونتنے کے لیے اپنے آپکو آمادہ نہ کرسکا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا ہی نہیں۔

چھ بج چکے تھے اور ہتوری کا ہسپتال کے اندر بند ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ یوراشیما اور میں واپس جانے کے لیے تیار تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہتوری ابھی جانا نہیں چاہتا۔ ''کچھ دیر اور بیٹھو۔ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ٹیلی فون کرنے منیجر کی میز کی طرف چلا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیلی فون پر بڑے جوشیلے انداز سے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ وہ کھانا باہر ہی کھائے گا۔ ہم نے کافی شاپ میں سادہ کھانا کھایا اور جب ہم فارغ ہوگئے، ہتوری رقم کی تلاش میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا...... اس کے پاس محض معمولی سی ریز گاری تھی.......... یہ بال کی ادائیگی کے لئے بالکل ناکافی تھی......لیکن ہمارا ویسے بھی اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ ہم ادائیگی کا بار اس پر ڈال دیں گے، یہ ہمارے ضمیر کے خلاف تھا۔ ہم ریستوران سے باہر نکلے اور ادھر چل پڑے جہاں ہماری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نے ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

''تمہارا کون سا ہے؟'' میں نے سفید عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے ہتوری سے پوچھا۔

''پانچویں منزل پر.......... وہاں'' اس نے کسی کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آسمان پر پہلے ہی تاریکی چھا چکی تھی اور قطار در قطار کھڑکیوں میں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ درحقیقت مجھے بالکل معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس کمرے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہتوری کو واپس ہسپتال جانے میں قطعاً کوئی تامل نہیں۔

اگرچہ اس نے بس سٹاپ تک پہنچنے کے لیے ہمیں تفصیلی ہدایات دی تھیں مگر ہم نے ادھر جانے کا تردد نہ کیا اور راستے ہی میں ٹیکسی لے لی۔ جب ہم گھر واپس جا رہے تھے، ہم ہتوری کے متعلق باتیں کرنے اور پھر سوچنے لگ کہ ہمیں مے نوشی کے لیے کہاں جانا چاہیے۔

اوئے کنزا بورو

برکھا پیٹر

اوئے کنزا بورو (Oe Kinzaburo) جاپان کے دیہی علاقے شیکوکو کے ایک گاؤں میں 31 جنوری 1935ء کو پیدا ہوئے۔ وہ سات بچوں کے خاندان میں تیسرے بیٹے تھے۔ بحرالکاہل کی جنگ کے دوران میں ان کی عمر چھ سال تھی۔ ابھی وہ نو برس کے تھے کہ وہ اپنے باپ اور دادی دونوں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ جب وہ دس سال کے ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ہیروشیما کو ایٹم بم کا نشانہ بنا دیا گیا ہے اور جاپان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ تب سے وہ ''مطبوعہ تحریر کے پس پردہ خلا'' کے اپنے ادراکات کی ....تحریر اور حقیقت کے مابین کمزور ربط کی آگہی......... جڑیں اسی الگ تھلگ گاؤں میں، جہاں دنیا صرف مطبوعہ الفاظ یا گاہے بگاہے دشمن کے طیاروں کی ڈراؤنی پروازوں سے جانی جا سکتی تھی، گزارے بچپن میں تلاش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

جب اوئے اوائل جوانی کی منازل طے کر رہے تھے تو جاپان پر امریکیوں کا قبضہ تھا اور جاپانی مورخین کے الفاظ میں اس کے ہم وطنوں کو جنگ میں اٹھائے گئے نقصانات سے بحالی کے دوران میں ''اقدار کے الٹ پلٹ جانے کا تجربہ'' ہو رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب وہ 1951ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے فرانسیسی ادب کا بھرپور مطالعہ کیا اور 1959ء میں ژاں پال سارتر کی فکشن پر مقالہ تحریر کیا۔ 1960ء میں انہوں نے مشہور جاپانی ادیب تامی مان ساکو کی صاحبزادی یوکاری کے ساتھ شادی کی۔

جب اوئے نے کہانیاں اور ناول لکھنے کا کام شروع کیا تو جاپان اور امریکا کے مابین

سلامتی کے معاہدے کی از سرنو تجدید کی گئی تھی اور اس سے ان کا وطن سیاسی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ جاپان پر امریکہ کا پہلے ہی قبضہ کیا تھا، سلامتی کے معاہدے کی تجدید نو سے جاپان کا امریکہ پر انحصار مزید بڑھ گیا۔ یوں ایک قسم کا مخاصمانہ فضا پیدا ہو گئی اور لوگوں کے دماغ پراگندہ ہونے لگے کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اپنی ثقافتی شناخت کیا ہے۔ ان سب باتوں کا عکس ان کی ابتدائی تحریروں میں ملتا ہے۔ ان تحریروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حسیاتی غنائیت، جنس کے ظریفانہ بیان اور فلسفیانہ تحقیق وجستجو کا غیر معمولی امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس امتزاج کی بعض لوگ بہت تعریف کرتے تھے لیکن دوسروں کو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور وہ اس کے خوب لتے لیتے تھے۔

1963ء میں دو ایسے واقعات پیش آئے کہ اوئے کا نقطہ نظر ہی تبدیل ہو گیا اور ان کی فکشن کا انقلابی طور پر رخ بدل گیا۔ اس سال جون میں ان کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ بدقسمتی سے وہ پیدائش ہی سے دماغی طور پر معذور تھا۔ اگست میں وہ ہیروشیما گئے جہاں انہوں نے جوہری ہتھیاروں کے خلاف کانفرنس میں شرکت کی۔ ان دو واقعات کے پس منظر میں انہوں نے دو کتابیں تحریر کیں۔ پہلی کتاب ''ایک ذاتی معاملہ'' (1964ء) ناول ہے (اسے شن چوشا ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا)۔ یہ ایک ایسے باپ کی لرزہ خیز جدوجہد کی کہانی ہے جو اسے اپنے ذہنی طور پر معذور بچے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے کرنا پڑتی ہے۔ دوسری کتاب کا نام ''ہیروشیما کے کوائف'' (1965ء) ہے۔اس میں انہوں نے ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جان کے بعد جو تباہ کاری ہوئی، اس سے بچ جانے والے بعض افراد کے ساتھ اپنی ملاقاتیں بیان کی ہیں۔ کتاب میں وہ اپنے ہیروشیما کے سفر کا ربط اپنی اس مایوسی اور بے بسی سے قائم کر دیتے ہیں جو انہیں اپنے بیٹے کے سلسلے میں ہوئی تھی جو ہسپتال میں کسی مشین میں پڑا تھا اور جس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ضعیف العقل اولاد، جو پاکیزگی اور پاگل پن کی علامت ہے، اور ایٹمی تباہ کاریاں، تب سے ان کی فکشن کی کلیدی خصوصیات بن چکی ہیں۔ یوں ان کا حقیقت پسندانہ فکشن سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ ان کا اندازِ تحریر پیچیدگی اختیار کرنے لگا اور وہ غریب الہیئت (Grotesque) اور فینٹازی (Fantastic) قلم رو کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے لگے کیونکہ ایٹمی جنگ کے دور کی زندگی کے بیان کے لئے یہی انداز زیادہ مناسب ہے۔ ان کے اس عہد کے عظیم ناولوں میں ''خاموش چیخ'' (1967ء) ''میری روح میں سیلاب امنڈ آیا ہے'' (1973ء) اور ''ایک معاصر کھیل''

(1979ء) شامل ہیں۔ یہ سب ضخیم اور تہہ در تہہ ناول ہیں اور ان میں ضمیاتی، سیاسی اور علمیاتی موضوعات بڑی مہارت سے اٹھائے گئے ہیں۔

ان ناولوں کے مقابلے میں ''برکھا پیڑ'' بہت مختصر اور نسبتاً ہلکی پھلکی کہانی ہے۔ اس کے واقعات کے بیان کے لئے بحرالکاہل کے جزائر ہوائی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہاں ''مشرق اور مغرب کے مابین مکالمہ'' کے عنوان سے ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس کانفرنس سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انسانی زبان (Language) کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ یہ سب کچھ بیان کرنے پر قادر نہیں اور یہ کہ تخیل اور ادراک کے مابین امتیاز (یہ امتیاز غالباً کایاں پر کھا پیڑ سے وابستہ ان دو مختلف شکلوں کی تاریکیوں کی علامت ہے جو ایک دوسرے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں) اتنا واضح نہیں۔ کہانی کا خوب آلود لہجہ بالغ نظر اور بالغ جذبات اوئے کا خصوصی وصف ہے۔ پھر جنگ ویت نام کے امریکی بھگوڑوں، ایرانی انقلاب اور لوگوں کو یرغمال بنائے جانے کے واقعات کی طرف اشارے کر کے وہ سیاسی سیاق و سباق میں جو مرصع اور پیروڈی سے بھرپور خاکہ کشی کرتے ہیں وہ بھی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کہانی میں جس کائناتی (Cosmic) درخت کا ذکر آیا ہے، اس کی انہوں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے ''وہ عورتیں جو برکھا پیڑ کی باتیں سنتی ہیں'' (1992ء) میں زیادہ وضاحت سے نقشہ کشی کی ہے۔ اوئے کو نوبیل ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

''آپ ان لوگوں کی نسبت درخت دیکھنا شاید زیادہ پسند کریں گے۔'' جرمن نژاد امریکی عورت نے مجھے اپنی رہنمائی میں پارٹی میں شریک اشخاص سے ٹھاٹھس بھرے ہوئے کمرے سے نکالتے اور لمبی چوڑی راہداری میں لے جاتے ہوئے کہا۔ راہداری کے اختتام پر برآمدہ تھا۔ وہاں اندھیرے کی وسیع و عریض چادر ہماری منتظر تھی۔ میرے عقب میں لوگوں کے اونچی آوازوں میں باتیں کرنے اور کھلکھلا کر ہنسنے سے جو شوروغل بپا تھا میں اس میں محصور اندھیرے میں جس سے سیلن کی بو آ رہی تھی جھانکنے لگا۔ یہ کہ اس تاریکی کا بیشتر حصہ ایک ہی عظیم الجثہ درخت نے گھیر رکھا تھا۔ اس حقیقت سے عیاں تھا کہ تاریکی

کنارے پر سیاہ چوبی تختوں کی باڑوں سے مشابہ چمکتی دمکتی جڑوں کی لاتعداد تہوں کی جھلملاتی شکلیں دور تک ہماری جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے آہستہ آہستہ اندازہ ہوا کہ سیاہ تختوں کی باڑوں جیسی یہ شکلیں مٹیالی پنگلوں آب و تاب کے ساتھ نرم و گداز انداز سے جگمگا رہی ہیں۔ اس درخت نے جس کی جڑیں پھیلتے پھیلتے تختوں کی طرح چوڑی ہوگئی تھیں اس کی درختی عمر کتنے سو سال ہوگئی؟ اس تاریکی میں اوپر آسمان اور ڈھلوان کے کہیں بہت نیچے جو سمندر تھا، دونوں کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اگر درخت کو انسانی پیکر تصور کر لیا جائے، نیو انگلینڈ سٹائل (1) کی اس وسیع و عریض عمارت کے برآمدے کے چھجے کے نیچے، جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے عین دوپہر کے وقت بھی ہمیں اس کی ٹانگوں کے نچلے حصوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آ سکتا۔ عمارت کے باہر صرف ایک روشنی تھی اور وہ بھی اتنی مدھم کہ نہ ہونے کے برابر۔ چنانچہ اس کے اردگرد درخت نے کامل تاریکی کی جو دیوار بنا دی تھی وہ اس قدیم وضع قطع بلکہ اس کی اصل عمر پر پوری طرح موزوں آ رہی تھی۔

''آپ نے کہا تھا کہ آپ اس درخت کا نام جاننا چاہتے ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ ہم اسے ''برکھا پیڑ'' کہتے ہیں لیکن یہ ہمارے خاص طور پر کائیاں برکھا پیڑوں میں سے ایک ہے۔'' ادھیڑ عمر امریکی عورت نے کہا ہے جسے میں اگا تھا کہتا تھا کیونکہ میں اس کے خاندانی نام (2) سے واقف نہیں تھا...... لکھنے کے اس انداز سے کچھ یوں مترشح ہوتا ہے جیسے یہاں اس طرح کا بیرون ملک معاشقہ لڑایا جا رہا ہو جیسا ہمیں وقتاً فوقتاً بعض جاپانی ناولوں میں نظر آتا ہے جن کے ہم وطن ہیرو بیرملکی زبانوں کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ تاہم میں نے وہاں جو دس دن گزارے تھے، ان کے دوران میں مجھے اس قسم کے تعشق کی کوئی فرصت نہ مل سکی۔ میں ایک سیمینار میں شرکت کر رہا تھا جس کا اہتمام ہوائی کے ایسٹ ویسٹ سنٹر نے کیا تھا اور جس کا موضوع ''ثقافتی لین دین اور روایات کی تعین نو'' جہاں تک میری انگریزی دانی کا تعلق ہے میں نے بھارت کے تین مندوبین کو کینیڈا کے مندوب سمجھ لیا اور جب تک کانفرنس کی آدھی مدت گزر نہ گئی مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان کا تعلق بھارت کے علاقے کنٹرا سے ہے۔ چونکہ یہ کانفرنس بھارت کے انسان دوست فلسفی کمار سوامی (4) کی یاد میں منعقد ہو رہی تھی اس لئے بھارت کے مختلف خطوں کے متعدد مندوب جو انگریزی کی مختلف شکلوں میں بڑے رواں دواں تھے، اس میں شرکت کر رہے

تھے۔ مثلاً انہی میں بمبئی کا ایک بھارتی یہودی شامل تھا۔ اس کا گفتگو کرنے کا انداز خالص بھارتی تھا لیکن اس میں کوئی ایسی بات بھی ضرور تھی جو ثابت کر رہی تھی کہ یہ شخص یہودی ہے۔ میں اس کی حس ظرافت سے تو ضرور محظوظ ہوا لیکن اگر میں اس کے لیکچر کے اختتام پر اس کے ایک ایک نقطے پر اعتراض نہ کرتا تو میرے لئے بعد کے اجلاسوں میں جواب دینا ممکن نہ ہوتا۔

امریکہ سے جو مندوب آیا تھا وہ وہی شاعر تھا جس نے بیٹنگ نسل کے ترجمان کی حیثیت سے ایک عہد کو متعین کیا تھا۔ وہ ہر صبح اجلاس میں ایک چھوکرے کی معیت میں آتا تھا جو جسمانی طور پر مضمحل اور نفسیاتی طور پر زخم خوردہ معلوم ہوتا تھا۔ (کم از کم مجھے وہ اسی قابل رحم حالت میں نظر آتا تھا) یہ چھوکرا تو آتے ہی گول میز اس کے پیچھے، جس کے گرد سیمینار کے شرکا بیٹھے ہوتے، اونگھنے لگتا ہے لیکن امریکی شاعر اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتا اور کہتا ''یہ میری بیوی ہے۔'' نیویارک کے اس شاعر کا بات کرنے کا اپنا منفرد انداز تھا۔ وہ جو کچھ کہتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ تول تول کر کہہ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی مطلق معلوم ہونے نہیں دیتا تھا کہ آگے کیا کہے گا۔ میرے لئے اس کی انگریزی سمجھنا خاصا دشوار تھا۔ اس نے ایک نام نہاد ہائیکو نظم بھی، جسے میں نیچے درج کر رہا ہوں، لکھی تھی اور اس پر مجھ سے میری رائے کا طلب گار تھا اس نظم میں جس منظر کشی کی تصویر کشی کی گئی تھی، اس نے اسے کیفے ٹیریا کے نیپکن پر بنا کر بھی دکھایا۔ برف سے ڈھکا ہوا پہاڑ جس کی مکھی کے پروں میں سے، جو کسی دریچے میں کچلی پڑی تھی، جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ قصہ مختصر، وہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اس ادیب کی مستند رائے لے کر ہی دم لے گا جو ہائیکو نظموں کی سرزمین سے آیا تھا۔ اس طرح جب میں اس کا دوست بن گیا تو میرے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ تو سیمینار میں تقریر کر رہا ہو اور میں اپنے ہی خوابوں میں کھویا رہوں۔ خیر، اس کی ہائیکو نظم مندرجہ ذیل تھی:

برف پوش پہاڑی کھیت
نظر آ رہے ہیں دریچے پر، مکھی کے
شفاف پروں میں سے

جب تمام اجلاس، جو اس روز منعقد ہونا تھے، ختم ہو گئے تو میں طلبا کی ڈارمیٹری

میں............ یہ ڈارمیٹری ایسی ویسی نہیں تھی، یہاں لڑکیاں رہتی تھیں............ جو ہماری رہائش کے لئے مخصوص کی گئی تھی، واپس آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں چند دن آرام کروں گا کہ بدقسمتی سے ایک کوتاہ قامت امریکی، جس کے چہرے کے عضلات زخمی تھے اور جو سخت اذیت میں مبتلا دکھائی دیتا تھا، آ دھمکا اور مجھ سے تہدید آمیز انداز سے مخاطب ہو گیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پانچ سال قبل بحیرہ جاپان کے ساحل پر واقع کسی مضافاتی قصبے میں مقیم تھا اور جو لوگ ویٹ نام کی جنگ سے جان چھڑانے کے لئے فوج سے بھاگ آتے تھے، ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ دریں اثنا کسی نے اسے بتایا کہ اس کے رفقائے کار میں یہ افواہ گردش کر رہی ہے کہ وہ بھگوڑوں کی مدد کے پردے میں سی آئی اے کی جاسوسی کر رہا ہے۔ اس پر وہ سٹپٹایا اور ایک دن چپکے سے ٹوکیو کھسک گیا، اور وہاں سے واپس امریکہ پہنچ گیا۔ ''میرا خیال ہے'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''کہ تحریک کے رہنما مجھے ابھی تک جاسوس تصور کرتے ہیں اور اگر اب میں ان کے ساتھ اپنے تعلقات کی تجدید کرنا چاہتا ہوں، تو خود مجھے ان کے نام یاد نہیں آئیں گے۔ مجھے ہمیشہ سے کم سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ جاپانی تو درکنار، میرے لئے تو وہ انگریزی سمجھنا بھی دشوار تھا جو یہ جاپانی بولتے تھے۔ درحقیقت جب میں تحریک کے ساتھ کام کر رہا تھا، متعدد غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور میں اکثر ذہنی انتشار میں مبتلا رہنے لگا۔''

ان بے سروپا افواہوں پر کہ وہ جاسوس ہے، نوجوان امریکی اتنا پریشان ہوا کہ اسے ایک پرائیویٹ ادارے میں داخل ہونا پڑا جہاں نفسیاتی مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے اور وہ اب تک وہیں مقیم ہے۔ ہوائی میں اس قسم کے بے شمار ادارے ہیں۔ ان میں بعض بے حد گراں ہیں اور بعض میں تقریباً مفت سہولتیں اور خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ شخص جس ادارے میں رہتا تھا، وہ اصل اخراجات سے ذرا ہی زیادہ رقم وصول کرتا تھا اور پھر بھی اسے اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے دن کے دوران میں باہر کام پر جانا پڑتا تھا۔ لیکن میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ میں اس مفلوک الحال، اذیت زدہ، سرتاپا مایوس اور دل گرفتہ نوجوان امریکی کی کیا مدد کر سکتا ہوں جس کا ننھا منا، مہین جسم میل کچیل میں (جو بظاہر اس کے کام کی دین تھی) لتھڑا ہوا تھا اور کسی پرندے کی طرح اپنا سر مسلسل میری طرف جھکائے ہوئے تھا جیسے وہ کان میرے منہ پر رکھنا چاہتا ہو کیونکہ وہ ابھی تک اپنے خراب کان کی وجہ

سے یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میری انگریزی............ جاپانی انگریزی............ کا مطلب کیا ہے۔

چونکہ درخت نے ہمارے سامنے کے تاریک حصے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اس کی جڑوں کو، جو پوری طرح بڑھ اور پھیل چکی تھیں، دیکھنا ممکن نہیں تھا، ان کے صرف آخری سرے نظر آ رہے تھے...... کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ادھیڑ عمر عورت بھی، جس نے مجھے درخت دکھایا تھا، کچھ اسی طرح کا کوئی پرائیویٹ نفسیاتی کلینک چلا رہی ہے جس طرح کا اذیت زدہ امریکہ نے بیان کیا تھا۔ پھر بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نیو انگلینڈ کے پرانے طرز تعمیر کی اس وسیع و عریض عمارت میں واقع اس کا شفاخانہ نسبتاً اونچے درجے کا ہو گا۔

پورے امریکہ کی یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی اداروں میں آئے روز جو سیمینار ہوتے رہتے ہیں، ان کے ساتھ اکثر و بیشتر مالی یا انتظامی معاونین لازماً وابستہ ہوتے ہیں۔ عام طور پر ادھیڑ عمر یا بزرگ خواتین جنھوں نے چندے میں تو کوئی بڑی رقم نہیں دی ہوتی، شرکا کے گرد حلقہ بنانے کے لئے بطور تفریحی سامعین ضرور آ جاتی ہیں۔ بعض اوقات وہ بات یوں کرتی ہیں جیسے وہ کوئی سوال پوچھ رہی ہوں مگر وہ اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے بھی کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ پھر رات کو مالی معاونین کی باری آ جاتی ہے۔ وہ شرکاء کو اپنے گھروں میں دعوت پر بلا لیتے ہیں۔ ان شرکا کے لئے، جن کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی، خاص طور پر میرے جیسے لوگوں کے لئے جن کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی، خاص طور پر میرے جیسے لوگوں کے لئے جنھیں یہ زبان بس واجبی سی آتی ہے، یہ دعوتیں دن کے دوران میں منعقد ہونے والے سیمیناروں سے کم اذیت ناک نہیں ہوتی۔ مزید برآں چونکہ یہ مالی معاونین دن کے سیمیناروں میں بھی شرکت کر چکے ہوتے، وہ سوال پوچھ پوچھ کر، جن سے وہ کبھی تھکتے نظر نہیں آتے، آدمی کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔

جرمن امریکی عورت جسے لوگ اگا تھا کہتے تھے انہی معاونین میں شامل تھی اور وہ جس مقصد کی خاطر مجھے ملحقہ کمرے سے، جس میں دعوت منعقد ہو رہی تھی، نکال کر برآمدے میں لے آئی تھی اور تاریک باغیچے میں درخت دکھانے لگی تھی اس کا تعلق بھی کسی ایسی بات سے تھا جو میں نے اس روز سیمینار میں کہی تھی۔ سیمینار کے حوالے سے کمار سوامی

کی جو ذاتی اشیا نمائش کے لئے رکھی گئی تھیں ان میں ایک بھارتی تصویر ''کرشن پیڑ پر'' بھی شامل تھی۔ یہ بے حد مہین خاکہ تھا اور اسے کیلے کے پتے پر بنایا گیا تھا۔ کرشن درخت پر براجمان تھے۔ نیچے دریا تھا۔ اس میں برہنہ گوپیاں چھینٹے اڑا رہی اور کرشن کو آوازیں دے رہی تھیں۔ ''آپ جب بھی ان عورتوں پر نظر ڈالیں گے، آپ کو ان کے جسم خالصتاً بھارتی دکھائی دیں گے'' بیٹنک شاعر نے جو ہندو کلچر کا سپیشلسٹ بھی تھا اپنی گفتگو کے آغاز پر ہی دعویٰ کر دیا تھا ''اس تصویر کو کچھ ایسی پرکاری سے پینٹ کیا گیا ہے کہ آپ کسی زاویے سے بھی دیکھیں، ان بھارتی ناریوں کے جسم، خاص طور پر ان کی چھاتیاں اور پیٹ کس بھی دوسرے ملک کی عورتوں سے بالکل ممیز نظر آئیں گے اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی آدمی بھارت میں گھومتا پھرتا ہے، اسے اس جسمانی ساخت کی ناریاں دیکھنے کو ملیں گی۔'' مشرق بعید کے دوسرے خطوں کے مندوبین کو دعوت دی گئی کہ وہ اس تبصرے پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس پر چند بھارتی عورتیں، جو جلسے میں محض تفریحاً آ گئی تھیں، تاؤ کھا گئیں اور انہوں نے امریکی شاعر کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا کہ موضوع کا رخ درختوں کی جانب موڑ دیا۔

''ایلن نے جو کچھ کہا ہے، اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ میں ان کی اس بات سے متفق ہوں کہ بھارت کی لوک مصوری میں انسانی شکلیں جس انداز سے پیش کی جاتی ہیں، ان میں بعض ایسی انوکھی خصوصیات ہیں جنہیں خالصتاً بھارتی کہا جا سکتا ہے۔ میں جزوی طور پر اس نقطہ نظر کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ اگر معاملے کا دوسرا درخ دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے خود جسم کی شکل بھی متاثر ہوئی ہے۔ غالباً یہ مفروضہ باندھنا قرین انصاف ہو گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارتی باشندوں کی جسمانی ساخت ان کے لوک فن کیا سلوب کا تعین کرتی ہے اور بات کرنے کا یہ انداز ایلن سے مخصوص ہے۔ چونکہ مجھے بھارتی ناریوں کے اجسام کے متعلق کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا کہ میں ان کے متعلق جچے تلے انداز سے بات کر سکوں لہٰذا میں چاہوں گا کہ بالکل انہی نظریات کا اطلاق درختوں پر کر دیا جائے۔

''یہ سیاہ درخت جس پر کرشن چڑھے بیٹھے ہیں، اسے میرے ملک میں ب ھارتی برگد کہا جاتا ہے۔ بھارتی لوک فن کے اسلوب میں جن تکنیک کاریوں سے کام لیا جاتا ہے

اور اس میں جس حساسیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اس درخت کی تصویر بناتے وقت انہیں یقیناً برتا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ تصویر کشی کے دوران میں ان امتیازی خصوصیات کا اظہار ذرا غلو سے کیا گیا ہے، پھر بھی اس میں درخت کے تنے اور اس کی قوس دار شاخوں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ چھونے پر ٹھوس معلوم ہوتی ہیں یا پھر اس کے پتوں کی نوکیں کسی دم کی طرح لانبی اور مہین نظر آتی ہیں........... اور یہ تمام چیزیں خیالی نہیں، بلکہ حقیقت پسندانہ مشاہدے پر مبنی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر جائزہ لینے سے مجھے یہ درخت امتیازی اعتبار سے بھارتی معلوم ہوتا ہے۔ اس ٹھوس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے میں ایلین کے تصور سے ملتا جلتا مفروضہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کسی علاقے میں جو درخت پائے جاتے ہیں اور وہاں جو لوگ رہتے اور مرتے ہیں، ان کے مابین قریبی مشابہت ہوتی ہے۔ کیا کرانا خ (6) (کی تصویروں) کے درختوں کو دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ درخت نہیں بلکہ بالائی فرنگستان (7) کے لوگ کھڑے ہیں؟''

میں نے اپنی اس خاص والہانہ شیفتگی کا بھی ذکر کیا جو مجھے درختوں اور ان کے ناموں سے ہے جو مختلف علاقوں میں ان کی شناخت کے لئے رکھ لئے جاتے ہیں۔ ''میں جب کسی غیر ملک کا سفر اختیار کرتا ہوں، میں اس کے خاص درختوں کو ان کے اپنے ماحول میں دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مزید برآں، اس ملک میں ان درختوں کے مخصوص، منفرد نام معلوم کرنے اور یوں انہیں صحیح معنوں میں جاننے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرا ان سے واقعی آمنا سامنا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جاپانی کرشن کے اس درخت کو برگد کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اظہار کی یہ صورت اس کی سائنسی درجہ بندی Ficus religiosa Linn سے مختلف چیز ہے۔ جہاں تک اس کے سائنسی نام کا تعلق ہے، میں اس کی تشریح یوں کرتا ہوں کہ اس میں جس قسم کے درخت کی وضاحت کی گئی ہے، وہ درخت کے نام سے مختلف ہے......''

یہ تھے وہ سابقہ حالات جن کے پیش نظر اگاتھا کی نظرِ کرم مجھ پر پڑی تھی۔ اس نے مجھے پارٹی سے اٹھایا اور تناور درخت کے پاس لے آئی جس نے عمارت کے سامنے باغیچے کو گھیر رکھا تھا۔ تاہم چونکہ میرے اس عمارت میں پہنچنے اور منی بس سے اترنے سے پہلے ہی اندھیرا چھا چکا تھا، مجھے سارا درخت نظر نہیں آ سکا تھا۔ درحقیقت اس وقت بھی مجھے

درخت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں محض اس طرف نگاہیں گاڑے کھڑا تھا جہاں مفروضہ طور پر درخت کھڑا تھا۔ بہرحال اگا تھانے نے اتنی مہربانی کی کہ وہ مجھے درخت کا مقامی نام سکھانے کی کوشش کرنے لگے۔

''یہاں کے لوگ اسے ''برکھا پیڑ'' کہتے ہیں کیونکہ رات کو جب چھینٹا پڑتا ہے تو اس کے پتوں سے اگلے دن کی دوپہر کے بعد تک پانی کے قطرے یوں ٹپکتے رہتے ہیں جیسے (بادلوں کی طرح) خود درخت برس رہا ہو۔ (مینہ پڑنے کے بعد) دوسرے درخت کو جو انگلیوں کی نوکوں سے خاص بڑے نہیں ہوتے، پانی ذخیرہ کئے رکھتا ہے۔ پھر اسے ''کائیاں درخت'' نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟''

اس روز غروب آفتاب کے وقت آثار کچھ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے بارش ہو گی اور درحقیقت چھینٹا پڑا بھی تھا۔ چنانچہ میں تاریکی میں جس رطوبت کو سونگھ رہا تھا، وہ بارش تھی جسے انگلیوں کی نوکوں سے مشابہ گھنے پتوں نے بیچ میں روک لیا تھا اور اب وہ اس کے قطروں کے ازسرِنو نیچے گرنے کا سبب بن رہے تھے۔ اپنی پوری توجہ سامنے مرکوز کرتے اور اپنے عقب کے شوروغل کو نظر انداز کرتے مجھے یوں لگا جیسے میں اس آواز کو سن سکتا ہوں جو وسیع قطعہ زمین پر بارش کے قطرات ٹپکنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ جب میں کان لگائے سن رہا تھا مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے سامنے تاریکی کی دیوار میں اندھیرا دو مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہو۔ ایک اندھیرا تو کچھ کچھ استوائی افریقہ کے اس تناور درخت سے ملتا جلتا تھا جسے وہاں کے لوگ باؤَ باب (Baobab) کہتے ہیں (اس کا تنا بے انتہا موٹا اور جڑیں گٹھلی دار ہوتی ہیں) جہاں یہ قوس نما اندھیرا ختم ہوتا ہے، وہاں ایک دوسری قسم کے اندھیرے نے بھنور رکھا تھا جو اتھاہ گہرائیوں میں جا رہا تھا۔ یہ اندھیرا اتنا عمیق تھا کہ اگر زوال پذیر چاند کی کرنیں کسی طرح اس میں سرایت کر جاتیں، تو بھی پہاڑ، سمندر یا ہماری انسانی کائنات کی کوئی دوسری عظیم چیز اس میں نظر نہ آ سکتی۔ میں سوچنے لگا کہ امریکہ سے کوئی سو............ یا ڈیڑھ سو............ سال قبل جو تارکین وطن یہ عمارت تعمیر کرنے آئے تھے، انہیں اپنی پہلی ہی رات لازماً اس اندھیرے سے واسطہ پڑا ہو گا۔ لیکن کیا یہ اندھیرا، جو باغیچے سے پرے جماہیاں لے رہا ہے جو ہر اس شخص کے جسم و روح کو نگلنے کے لئے کمر بستہ ہے جو اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ کرے، ذہنی مریضوں کی رہائش گاہ کے لئے

مناسب فضا مہیا کر سکتا ہے؟

میری جو یہ عادت ہے کہ میں اپنے خیالات کو کسی غیر ملکی زبان میں پیش کرنے سے پہلے سنسر کرتا رہتا ہوں، اسی کے باعث میں یہی سوال اگا تھا سے پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ غالباً یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ ایک ایسی ہستی کی حیثیت سے، جو اس عمارت میں رہتی تھی اور اس کے مکینوں کی ذمے داری اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہی تھی، اگا تھا لازماً میرے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتی جیسے میں براہ راست خود اس کی ذات پر نکتہ چینی کر رہا ہوں۔ تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے دو تاریکیوں کا.......... ایک تو درخت کی شکل کی دائرہ نما تاریکی جسے میں نے اپنے تخیل میں تخلیق کیا تھا اور دوسری وہ تاریکی جو اس پہلی تاریکی کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی جو ادراک ہوا ہے اس میں یہ جرمن نژاد امریکی عورت بھی شامل ہے جو یہاں پیچھے کھڑی ہے کیونکہ مجھے اس کی تیکھی ٹھوڑی والے بیضوی چہرے سے، جسے اس کی کمان کی طرح سیدھی ریڑھ نے سہارا دے رکھا تھا، کچھ اس قسم کی لمبی آہ نکلتی محسوس ہوئی تھی جیسے کائنات میں تاریکی کا تیر چھوڑا جا رہا ہو۔ ہم درخت سے جس میں سے رات کے عالم میں پانی کی بو خارج ہو رہی تھی، پیچھے ہٹ گئے اور دوبارہ برآمدے کے چوڑے چوبی تختوں پر چلنے لگے۔

اس کانفرنس سے وابستہ دیگر تمام امریکی عورتوں کی طرح اگا تھا حقیقت پسند تھی۔ گھڑے گھڑائے نظریات پر عمل کرنے کی بجائے مسائل کو حالات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتی تھی اور ہر شعبے کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ چنانچہ وہ تاریک باغیچے سے واپسی کے سیدھے سادھے اور پرسکون عمل کو بھی بامقصد بنانے کے لئے اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ پہلی منزل پر طویل برآمدے کے ساتھ ساتھ جو متعدد کمرے تھے وہ ان میں سے ایک کے سامنے رکی اور ذرا سا گھٹنوں کے بل جھک کر صحیح معنوں میں پیار بھری نظروں سے سامنے کی دیوار پر کسی چیز کو نگاہیں گاڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کی اس غیر معمولی حرکت نے میرے جذبہ تجسس کو ہوا دے دی اور میں بھی دروازے کے اندر جھانکنے لگا۔ (ہوائی میں مجھے جگہ جگہ شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کی روشنیاں نظر آتی رہی تھیں۔ ان کے برعکس یہاں عمارت کے ان کمروں میں جہاں پارٹی منعقد ہو رہی تھی، نرم اور طراوت بخش روشنیاں بھی لگائی گئی تھیں۔ اس سے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہاں واقعی ذہنی مریضوں کے

لئے سہولتوں کا بندوبست کیا ہوگا) اور اب میں جس کمرے کے اندر جھانک رہا تھا اس میں بھی ایک مدھم بلب جل رہا تھا۔ یہ اونچی اور پلستر شدہ چھت سے لٹک رہا تھا اور اس کی ہلکی اور دھندلی روشنی شیلفوں میں رکھی (جن سے کمرے کی ایک پوری دیوار ڈھپی ہوئی تھی) کتابوں پر پڑ رہی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے میرے جیسے قد کاٹھ کے آدمی کو اتنا جھکنے کی ضرورت پیش نہ آئی جتنا کہ اگا تھا جھکی ہوئی تھی۔

اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد جب میری نگاہیں مدھم روشنی سے مانوس ہوگئیں، مجھے تقریباً چھ فٹ مربع روغنی تصویر نظر آئی۔ یہ غیر معمولی انداز سے اس دیوار کے (جس کے ساتھ ساتھ کتابوں کی شیلفیں لگی ہوئی تھیں) تقریباً درمیان میں فضا میں کچھ اس طور معلق تھی کہ تمام کتابیں اس کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ تصویر عین اس زاویے پر اس لئے لٹکائی گئی ہے تا کہ یہ ہر اس شخص کو جو برآمدے میں سے دیکھے، جیسا کہ ہم کر رہے تھے، یا باغیچے میں تاریکی کے درخت کی جڑوں سے اسے جھانکے تو یہ اسے صاف نظر آ جائے۔ اس سے اچانک میرے ذہن میں خیال آیا ہے: کیا میں نے درخت کے تختوں سے ملتی جلتی لاتعداد جڑوں کے مابین کوئی آہنی کرسی، جس پر سادہ سیاہ رنگ کیا ہوا تھا، نہیں دیکھی تھی؟

''گھوڑے پر دوشیزہ'' اگا تھا نے بظاہر تصویر کا عنوان پڑھتے ہوئے بڑے سپاٹ اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ مجھے ایکا ایکی احساس ہوا کہ میں جو تصویر دیکھ رہا ہوں وہ کسی نوخیز لڑکی ہے۔ وہ بڑے ٹھسے سے کسی کمیت شہ زور گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی زین گھوڑے کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ خاصی نیچے چلی گئی تھی۔ لڑکی کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں جو دیکھنے میں بڑی بھیانک اور حوصلہ شکن معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ دیواریں شاید کسی قید خانے یا کسی ایسے کیمپ کی تھیں جس میں سیاسی، مذہبی یا نسلی اعتبار سے نامرغوب اشخاص کو مقید کیا جاتا تھا اور گھڑ سواری سے جس پر تفریح فضا کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے، ان سے یہ قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اچانک مجھ پر منکشف ہوا کہ گھوڑے پر جو لڑکی بیٹھی ہے وہ خود اس زمانے کی اگا تھا ہے جو بھی ابتدائی بلوغت کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اس کا ذکر اگا تھا سے کر دیا۔ میں نے نیم تاریکی میں دیکھا کہ جب وہ میری بات کا جواب دے رہی تھی تو اس کے چہرے کی جلد

کے نیچے خون امنڈنے لگا تھا۔ ''جی ہاں آپ نے درست فرمایا۔ یہ میں ہی ہوں۔ یہ تب کی بات ہے جب میں ابھی جرمنی میں ہی تھی۔ میں گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی۔ زندگی امن چین سے گزر رہی تھی اور صحیح معنوں میں دل خراش، بھیانک اور ڈراوٴنے واقعات کا ظہور نہیں شروع ہوا تھا۔'' اگاتھا کی دہکتی نیلی آنکھوں اور رخساروں میں، جو اتنے سرخ ہو چکے تھے کہ اس کے چہرے کے مہین سرخ بالوں سے حرارت ٹپکتی محسوس ہونے لگی تھی، کوئی اتنی پرشدت اور پرطاقت چیز تھی کہ مجھ میں پوچھنے کا حوصلہ ہی نہ رہا کہ وہ جن ''دل خراش، بھیانک اور ڈراوٴنے'' واقعات کا ذکر کر رہی ہے، وہ اصل میں تھے کیا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ اگاتھا اپنی جنم بھومی (یہ مشرقی جرمنی تھا یا مغربی، میں اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا) چھوڑ آئی تھی اور ہوائی کو اپنا ٹھکانہ بنا چکی تھی۔ پھر بھی اگر میں اندونوں باتوں کے مابین تعلق پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور کر سکوں تو پھر میں شاید یہ سمجھ سکوں گا کہ سیمینار میں شریک یورپی اور امریکی یہودیوں نے آج کی پارٹی کا کیوں مقاطعہ کیا تھا۔ (بمبئی کے یہودی بھارتی شاعر نے، جو ساحلِ سمندر کے اکلوتے کیکڑے کے اٹھائے جانے کے فعل کی مذمت کر رہا تھا) کسی بدھستو (8) کی بے غرضی سے سیاسی سیاق و سباق میں انسانوں کی زندگیوں اور اموات کا جائزہ لیا تھا) لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی شخص اس قسم کے مسئلے کو کھنگالنے اور اسکا محاکمہ کرنے کی کوشش کرے، کسی نہ کسی قسم کی دانائی کو، جو اس طرح کے سیمیناروں اور دعوتوں کے پرامن انداز سے انعقاد میں مددگار ثابت ہوتی ہے، محض ایک قدم آگے بڑھا کر دخیل ہو جانا چاہیے۔

جب ہم ملحقہ کمروں میں پہنچے جہاں دعوت کا انتظام کیا گیا تھا، تو ہم پر انکشاف ہوا کہ ہماری عدم موجودگی کے دوران میں ایک نیا مرکزی کردار منظر عام پر نمودار ہو چکا ہے، اور جو فرائض پہلے اگاتھا سرانجام دے رہی تھی، اب وہ اس نے سنبھال لئے ہیں۔ درحقیقت اس نئی شخصیت کا رویہ اور طور طریقے اگاتھا کے بہ حیثیت میزبان طور طریقوں سے نمایاں انداز سے مختلف تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ محفل کی غالب اور مرکزی شخصیت وہی ہے جو کسی چنگیز خان کی طرح اس پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ کوئی پچاس سال کا تقریباً بونا آدمی تھا اور وہیل چیئر پر ڈٹا بیٹھا تھا۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر وہ بالکل بچہ دکھائی دیتا تھا جو کسی ڈرامے میں جادوگرنی کا کردار ادا کرنے کے لئے ملبوسات پہنے ہوئے ہو۔ اس کے مٹیالے

زرد بال کچھ اس طرح بنائے سنوارے گئے تھے کہ وہ نیچے اس کے سرخ سائن کے کوٹ کے کالر کے ساتھ مڑ گئے تھے۔ اس کے چہرے کی نمایاں ترین چیز اس کا منہ تھا جو دہان سگ سے مشابہ تھا، جبکہ اس کی عقابی ناک اور جامنی آنکھوں کے دوپہرے پپوٹوں میں ایک نوع کا پرتفاخر حسن جھلک رہا تھا۔ جب اس کے فراخ دہانے سے زناٹے دار آواز نکلتی، تو آدمی کے ذہن پر جو پہلا نقش بیٹھتا، وہ یہ تھا کہ یہ شخص بڑا گھمنڈی ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کے باوجود وہ ان نوجوانوں کو، جو یا تو اس کے قدموں میں بیٹھے تھے یا اس کے اردگرد حصار بنائے کھڑے تھے، مسلسل اپنی بھرپور توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھا۔ اس کے منہ سے الفاظ کا جو غیر مختتم سیل رواں تھا، اس کا نشانہ بیٹنک شاعر تھا جو اس کی وہیل چیئر کے عین سامنے یوں کھڑا تھا جیسے وہ اس کا راستہ روک لینا چاہتا ہو۔ تاہم اتنا واضح تھا کہ ان دونوں کے مابین الفاظ کا جو تبادلہ ہو رہا ہے وہ یا تو کسی قسم کا کھیل ہے یا تھیٹر کا کوئی ڈراما اور یہ کہ اگر شاعر کو نہیں تو کم از کم وہیل چیئر پر بیٹھے شخص کو اپنے مخالف کی نسبت زیادہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے اپنے سامعین کو متاثر کرنا ہے۔

''ماہر تعمیرات کو مارو وچ.......... ہمارے ذہین و فطین ماہر تعمیرات! معلوم ہوتا ہے آج وہ بہت زوروں پر ہیں'' اگاتھا نے یوں مسرت سے چہکتے ہوئے کہا جیسے وہ اپنی کسی انتہائی قابل فخر چیز کی نمائش کر رہی ہو۔ ہمارے سامنے محفل پر جو شگفتگی طاری تھی، اگاتھا نے آناً فاناً اپنی آواز اس کے مطابق ڈھال لی تھی۔ ''گھوڑے پر دوشیزہ'' کی تصویر کے متعلق مجھ سے گفتگو کرتے وقت اس پر جو وارفتگی، جس کی تہہ میں گھٹی گھٹی افسردگی کی آمیزش بھی تھی، طاری ہوئی تھی، وہ اب عنقا ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے تو پیچھے چھوڑا اور خود لمبے لمبے اور تیز تیز قدم اٹھاتے اور بڑی مشتاقی سے ان لوگوں کی، جو فرش پر بیٹھے تھے، ٹانگوں اور گھٹنوں سے بچتی بچاتی ان نوجوانوں میں شامل ہوئی جو وہیل چیئر کے اردگرد کھڑے تھے۔

میں دروازے کے قریب اپنی جگہ کھڑا رہا اور ماہر تعمیرات اور بیٹنک شاعر کے مابین جو بحث جاری تھی، اسے سننے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بحث تفریحی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے اور محض اس کی خاطر یہ محفل سجائی گئی ہے۔ درحقیقت اس رات جو کچھ ہوا، اگر میں اسے بالکل متوازن انداز سے بیان کروں، تو مجھے اسے ایک ایسے یک بابی ڈرامے

(One-act play) کے طور پر پیش کرنا ہوگا جس میں واقعہ تو کوئی ظہور پذیر نہیں ہوتا، صرف مکالمے ہی مکالمے بولے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شام کا بیشتر وقت اسی بحث کی نذر ہو گیا۔ یہ ایک گھنٹہ جاری رہی اور جب ختم ہوئی تو ہماری محفل بھی اچانک بکھر گئی۔ تاہم جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، مجھے انگریزی زبان پر جو تھوڑی بہت دسترس حاصل تھی، وہ اتنی نہیں تھی کہ میں اس مکالمے کے تمام تہہ در تہہ معانی سمجھ لیتا جو ماہر تعمیرات اور شاعر کے مابین جاری تھا۔ پھر ان دونوں کا لہجہ بھی میرے لئے نامانوس تھا۔ ماہر تعمیرات کی آواز عجیب وغریب انداز سے تیکھی اور پاٹ دار تھی اور وہ بڑے مرصع الفاظ وتراکیب استعمال کر رہا تھا۔ جہاں تک شاعر کا تعلق ہے، وہ جب بولتا تھا، اپنے لب بمشکل وا ہونے دیتا تھا۔ اس کے لہجے میں مین ہٹن (9) والوں کی چٹک مٹک تھی اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص روایات کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا (اور اس کی انہی دنوں خوبیوں نے اسے بیٹنک تحریک میں مرکزی مقام دے دیا تھا)۔ ان کے ہاں منطقی اور غیر منطقی گفتگو کا جو کھیل ہو رہا تھا، اپنے خیال کے مطابق میں اس کا مفہوم صرف اسی صورت میں اخذ کر سکتا تھا کہ میں ان سے ایک قدم پیچھے رہوں اور جو کچھ وہ کہہ چکے ہیں، اس کے مختلف ٹوٹوں اور ٹکڑوں کو جوڑ کر ان میں ربط پیدا کروں۔ میری اس مصروفیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ایک گھنٹے پر محیط بحث سے جو اکتاہٹ ہونا چاہئے تھی، میں اس سے بچا رہا۔

چنانچہ جو کچھ میں یہاں تحریر کر رہا ہوں، یہ اس کی تشکیل نو کی، جو میں اس شام کرتا رہا تھا، تعبیر نو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حافظے اور امتداد زمانہ دونوں نے اسے مسخ کر دیا ہوگا۔ اس خوف سے کہ کہیں خالی خولی تلخیص سے قارئین کا پیمانہ صبر لبریز نہ ہو جائے، میں نے کہیں کہیں اس ماحول کے بارے میں، جس میں یہ بحث ہو رہی تھی، اپنے تاثرات کا اضافہ کر دیا ہے۔ میں نے یہ اس لئے بھی کیا ہے کیونکہ نہ صرف بحث کے شرکاء کی بلکہ محفل کے مہمانوں پر............ جو ماہر تعمیرات اور شاعر کے مابین گفتگو پوری توجہ سے سن رہے تھے اور کبھی کبھار بیچ میں خود بھی کچھ اس طرح بول پڑتے تھے کہ قطعاً احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ دخل در معقولات کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ویٹروں اور ویٹرسوں کی، جو ان کی ماکولات ومشروبات سے تواضع کر رہے تھے، کارکردگی بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی

''رنگین'' تھی۔ (لفظ ''رنگین'' کی سیمینار میں اتنی تکرار ہوئی تھی کہ مجھے اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا)۔

شاعر کے قدموں میں، جو ساری بحث کے دوران میں کھڑا رہا، پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال کے تین لڑکے بیٹھے تھے۔ تینوں اس لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ تھے کہ ان کے چہرے اور جسم شاعر کے ذوق پر پورے اترتے تھے اور یوں انہیں ایک دوسرے کے بھائی تصور کیا جا سکتا تھا۔ ہوائی کے کسرتی اور صحت مند نوجوانوں کے برعکس یہ لڑکے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے انہیں تفریحی ساحل سمندر پر کبھی جانے کا موقعہ نہ ملا ہو اور وہ اپنے چہرے لٹکائے اپنے اپنے خیالات میں محو بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا صبح شاعر کی اردل میں سیمینار میں بھی آیا تھا اور وہ اس ناسفتہ دوشیزہ کی طرح حیران پریشان نظر آ رہا تھا جسے ابھی ابھی دوشیزدگی سے محروم کیا گیا ہو اور جس کے متعلق ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ شاعر کے مداح چند اور نوجوان بھی موجود تھے۔ وہ سب کے سب ان تینوں لڑکوں کے گرد فرش پر بیٹھے تھے۔ ان میں ایک لڑکی جوڈو کی وردی میں ملبوس تھی (حالانکہ اس کے چہرے مہرے سے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ جسمانی مشقت کے کبھی قریب بھی پھٹکی ہو گی)۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکوں کی سی حرکتیں کر کے شاعر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتی ہے۔ تاہم وہ پہلے ہی اتنی مدہوش تھی کہ جونہی کسی ایسی بات سے، جو ایلین کے منہ سے نکلتی تھی، زور شور سے گردن ہلا کر اپنے اتفاق کا اظہار کرنا چاہتی، اس کا سر ڈھلک جاتا اور وہ اونگھنے لگتی، تاہم وہ ہمت کر کے دوبارہ آنکھیں کھول دیتی اور یوں گردن کو جنبش دینے لگتی جیسے وہ سب کچھ مسلسل پوری توجہ سے سنتی رہی ہو۔

اگا تھا اور دوسری ادھیڑ عمر اور بزرگ خواتین کچھ اس طرح لیئے دیئے انداز سے ماہر تعمیرات کی وہیل چیئر کے ارد گرد کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھی ہوئی تھیں جیسے وہ جتانا چاہتی ہوں کہ وہ اس کی عبقریت کی زبردست مداح ہیں۔ وہ مخالف فریق کی جوڈو کی وردی میں ملبوس مدہوش دوشیزہ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتیں اور یوں ظاہر کرنے لگتیں جیسے انہیں اس کی حالت پر بڑا ترس آ رہا ہو۔ تاہم ان کی ناپسندیدگی کا، جسے وہ الفاظ کا جامہ پہنانے سے گریز کر رہی تھیں، اصل ہدف شاعر تھا اور انہوں نے اپنی طرف سے ماہر تعمیرات کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جس طرح چاہے، اپنے مخالف کے بخیے ادھیڑے اور ان کے اخلاقی

جذبات اس تک پہنچائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سن رسیدہ خواتین، جن کی خاموشی ماہر تعمیرات کے لئے، جو ان کے نقطہ نظر کی ترجمانی اور حمایت کر رہا تھا، ڈھال کا کام دے رہی تھی، فرش پر بیٹھے نوجوانوں کی نسبت کہیں زیادہ پی رہی تھیں۔ اس آدھی رات کی محفل میں کاؤنٹر پر متعین یا چل پھر کر مشروبات اور ماکولات پہنچانے والے لڑکے لڑکیاں.......... بظاہر یہ سبھی طالب علم تھے اور جز وقتی ملازمت کرنے آ گئے تھے............ جن تین قسم کی شرابوں سے.......... بیئر، سوڈا واٹر ملی جن (gin) اور وسکی........... مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہے تھے، معمر خواتین ان میں سے بیئر نہیں بلکہ سب سے زیادہ نشہ آور مشروب اپنے گلاسوں میں انڈیلتی تھیں۔ اگرچہ ان خواتین نے بننے سنورنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور اپنی عمر کے کپڑے پہننے کی بجائے انہوں نے نوخیز لڑکیوں کے فراک، جن کے کالر لیس سے مزین تھے اور جن کے رنگ ان کی سکرٹوں کے رنگ کے عین مطابق تھے، زیب تن کر رکھے تھے، وہ نظر پھر بھی یونیفارم میں ملبوس بڑھیوں یا بیواؤں کی مانند ہی آ رہی تھیں۔ وہ بڑی مشاقی سے، جس کا مقصد دوسروں کو یہ معلوم نہیں ہونے دینا ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہیں، اپنے گلاس خالی کرتیں اور انہیں بلا تاخیر دوبارہ بھرنے کا اشارہ کر دیتیں۔ اگاتھا بھی اس سے مستثنٰی نہیں تھی۔ بیئر سے صرف وہی اشخاص شغل کر رہے تھے جو سیمینار میں شرکت کرنے آئے تھے۔ وہ ان لوگوں سے ذرا ہٹ کر دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے مباحثہ کرنے والے اصحاب کے گرد حلقہ بنا رکھا تھا۔

اگرچہ میں نے فرض کر لیا تھا کہ دعوت میں جو نوجوان مہمان کی خاطر تواضع پر مامور ہیں، وہ طالب علم ہیں جن کی خدمات معاوضے پر اس موقع کے لئے حاصل کر لی گئی ہیں، وہ پراسرار ٹولی ہے جس نے مشترکہ طور پر تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے ملبوسات اور چال ڈھال کے انداز میں ایک خاص قسم کی انفرادیت پیدا کر لی تھی۔ لڑکوں نے پرانے فیشن کی واسکٹیں اور ریشمی قمیصیں، جن کی آستینیں پھولی پھولی تھیں، پہن رکھی تھیں۔ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے ان کے فراک تو بالکل ویسے ہی تھے جیسے ان ادھیڑ عمر خواتین کے تھے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے لیکن ان کے ایپران (apron) جھالر دار تھے۔ ان سب لڑکوں لڑکیوں کے رنگ زرد اور جسم بے حد دبلے پتلے تھے اور وہ اپنی حرکات و سکنات اور طور

طریقوں سے کچھ اس طرح کی علامتیں ظاہر کر رہے تھے کہ دیکھنے پر میرے جیسے سطحی مبصر کو یہی محسوس ہوتا کہ انہیں معاشرتی ظاہر کر رہے تھے کہ دیکھنے پر میرے جیسے سطحی مبصر کو یہی محسوس ہوتا کہ انہیں معاشرتی اقدار چھو کر نہیں گزریں یا وہ دوسروں کے ساتھ بات چیت کرنے کے فن سے نا آشنا محض ہیں۔ مثلاً جب وہ گھمن گھیریاں کھاتے کبھی اس مہمان کے پاس جاتے یا اس مہمان کے قریب پہنچتے، وہ اسے کوئی مشروب یا ڈبل روٹی کا توس، جس پر پنیر، گوشت یا مچھلی رکھی ہوتی، پیش کرتے وقت وہ اس سے آنکھ ملانے سے گریز کرتے۔ پھر میں نے دیکھا کہ جب ان میں سے کوئی میرے قریب سے گزرتا ہے تو بانکی سجیلی چال ڈھال کے باوجود یا پھر اپنی چلت پھرتے میں بے پناہ پھرتی کے باعث اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہوتی ہے جیسے تھکاوٹ سے اس کا جسم چور چور ہو چکا ہو۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کسی عجیب وغریب حد تک بہت قدیم چیز کی بو، جس سے ان کی جسمانی صفائی کی قطعاً تکذیب نہیں ہوتی تھی، چمٹی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کیفیت نے سیمینار کے ان مندوبین کو جنہیں ماہر تعمیرات اور شاعر کے مابین مناظرہ اپنی جانب راغب نہیں کر سکا تھا، چکرا دیا ہے اور وہ اس کے متعلق آپس میں زیر لب چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

یہ تھے وہ حالات و کوائف جن میں ماہر تعمیرات اور شاعر کے مابین مناظرہ شروع ہوا۔ دراصل یہ مباحثہ کم اور مجادلہ زیادہ تھا۔ ایک طرف ماہر تعمیرات کے زبانی جارحانہ حملے تھے اور دوسری طرف شاعر کی دفاعی تدبیریں جو کسی نہ کسی عنوان ان حملوں کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو جاتا تھا لیکن یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ ڈھکے چھپے انداز سے کوئی ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ حملہ آور کے دلائل میں سے جو کچھ میرے پلے پڑا، اس کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے:

''تم چھوکروں اور نوعمر لڑکوں پر جی جان سے فدا ہو۔ یہ بذات خود اور فی نفسہ خوبصورت چیز ہے۔ اس معاملے میں ہمارا نقطہ نظر یکساں ہے۔ تاہم یہ بالکل عیاں ہے کہ یہاں بھی بالکل آغاز میں ہی، ہمارے درمیان اختلافات کی ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے۔ تمہاری گرم جوشی ان نوجوانوں کو ایک ایسی سمت میں لے جاتی ہے جس سے ان میں اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ بے راہ روی کا شکار بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس

میں انہیں جس سمت میں لے جاتا ہوں، اس سے وہ اخلاق یا عتبرا سے بہتر انسان بنتے ہیں، ان کے ذہنوں کو جلا ملتی ہے اور وہ صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ جواب میں تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نوجوانوں کو جذبے کے تاریک، پراسرار علم سے آشنا کراتے اور انہیں اس کی گہرائیاں دکھاتے ہو۔ ابھی ابھی تم نے اصرار کیا تھا کہ انسانی تجربے کے لئے جنسی اور روحانی دونوں قسم کی محبت مرکزی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے دونوں تاریک اور پراسرار ہیں۔'' (ماہر تعمیرات خوش نما ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار سے اپنی بات بہت لمبی کر دیتا، شاعر اس کا جواب زہر سے بجھے ہوئے لیکن کم سے کم الفاظ میں دل لگی کے انداز میں دیتا جو اس کے بہت سے سننے والوں کے سروں کے اوپر سے گزر جاتا۔ یوں اس کے مخالف کو ان کے الٹے معانی پہنانے کا موقع مل جاتا اور وہ اپنی شراب و کباب کے رسیا حمایتی خواتین کو باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا کہ جیت اس کی ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سطحی طور پر مناظرے میں شاعر کو جو بار بار زک اٹھانا پڑ رہی ہے، وہ دراصل اس سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور وہ اپنے حریف کی کمزوریوں کو، جن کی جڑیں بہت گہری تھیں، ٹٹولنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ جہاں وہ اپنے مخالف کی دلیل کے بودے پن یا نقص کو بڑی آسانی سے طشت از بام کرسکتا تھا، وہاں وہ محض اپنے کندھے اچکاتے پر اکتفا کر جاتا اور سانتا کلاز (10) کی طرح مسکرانے لگتا)۔ ''لیکن جنسی محبت اور روحانی محبت کسی چکر دار زینے کی مانند ہونا چاہیے جو مسلسل اپنے درخشاں، مقدس جوہر کی طرف بلند ہو رہی ہو۔ یہ بات خاص طور پر اس جسمانی اور روحانی محبت پر صادق آتی ہے جو اپنے متعلق سمجھتی ہے کہ وہ نوجوانوں کی (صحیح) تربیت کر رہی ہے۔''

ماہر تعمیرات کی باتیں اب لیکچر کی صورت اختیار کرنے لگیں............ وہ ایک ایسے شخص کا انداز اپنا چکا تھا جو ڈائس پر کھڑا تقریر کر رہا ہو............ اور وہ ذہنی عوارض میں مبتلا لوگوں کے اس شفاخانے کی خاص خاص خوبیاں گنوانے لگا جن کے امکانات کا اس نے عمارت کے ڈیزائنر کی حیثیت سے تصویر باندھا تھا۔ پھر وہ بتانے لگا کہ اس عمارت کا انتظام و انصرام کس طرح اس منصوبے کے گرد گھومتا ہے جس کا خواب اس کی بصیرت نے دیکھا تھا۔ ''جو لوگ امریکہ سے بھاگ کر اس قدیم الوضع عمارت میں پناہ ڈھونڈنے آتے ہیں، وہ حساس، نازک اور بیمار جذبوں کے مالک ہوتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے انہیں ایسی پناہ

گاہ مہیا کرنا چاہئے جو ان کے مردانہ یا زنانہ جسم (کی ضرورتوں) کے عین مطابق ہو۔ اگر ہر مریض کو یہاں ایک پہاڑی، ایک وادی مہیا کی جا سکے تو کتنی اچھی بات ہو گی۔ بالکل مرضی کے حسین زمانوں کے ان قلعوں اور جاگیروں کی مانند، جنہیں اپنے اپنے مقدر کے اسیر یورپ کے پاگل بادشاہ خانقاہوں میں تبدیل کر دیتے تھے! آج امریکہ میں ننگی، زخمی روح کو نجی رہائشہ گاہ کی ضمانت بھی حاصل نہیں۔ چنانچہ نے اپنی صلاحیتیں اس بات کو یقینی بنانے کے لئے صرف کی ہیں کہ کم از کم اس عمارت میں ہر اس مرد یا عورت، جو یہاں پناہ ڈھونڈنے آتا ہے یا آتی ہے، اپنی، جگہ، (پوزیشن) (11) ضرور لم جائے۔ جہاں تک میری اپوزیشن کا تعلق ہے، میں نے اس کے لئے عمارت کے سب سے نچلے حصے کا انتخاب کیا ہے۔ میری ورکشاپ تہہ خانے (بیس منٹ) کے گیراج میں ہے۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ جو کچھ میں کہوں یا کروں، آپ اسی کے مطابق عمل کریں۔ آپ بیٹھے یا کھڑے تو یہاں ہیں لیکن سمجھیں یہ کہ آپ میرے ساتھ اس منزل کے بالکل نیچے میری ورکشاپ میں جا رہے ہیں۔ اب آپ وہاں پہنچ گئے ہیں اور اب وہاں میری پوزیشن سے ان لوگوں کی ''پوزیشنوں'' کا تصور باندھنے کی کوشش کریں جو اس عمارت کے ہر کمرے کی ہر ''پارٹیشن میں رہائش پذیر ہیں۔ میں نے جو ڈھانچا کھڑا کیا ہے، اس میں ہر پوزیشن کو کچھ اس طرح سمویا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو مسلسل اوپر کی جانب حرکت کا احساس ہوا۔ یہ بات فوراً آپ کے ذہنوں میں آ جانا چاہئے۔ اس مقصد کے پیش نظر میں نے عمارت کے اندرونی حصوں کی ترمیم و اصلاح کا کچھ اس طرح منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا کہ ''پوزیشنوں'' کے اجتماع کے ہر فرد کو، بالخصوص اسے جو ابھی شباب کے مراحل طے کر رہا ہو، یہ آگہی حاصل ہو جائے کہ اس کا وجود ایک ایسے زینے پر ہے جہاں سے ذات (self) مرغولہ نما راستہ چڑھتی آسمان کی جانب جا رہی ہے۔ اس عمارت میں مقیم ان لوگوں کو، جو جوانی کی سرحدیں پار کر چکے ہیں، ایسی پوزیشنیں، تفویض کی گئی ہیں جہاں وہ نوجوانوں کی مسلسل اوپر کی جانب حرکت کے لئے بنیاد بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں زیادہ تعداد ان خواتین کی ہے جو اپنی زندگیوں کے آخری ادوار میں داخل ہو چکی ہیں۔ وہ پسندیدہ نظروں سے بچوں............ ہمارے نوجوانوں............ کو مقدس بلندیوں کی جانب جاتے دیکھتی رہتی ہیں۔'' (اس مقام پر شاعر نے متعدد اعتراضات اٹھائے، حالانکہ اسے یہ تصور ولولہ انگیز

معلوم ہوا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا وہ لوگ جنہیں نچلا مقام دیا گیا تھا، اپنی جگہ خوش ہوں گے۔ مزید برآں، جیسا کہ اس ہرم نما ساخت کو دیکھ کر آدمی کو اندازہ ہو سکتا ہے، جن اشخاص کو بلند ترین پوزیشنیں، حاصل ہو سکتی ہیں ان کی تعداد انتہائی قلیل ہو گی۔ تو کیا اس سے مجموعی اعتبار سے معاشرے میں اس کے خلاف مخاصمت نہیں پیدا ہو گی؟ کیونکہ وہ تو یہی سمجھے گا کہ جو نوجوان اس پروگرام میں شریک ہوں گے، وہ اس سے مستفید تو کم ہوں گے لیکن استحصال کا شکار زیادہ بنیں گے۔ یہ چیز خود اس ادارے کے مختصر طبقے میں بھی، جو خارجی دنیا سے بالکل کٹا ہوا ہے، پیش آ سکتی ہے۔اس اعتراض کے جواب میں ماہر تعمیرات زور لگا کر کچھ یوں تن کر بیٹھ گیا جیسے وہ کوئی دیوتا ہو)۔''تم لڑکوں اور نوجوانوں پر جی جان سے فدا ہو۔ پھر بھی تم معاشرے سے یہ مطالبہ کرنے سے ڈرتے ہو کہ وہ تمہیں اس راستے پر چلنے کی اجازت دے دے جو انہیں بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری محبت انہیں گراوٹ اور رذالت کی طرف لے جاتی ہے۔ تاریک اور پست مقامات میں چھپنا تمہاری عادت ہے جہاں تم ایک دوسرے کو ناپاک اور گندا کرتے رہتے ہو............ یہی اور صرف یہی چیز ہے جو تمہارے اندر ان جوانوں کے لئے شدید جنون پیدا کرتی ہے! جو لوگ مردوں میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں یا ان سے تلذذ حاصل کرتے ہیں، ان کا جنون تمہارے جنون سے مختلف نہیں! لیکن ہم دونوں کے مابین بنیادی فرق ہے۔ میں نے اس عمارت میں جس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کا دائرہ اثر یہاں کے ''مختصر طبقے'' تک جو تمہارے خیال میں خارجی دنیا سے بالکل کٹا ہوا ہے، محدود نہ رہے، بلکہ پورا امریکا، پورا کرہ ارض، اس کی لپیٹ میں آ جائے۔ میں عمارت سازی کی ایسی تحریک شروع کر رہا ہوں جو ہر جگہ کے نوجوانوں کو بلندیوں کی طرف جانے والے زینے پر ''پوزیشنیں'' عطا کر دے گی۔ہمیں اس کا آغاز مدرسوں، کتب خانوں اور بچوں کے تھیٹروں سے کرنا ہو گا۔ میں نے خود اپنے جسم کو، جو کبھی ایک عام بالغ انسان کا جسم تھا، پچکا کر، دبا کر، گھٹا کر ایک بچے کے جسم میں، جو تمہیں اس وہیل چیئر میں نظر آ رہا ہے، تبدیل کر دیا ہے۔ یہ اس کے لیے کیا ہے کیونکہ میں بچے کے قد و قامت سے، بچے کی ''پوزیشن'' سے بچے کے جسم و روح کی آنکھوں سے دنا کو دیکھنا، پرکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ میرا نصب العین بچے کے جسم اور روح کے پیمانے پر ساری دنیا کا ماڈل تیار کرنا ہے۔ میں دنیا میں

جسمانی اور روحانی طور پر بچے کی حیثیت سے زندگی جینے کی کوشش کر رہا ہوں اور دن رات اس فکر میں غلطاں رہتا ہوں کہ بچوں کے لیے کس قسم کی جگہ (Space) اور ساخت انتہائی موزوں رہے گی۔ میرا پچکا اور سڑکا ہوا جسم بذات خود مستقبل کے ماہرینِ تعمیرات کے لیے ماڈل بن جائے گا!''

جب ماہرِ تعمیرات اپنا اعلامیہ سنا چکا، میں نے اس کے جسم کا ذرا زیادہ غور سے جائزہ لیا۔ واقعی یہ ممکن نظر آنے لگا کہ اس ن مسلسل وہیل چیئر میں بیٹھ کر اور اپنے سینے اور کولہوں کے مابین اکورڈیئن باجے کی سی دو تین چنٹیں پیدا کر کے اپنے آپ کو بونے میں تبدیل کر لیا ہوگا۔ وہیل چیئر محض ایک وسیلہ تھی جس کی اسے اپنی خارجی ہئیت کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کے لیے ضرورت تھی۔ اب وہ سرخ آستینوں میں ملبوس اپنے بازوؤں کو بڑے طمطراق سے اپنے سر کے اوپر اٹھائے گلابی رنگت کا بادشاہ بن گیا تھا جس کا منہ کسی منحنی، قابلِ تحسین کتے کے منہ جیسا تھا اور اس کے عقب میں جو ادھیڑ عمر کنواری عورتیں بیٹھی تھیں (جنھیں شراب نوشی نے اور بھی پرجاہ بنا دیا تھا)، بڑے محتاط انداز سے تالیاں پیٹنے اور نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگیں۔ بلکہ بیٹنک شاعر بھی، جس کا چہرہ کسی داڑھی پوش بدھ کے بت کے چہرے کی مانند تھا اور جو مناظر میں اسکا حریف تھا، اتنا مرعوب ہوا'' ہوا کہ وہ چلا اٹھا: ''یہ آدمی اتنا عجیب ہے کہ اس کا مثیل ڈھونڈنا مشکل ہوگا! اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا!'' موٹے شیشوں کے پیچھے اپنی ہر آن ٹمٹماتی آنکھوں سے اس نے اپنے چیلوں کو کچھ اس انداز سے اکسایا کہ وہ بھی اس کی پیروی پر مائل ہو گئے اور طنزیہ انداز سے ''واہ واہ'' کرنے لگے۔

غالباً اس مقام پر یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ دعوت کے مہمان عمارت کے اندرونی حصوں کا دورہ کریں تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ماہرِ تعمیرات کے خوب سوچے سمجھے منصوبے کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ وہیل چیئر کی معیت میں، جو ہمارے رہنما کی حیثیت سے ہمارے آگے آگے اٹھا کر لے جائی جا رہی تھی، ہم عمارت کا وہ حصہ دیکھنے لگے جو ماہرِ تعمیرات کے بابصیرت منصوبے کا دل تھا۔ یہ حصہ ان کمروں پر مشتمل تھا جنھیں کچھ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ ان پر نظر پڑتے ہی اوپر کی جانب حرکت کا احساس ہوتا تھا۔ اس حصے کے ماسوا، جہاں دعوت منعقد ہو رہی تھی، پہلی منزل صرف کانفرنس روموں اور

لائبریری پر مشتمل تھی۔ ہم بصورتِ ہجوم زینے کی طرف لپکے اور دوسری منزل کی جانب اوپر چڑھنے لگے۔ وہ نوجوان، جنھوں نے ابھی چند ہی منٹ پہلے ماہر تعمیرات کے خلاف اپنی مخاصمت کا اظہار کیا تھا، تین اطراف سے اس کی وہیل چیئر اٹھائے ہوئے تھے۔ جب ہم اس وسیع و عریض عمارت میں مختلف موڑ مڑتے، سیڑھیوں کے چھوٹے چھوٹے سلسلے چڑھتے، ایک کے بعد دوسرے کمرے میں جھانکتے اور ہر موڑ پر نئی دریافت کرتے جا رہے تھے تو ہم سب پر غایت انبساط کی کیفیت، جس نے ہم سب کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، طاری ہو چکی تھی۔ خالی کمرے؟ اگر میں زیادہ صحت سے بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ ہر کمرا کچھ یوں نظر آ رہا تھا جیسے اسے مختلف ڈبوں کو آپس میں جوڑ کر بنایا گیا ہو۔ یہ تمام ڈبے ایک ہی سطح پر نہیں رکھے ہوئے تھے بلکہ ہر اگلے ڈبے کی بنیاد پچھلے ڈبے کی نسبت ذرا زیادہ بلند سطح سے اٹھائی گئی تھی۔ یہ ڈبے دراصل مختلف پارٹیشنز (Partitions) تھیں جن میں ہر کمرا منقسم کر دیا گیا تھا۔ ہر پارٹیشن متوازی الاضلاع شش پہلو شکل کی تھی۔ ہر کمرے کی چار چار یا پانچ پانچ پارٹیشنوں کی ترتیب کچھ اس نوعیت کی تھی کہ دیکھنے پر یہ تاثر ابھرتا تھا جیسے پورا یونٹ نیچے سے اوپر کی جانب متحرک ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آدمی ایک بڑے کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا، اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے وہ سابقہ کمرے کے بلند ترین ڈبے کی سطح سے اوپر اٹھ رہا ہو (جبکہ حقیقتاً ایسا ہونا ممکن نہیں تھا)۔ مزید برآں چڑھائی کے اس التباس کو، جسے رنگوں کے استعمال سے تخلیق کیا گیا تھا، سیڑھیوں کی ٹھوس حقیقت سے تقویت پہنچا دی گئی تھی۔ چنانچہ ان پر چڑھتے چڑھتے مجھے احساس ہونے لگا جیسے میں کسی بلند و بالا مینار میں معلق ہو گیا ہوں۔ جوں جوں ہم مزید اوپر چڑھتے گئے میں سوچنے لگا کہیں ہم چوہوں کے دل میں تو نہیں تبدیل ہو گئے جو کسی قسم کے اجتماعی جنون میں گرفتار ہو کر اس مینار کی سیڑھیوں پر بھاگے جا رہے ہیں۔ درحقیقت ہمارے گروہ میں چند ایسے لوگ بھی شامل تھے، جنھیں وہ جذبہ، جو ہم سب کو متحد کیے ہوئے تھا، ناگوار محسوس ہوا اور وہ جلوس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

ہم میں سے وہ اشخاص جو استقلال سے قطار بنائے چلتے رہے تھے، جب عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے (اس منزل کا ڈیزائن کچھ اس قسم کا ساتھ کہ آدمی خواہ مخواہ اس اتباس میں گرفتار ہونے لگتا تھا کہ عمارت ابھی ختم نہیں

ہوئی بلکہ اس منزل کے اوپر ایک مزید کمرا ہے) مجھے کمروں کی، جو وسعت کے اعتبار سے مسلسل چھوٹے ہوتے جا رہے تھے، تاریک کھڑکیوں کے باہر "کائیاں برکھا پیڑ" کے گھنے پتوں کا احساس ہونے لگا جس کے وجود کا میں اس سے بہت پہلے شام کو محض اقرار کر سکا تھا۔ یا شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ خود کمرے کچھ یوں نظر آ رہے تھے جیسے وہ کمرے نہ ہوں۔ پرندوں کے گھونسلے ہوں جنہیں گھنے پتوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔ ہم مختلف کمروں کی پارٹیشنوں کے ارد گرد طواف کرتے رہے تھے لیکن ہمیں کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ وہ سب کی سب خالی تھیں لیکن جب ہم بلند ترین منزل کے کونے کے کمرے میں داخل ہوئے، تو ہمیں احساس ہوا کہ اس کی چار پارٹیشنوں میں سے ایک میں کوئی شخص یاد آیا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ہمارے گروہ میں چند لوگ تو وہ تھے جنہیں وہ فضا پسند نہیں آئی تھی جس میں جلوس اوپر جا رہا تھا۔ پھر بعض لوگ وہ تھے جو فطری طور پر چوبی راہداریوں اور سیڑھیوں سے خائف ہو گئے تھے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق وہ اتنی نازک تھیں کہ ان کے ہر دم ٹوٹنے کا احتمام تھا۔ چند ایک غیر معمولی لیکن تکراری فارمولے سے اکتا گئے تھے جس کے مطابق کمروں کی تزئین نو کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ تمام لوگ کسی نہ کسی مقام پر واپس چلے گئے۔ اب جو اشخاص باقی رہ گئے تھے، ان میں ایک تو میں تھا، دوسری اگا تھا، تیسرا بمبئی کا یہودی بھارتی شاعر، چوتھا بیٹنک شاعر اور پانچواں خود ماہر تعمیرات اور یا پھر وہ دو تین نوجوان جنہوں نے اس کی وہیل چیئر اٹھائی ہوئی تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ شاید یہی صورت بہتر تھی۔ کونے کا یہ کمرہ سب کمروں سے کم قابل رسائی تھا۔ اس کی ایک پارٹیشن میں جو عمارت کی دیوار سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی، ہمیں ایک تقریباً چالیس سالہ عورت نظر آئی۔ وہ آہنی باتھ ٹب میں، جو قریب قریب سارے فرش کو گھیرے ہوئے تھا، سمٹی سکڑی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، صرف انہی سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکا کہ وہ شاید ان خود کفیل ادھیڑ عمر کنواری عورتوں کی قرابت دار ہے جو اس سے قبل شام کو ماہر تعمیرات کے گرد گھیرا بنائے بیٹھی تھیں اور شراب کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خطابت سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ لیکن اس عورت کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ وہ بالکل برہنہ تھی، سمٹی سمٹائی بات ٹب میں بیٹھی تھی۔ اس کا ایک گھٹنا اوپر

کی جانب اٹھا ہوا تھااور اس نے گردن سے لے کر پاؤں تک اپنے سارے جسم کو لاپروائی سے کسی گاڑھے سیاہی مائل سرخ سیال سے لتھیڑ رکھا تھا۔ اس نے ایک مزید حرکت یہ کی کہ اس نے اپنی آنکھوں کے انتہائی چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو ہماری جانب گھمایا اور اسی سیاہی مائل سرخ مادے سے، جو آسانی سے اس کے جسم سے چپک گیا تھا، اپنی تنگ پیشانی کے آر پار لکیر کھینچ دی۔

بیٹنک شاعر بالکل چپ تھا، بلکہ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے منظر کو دیکھ کر متاثر بھی ہوا ہے۔ جہاں تک یہودی بھارتی شاعر کا تعلق ہے، وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں کسی رکھ رکھاؤ کا تو پہلے ہی قائل نہیں تھا، چنانچہ اس نے یہاں بھی جھٹ صاف صاف کہہ دیا کہ عفونت ناقابل برداشت ہے۔ ماہر تعمیرات پر جو انتہائی انبساط کی کیفیت طاری تھی، اس جملے نے اسے پاش پاش کر دیا اور اس نے کڑوے کسیلے انداز سے وضاحت کی کہ یہ عورت جس کمرے میں موجود ہے، وہ اس کی اصل ''پوزیشن'' نہیں۔ اسے محض آج رات کی دعوت کے پیش نظر عارضی طور پر یہاں منتقل کیا گیا ہے اور ماحول کی اس تبدیلی نے اسے پراگندہ خیال بنا دیا ہے۔ اسے معلوم ہ نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ یہودی بھارتی شاعر کی شکایت نے جس مخاصمت کو جنم دیا تھا، اگا تھا نے اس کا اظہار اور بھی منہ پھٹ طریقے سے کیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اس عورت کے لیے یہ بہت ضروری تھا کہ وہ اپنا باسی خون کسی مصرف میں لاتی۔ اس نے جو کچھ کیا ہے، اس پر وضاحت کوئی بھی شخص اسے ملامت نہیں کر سکتا اور اس میں پورے طور پر اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے تازہ، جاندار خون سے بھی اسی قسم کا کام کر سکے، لیکن ایسا وہ اپنی زندگی کے محض خاص خاص موقع پر ہی کرتی ہے۔

پھر جیسے انہیں گا تھا کے الفاظ سے شہہ مل گئی ہو، بیک وقت متعدد واقعات ظہور پذیر ہو گئے۔ پہلے تو بھارتی شاعر کو اور چند سیکنڈ بعد خود مجھے بھی ان کا یکساں انداز سے اندازہ ہوا۔ تفہیم کے اس لمحے میں جب ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ بیٹنک شاعر کو اس سارے عرصے کے دوران میں سب کچھ معلوم تھا...... عین اس لمحے جب ہم پر منکشف ہوا کہ اس آدھی رات کی دعوت کا اہتمام کسی اور نے نہیں بلکہ سراسر اس پاگل خانے کے مریضوں نے (ماسوائے اس عورت کے جو اپنے جنسی اعضا کے خون میں

لتھڑی باتھ ٹب میں بیٹھی تھی) کیا تھا اور یہ کہ یہ مریض دراصل وہی بیرے اور خادمائیں تھے جو دعوت میں کاک ٹیل اور پنیر، مچھلی یا گوشت سے آراستہ توس مہیا کر رہے تھے............ ایک ایرانی صحافی، جو سیمینار میں شرکت کر رہا تھا، سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ سیمینار کے تمام مندوبین نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ابھی اور اسی وقت عمارت سے نکل جائیں گے۔

جو اگلی بات مجھے واضح طور پر یاد ہے، یہ ہے کہ ایرانی صحافی کی آمد پر ماہر تعمیرات، جو وہیل چیئر پر بیٹھا شکل وصورت سے بالکل لڑکا دکھائی دے رہا تھا، ایک ہی جھٹکے میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا جس سے اس کا جسم قد و قامت کے اعتبار سے پہلے کی نسبت دگنا بڑا نظر آنے لگا تھا۔ اس نے زقند بھری اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں نے پیچھے سے دیکھا کہ اس کا جسم، جسے اگاتھا نے اپنے کندھے سے سہارا دے رکھا تھا، حیران کن حد تک لحیم شحیم ہے۔ بیٹنک شاعر نے جس نے اس بات کا بڑا خیال رکھا تھا کہ وہ کسی طرح بھی خون میں لتھڑی عورت کے سکون میں مخل نہ ہو، جب تک ہم ایک منزل نیچے نہ پہنچے، منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا اور یہاں وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ تب ایرانی نے ہمیں اپنی کہانی سنائی: معلوم ہوتا تھا کہ جب باقی سب لوگ اوپر کی منزلوں کا طواف کرنے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، اسے اور عوامی جمہوریہ کوریا کے ایک انگریزی کے استاد کو احساس ہو گیا تا کہ عمارت کی فضا کچھ عجیب قسم کی ہے۔ چنانچہ باقی لوگوں کے ساتھ اوپر چڑھنے کی بجائے وہ نیچے تہہ خانے میں چلے گئے جہاں ماہر تعمیرات کی ورکشاپ تھی۔ وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس پر حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ورکشاپ کا منظر کسی مار کٹائی سے بھرپور امریکی فلم سے مشابہ تھا۔ فرش پر وردیوں میں ملبوس دو بے حد ہٹے کٹے اور جسیم آدمی پڑے تھے۔ ان کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ ملحقہ کمرے میں، جو دراصل باتھ روم تھا، تین نرسیں پڑی تھیں۔ ان کے بھی ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے چوکیداروں اور نرسوں کو آزاد کر دیا اور ان کے ساتھ یہ سمجھوتا کیا کہ سیمینار کے مندوبین اس شرط پر منی بس میں اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے جائیں کہ اس شام کے واقعات میں انہیں کسی طرح بھی ملوث نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ درخواست بھی کی کہ جن مریضوں نے بغاوت کی ہے، ان کے خلاف جو کارروائی بھی کی جائے، اس سے سیمینار کے

شرکاء کو محفوظ رکھا جائے۔ تاہم چونکہ ادارے کو اپنے اخراجات پورا کرنے کے لیے ان بھاری فیسوں کا مرہون منت ہونا پڑتا تھا جو مریضوں کے لواحقین ادا کرتے تھے، اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ انہیں کوئی سخت سزا دی جا سکے گی۔ آخر میں ایرانی نے ہمیں متنبہ کیا کہ وہ اور کوریا کا مندوب جس سکینڈل میں پھنس چکے ہیں، اگر اس کے متعلق ایک لفظ بھی اخبارات میں شائع ہو گیا تو وہ وطن پہنچنے پر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے (یہ واقعہ خمینی کے انقلاب سے کئی سال قبل پیش آیا تھا)۔

اس موقع پر ہم نے کسی قسم کا مزید تردد کئے بغیر عمارت کے سامنے کے باغیچے کا رخ کیا جہاں منی بس کا انجن پہلے ہی بھنبھنانے لگا تھا۔ نشے سے مخمور معمر عورتوں کو، جو اپنی اپنی ''پوزیشن'' کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ اتر رہی اور راہداریوں میں جا رہی تھیں، یا ان نوجوان لڑکے لڑکیوں کو، جو ابھی تک آنکھیں جھکائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے، خدا حافظ تو کیا کہنا تھا، ہم دائیں بائیں کہنیاں چلاتے اور ان کے بیچ راستہ بناتے باہر نکل آئے اور بس میں سوار ہو گئے۔ مجھے رات کے چوکیداروں کا کہیں کوئی نشان تک نظر نہ آیا حالانکہ ہمارا خیال تھا کہ ہماری روانگی کا بندوبست وہی کریں گے۔ رہی نرسیں، ان میں سے دو خمیدہ شکلوں کے ہجوم کے اوپر منڈلا رہی تھیں، ہمیں ان کے صرف سر اور کندھے ہی دکھائی دیئے لیکن اس عمارت میں اپنے آخری لمحات کے دوران میں مجھے ''کائیاں برکھا پیڑ'' کی سمت سے، جو مجھے اندھیرے میں صاف دکھائی نہیں دیا تھا، دو تین بار کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی چیخیں اتنی لمبی تھیں جیسے غم واندوہ سے اس کا کلیجا پھٹا جا رہا ہو۔

ہماری بس کے آگے اور پیچھے نوجوان لڑکے لڑکیاں، جو عمارت سے بچ نکلے تھے، اپنی موٹر سائیکلوں پر جا رہے تھے۔ دشوار گزار، بل کھاتی اور تقریباً عمودی پہاڑی سڑک پر ہماری بس یوں بھاگی جا رہی تھی جیسے اس کی جان شکنجے میں پھنس چکی ہو اور وہ اس سے ہر قیمت پر آزاد ہونے کے درپے ہو لیکن اس کے اندر اندھیرے میں روتی اور چیختی آواز کی گونج ہمارے چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ سب لوگ گم صم بیٹھے تھے اور تو اور بیٹنک شاعر کے (جو اب تک زور زور سے کھلکھلا کر ہنستا رہا تھا) چہرے پر بھی پرفکر وافسردگی پھیل گئی جو ایرانی اور کوریائی نمائندوں کی پرملال چتونوں سے کوئی خاص مختلف نہیں تھی جنہیں یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وطن پہنچنے پر انہیں کس بھٹی میں سے گزرنا پڑے گا۔ تاہم ان سب

چیزوں کے باوجود اب مجھے یہ بات بہت عجیب نظر آتی ہے کہ میں نے ایک بار بھی مڑ کر بس کی کھڑکیوں میں سے بھاری بھرکم برکھا پیڑ کی طرف نہیں دیکھا تھا حالانکہ اگر میں نے آسمان کے اس حصے کی جانب، جہاں اب سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا، جھانکا ہوتا تو اس امر سے قطع نظر کہ رات خواہ کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہوتی، مجھے وہ اپنی تمام تر سیاہی کے باوجود نظر آ جاتا۔ عجیب اس لیے کیونکہ میں اکثر اپنے ذہن میں اس اگاتھا کا تصور باندھتا رہتا ہوں جس نے تختوں کی طرح چوڑی جڑوں کے بیچ، جو زمین سے چنٹوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں، اس مقام پر کرسی رکھ کر اپنی ''پوزیشن'' کا انتخاب کیا تھا جہاں درخت اور زمین آپس میں مل گئے تھے............ وہی اگاتھا جو نگاہیں گاڑ کر برآمدے کے پار کتب خانے میں ''گھوڑے پر دوشیزہ'' کی تصویر دیکھ رہی تھی، اور پھر نگاہیں اٹھا کر اس عمارت کی جانب دیکھنے لگی تھی جس کا ڈیزائن کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ درخت کی جڑواں بہن کی حیثیت سے بال کھاتی یوں آسمان کی جانب جا رہی تھی جیسے وہ اوپر اوپر اور اوپر اٹھتی جائے گی اور کبھی ختم نہیں ہو گی............ وہی اگاتھا جسے میں اب بھی دماغ کی آنکھ سے دیکھتا ہوں، حالانکہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو پائے گا کہ وہ درخت کس قسم کا تھا جسے وہ اپنا ''کائیاں برکھا پیڑ'' کہتی تھی۔

حواشی:

(1) نیو انگلینڈ: سترہویں صدی میں برطانیہ سے جو لوگ ترک وطن کر کے موجودہ ریاست ہائے متحدہ کے انتہائی شمال مشرقی حصے میں آباد ہوئے تھے، انہوں نے اس کا نام نیو انگلینڈ رکھا تھا۔ آج کل یہ علاقہ مین (Maine)، نیو ہیمپ شائر، ورمونٹ، میسا چوسٹس، روڈ آئی لینڈ اور کونیکٹی کٹ (Connecticut) کی ریاستوں پر مشتمل ہے۔

(2) خاندانی نام: برطانیہ اور امریکہ میں جو لوگ سرکاری اور کاروباری اداروں میں کام کرتے ہیں، ان کے ناموں کی پٹیاں ان کی قمیصوں یا کوٹوں پر چسپاں ہوتی ہیں۔ یوں انہیں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انگریز قدامت پسند ہیں اور اجنبی لوگوں کے

ساتھ بے تکلفی روا نہیں رکھتے۔ اس لیے ان کی پٹیوں پر ان کے محض خاندانی نام تحریر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکی ذرا کھلے ڈلے لوگ ہیں اور آسانی سے دوسروں کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ وہ جب دوسروں کے ساتھ اپنا تعارف کراتے ہیں تو یہی کہتے ہیں ''میں ولیم ہوں''، ''میں جوزف ہوں''، ''میں الزبتھ ہوں'' وغیرہ، وغیرہ۔ چنانچہ ان کی پٹیوں پر بھی ان کے محض ذاتی نام درج ہوتے ہیں۔ اگاتھا امریکی عورت تھی، یوں اس کی پٹی پر اس کا ذاتی نام لکھا ہوگا اور اسی لیے مصنف کو اس کا خاندانی نام معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔

(3) کناڑا: کنڑا بھارت کی جنوبی ریاست کرناٹک (سابق میسور) کا حصہ ہے اور یہاں کی زبان کنڑی ہے۔ انگریزی میں علاقے اور زبان دونوں کو Kannada لکھا اور بولا جاتا ہے۔ یوں مصنف نے اسے کینیڈا (Canada) سے خلط ملط کر دیا ہے۔

(4) کمارسوامی: انند کینٹش (Kentish) کمارسوامی (1877 تا 1947): کمارسوامی پیدا تو سری لنکا میں ہوا تھا لیکن اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس کی انگریز ماں نے لندن میں کی تھی۔ وہ 1917ء میں بوسٹن کے انڈین اور اسلامک آرٹ کے میوزیم کا پہلا منتظم مقرر ہو گیا۔ وہ آرٹ کا پہلا نقاد تھا جس نے راجپوت مصوری کی اہمیت کو پہچانا۔ اس کی پہلی کتاب ''Mediaenal Sinhalese Art'' 1908 میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اپنی پوری زندگی وہ انہی کی تشریح و توضیح کرتا رہا۔ وہ ہندوستانی آرٹ کی روحانی نوعیت پر زور دیتا تھا اور کہتا تھا کہ آرٹ یوگا کی مشقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ مشرقی اور مغربی خیالات و افکار کے مابین جو بعد پایا جاتا ہے، اس کے متعلق اس نے اپنی رائے کا اظہار پنی کتاب ''Am I my Brothers Keeper'' (1947ء) میں کیا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ آرٹ فلسفیانہ اور دھارمک تصورات کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کی دوسری کتابیں یہ ہیں:

1-Dance of Siva (1918).

2-History of Indian and Indonesion (1927).

3-Elements of Buddhist Iconography (1935).

4-Transformation of Nature in Art (1956).

(5) بٹنک (Beatink) 1950ء کی دہائی میں امریکا، بالخصوص سان فرانسکو اور اس کے گردونواح میں بعض ایسے نوجوان ادیبوں اور آرٹسٹوں کو مقبولیت حاصل ہوئی جنہیں بیٹنک ی بیٹ جنریشن کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ بنیادی طور پر انارکسٹ اور روایتی معاشرتی اور فنی اقدار کے سخت مخالف تھے۔ ان میں سے بیشتر زین بدھ مت کے بھی قائل تھے۔ ادب میں انہوں نے سیدھی سادھی امریکی بول چال اور جاز کی مقبولِ عام دھنوں کی تقلید کی۔ جیک کیروک اور چاندلر بروسرڈ جیسے ناول نگار اور کینتھ ریکس ورتھ، ایلن گنز برگ اور گریگوری کو رسو جیسے متعدد شاعر اس تحریک سے وابستہ تھے۔ 1960ء کی دہائی میں اس تحریک کے بیشتر خیالات وتصورات دوسری تحریکوں نے اچک لیے اور یوں یہ ختم ہو گئی۔ جو لوگ عملی زندگی میں اس تحریک کے اصولوں پر چلتے تھے، انہیں ھپی (Hippies) کہا جاتا تھا۔ اس تحریک پر بہترین کتاب بردس کک کی ''The Beat Generatin'' (1971) ہے۔

(6) کراناخ (Lucas Cranach or Kranach) لوکس کراناخ (1472 تا 1553) جرمن مصور اور کندہ کار (Engraver) تھا۔ وہ تحریکِ اصلاحِ مذہب کے بانی مارٹن لوتھر کا دوست تھا اور اس نے لوتھر کے نظریات کو اپنی بیشمار تصویروں کا موضوع بنایا تھا۔ اسے پورٹریٹ بنانے میں بہت مہارت حاصل تھی۔ اس کی تصویں
''Adam and Eve''، ''Judgment of Paris''، ''Repose in Egypt'' اور ''Crucifixon'' جس میں اس کی اپنی اور لوتھر کی تصویریں شامل ہیں، خاص طور پر بہت مشہور ہیں اس کے بیٹے کا نام بھی لوکس کراناخ (1515 تا 1586) تھا۔ دونوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے باپ کے نام کے ساتھ Elder اور بیٹے کے نام کے ساتھ Younger کا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے۔ بیٹا باپ کا شاگرد تھا اور دونوں کے کام میں اتنی مماثلت ہے کہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(7) بالائی فرنگستان: فرنگستان دراصل کوئی ملک نہیں۔ تیسری صدی عیسوی کے دوران میں جو جرمن قبائل دریائے رائن کے آر پار آباد ہوئے تھے، وہ Franks (یا ہماری زبان میں افرنگی) کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان قبائل کا دائرہ اثر پھیلنے لگا اور انہوں نے یورپ کے ان علاقوں کو، جن میں موجودہ فرانس کا بیشتر علاقہ، ہالینڈ، بیلجیم، موجودہ جرمنی کا خاصا بڑا

علاقہ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، شمالی اور وسطی اٹلی شامل ہیڈں، بزور شمشیر فتح کر لیا اور یوں بہت بڑی سلطنت قائم کر لی۔ بالائی فرنگستان موجودہ جرمنی کو کہا جا سکتا ہے۔

(8) بدھستو (Bodhis-athva) لفظی معنی ''عقل کا ست'' (بدھی+ ست) ہیں۔ بدھ مت کے ابتدائی دور میں یہ لفظ اس مہاتما بدھ کے لیے استعمال ہوتا تھا جسے ابھی نروان حاصل نہیں ہوا تھا۔ عمومی معنوں میں یہ لفظ اس شخص کے لیےہوتا ہے، نروان جس کا مقدر بن چکا ہو یا جو نروان حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا ہو۔ تاہم سچا بدھستو خود اپنے لیے نروان کا متمنی نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ پہلے باقی لوگوں کو نروان مل جائے، پھر اس کی اپنی باری آئے۔ عام آدمی اور بھکشو دونوں ہی گیان، دان (خیرات)، اخلاق، رواداری، محنت کوشی اور عقل کی چھ حدود میں رہ کر بدھستو بن سکتے ہیں۔ بدھستو دھرتی پر ہی نہیں، آکاش پر بھی ہوتے ہیں اور مہاتما بدھ کے ساتھ ان کی بھی پوجا ہوتی ہے۔

(9) مین ہٹن (Manhattan) مین ہٹن دراصل ایک جزیرہ ہے جس کے تین اطراف دریا اور ایک طرف سمندر ہے۔ یہ نیویارک شہر کا قلب ہے اور اٹھائیس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ نیویارک شہر کے تقریباً تمام بڑے بڑے کاروباری اور ثقافتی ادارے، جن میں تھیٹروں کی کثیر تعداد شامل ہے، یہیں واقع ہے۔

(10) سانتا کلاز (Santa Claus) کرسمس کا فرض روایتی بوڑھا، جس کی داڑھی اور سر کے بال لمبے اور سفید ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کرسمس کی رات جب بچے سو رہے ہوتے ہیں، یہ چپکے سے آتا ہے اور ان کے سرہانے ان کے کرسمس کے کھلونے اور دوسرے تحائف چھوڑ جاتا ہے۔ انگریز اسے ''فادر کرسمس'' بھی کہتے ہیں۔

(11) پوزیشن: انگریزی میں یہ لفظ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی شخص یا چیز دوسرے شخص یا چیز کے حوالے سے موجود ہو۔

توشیما یوکو

خاموش تاجر

توشیما یوکو کا اصلی نام توشیما ساتوکو ہے۔کم ازکم اس کے والدین نے اس کا یہی نام رکھا تھا۔ وہ 1947ء میں ٹوکیو میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ٹوکیو ہی میں تعلیم پائی۔1969ء میں انگریزی ادب میں ڈگری حاصل کی،1970ء میں شادی کی،ایک بچی کوجنم دیا اور پھر1976ء میں ان کے اپنے الفاظ کے مطابق ''عام سی طلاق'' کی سزاوار ٹھہرائی گئیں۔

توشیما یوکومشہور جاپانی ادیب دازائی اوساموکی، جن کا اصل نام توشیما شوجی تھا اور جن کی کہانی ''طلسمی چراغ'' اس کتاب میں شامل ہے، بیٹی ہیں۔ تاہم اپنے باپ کی کوئی یاد ان کے ذہن میں محفوظ نہیں کیونکہ ابھی وہ صرف ایک سال کی تھیں کہ 1948ء میں انہوں نے خودکشی کر لی تھی۔ باپ تو فوت ہو گیا لیکن اپنی عظیم ادبی میراث چھوڑ گیا اور یوکو اسی کے زیر سایہ جوان ہوئیں۔بچپن میں اپنے بڑے بھائی کے، جو ذہنی طور پر معذور تھا (اور1960ء میں انتقال کر گیا) بہت قریب تھیں۔ اس قربت نے بھی ان کی ذات اورتحریروں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔

وہ ابھی طالب علم ہی تھیں کہ ان کی کہانیاں مستند ادبی رسائل میں شائع ہونے لگیں اور تیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنا سکہ منوانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اب وہ ہمہ وقتی مصنف ہیں اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں اپنی تحریروں کی آمدنی سے اپنے کنبے کی کفالت کرتی ہیں جس میں واحد ماں یا باپ کواچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔

یہی وہ عناصر ہیں جن سے توشیما یوکو اپنی کہانیوں اور ناولوں کا مواد حاصل کرتی

ہیں۔وہ معمولی معمولی گھریلو تفصیلات............ مثلاً قمقموں میں پھنسے ہوئے کیڑے مکوڑے یا باورچی خانے کے سنک میں بہائے جانے والے حشرے کا ژرف نگاہی اور نئے انداز سے مشاہدہ کرتی ہیں اور جب وہ خونی رشتوں، جنسیت (Sexuality) زنا شوئی جس کا انجام بچے کی پیدائش بنتا ہے، مردوں اور زندوں کے مابین تعلقات جیسے موضوعات کو پروان چڑھاتی ہیں تو انہی معمولی گھریلوتفصیلات کو نئے معنی پہنا دیتی ہیں اور انہیں زبردست اہمیت کی حامل بنا دیتی ہیں۔

سطحی طور پر ان کی کہانیوں کا تانا بانا ڈھیلا ڈھالا نظر آتا ہے لیکن وہ بڑی پرکاری سے انہیں ایسے انداز سے پیش کرتی ہیں کہ ان کا اثر بہت جاندار اور دیرپا ہو جاتا ہے۔

''پہاڑی لوگ'' جن کی خاموش تجارت نے اس انتخاب میں شامل کہانی کا عنوان فراہم کیاہے، کسی قدیم قوم کے خانہ بدوش افراد تھے جنہیں زمینوں کے نئے آباد کاروں نے اپنے گھروں سے نکال دیا تھا اور دیہات میں جن کے وجود کوتسلیم کرنے کی ممانعت تھی۔ اس مشابہت نے کہانی کو نئی وسعت بخش دی ہے۔''بھوت کہانیاں'' (1984ء) میں شامل افسانوں میں بھی روایت اورلوک کہانیوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

ان کے مشہور ترین اور پیچیدہ ترین ناولوں میں ''دخترِ تقدیر'' (1988ء) اور ''دریائے آتش کے کناروں پر'' (1983ء) شامل ہیں۔ ان کی کہانی ''خاموش تجارت'' کو1983ء میں کاوا باتا یا سوناری انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

روایتی طور پر جاپان میں خواتین مصنفین کوعلیحدہ ''زمرے'' میں رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ توشیمایوکو کی جب تعریف کی جاتی ہے تو انہیں ''نمائندہ خاتون مصنف'' کہا جاتا ہے۔ اگر حقیقت کی نظروں سے دیکھا جائے تو ان کی تحسین کا یہ دائرہ بہت محدود نظر آئے گا۔ تاہم پچھلے چند برسوں سے جاپانی نقادوں کے رویے میں تبدیلی آئی ہے اور وہ اب انہیں مابعد جنگ یا نئی نسل کی ''نمائندہ ادیب'' ماننے لگتے ہیں۔ ایسے ادبی ماحول میں، جہاں خواتین کو Joryu Sakka یا Outsider سمجھا جاتا ہے، یہ واقعی بہت بڑی تحسین ہے۔

جنگل میں بلی تھی۔ درحقیقت یہ کوئی اتنی عجیب نہیں تھی۔ آخر جنگلی بلیوں، تیندووں اور شیروں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے۔ بلکہ دھاری دار گھریلو بلیاں بھی اس

زمرے سے خارج نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن اس کا وہاں نظر آنا پریشان کن بات تھی۔ یہ مخلوق وہاں کیا کر رہی تھی؟ جب میں ''جنگل'' کہتی ہوں تو میری مراد رائی کوگیاں لینڈ سکیپ گارڈن (1) سے ہوتی ہے جو ایدو (2) عہد میں معرض وجود میں آیا تھا۔ شاید ''جنگل'' صحیح لفظ نہیں لیکن رائی کوگیاں پارک کے درخت شہر کی جدید عمارتوں کے بیچ عہد رفتہ کی بچی کھچی نشانیاں اتنے بڑھ اور پھیل چکے ہیں کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ جو روشیں بنی ہوئی ہیں، وہ دن کے وقت بھی تاریک اور ڈراؤنی معلوم ہوتی ہیں۔ اسے دیکھ کر ذہن میں جنگل کا تصور ہی ابھرتا ہے، اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ موزوں نہیں ہوسکتا اور جہاں تک بلی کا تعلق ہے، میں یہ کہوں گی، وہ جنگلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو بس دو تین مہینے کی بلونگڑی تھی۔ اس کے سفید جسم پر سیاہ چتیاں تھیں۔ خونخوار تو وہ بالکل نہیں تھی.......... دراصل وہ ننھی منی پیاری چیز تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں سناٹے میں آ گئی اور جب بلونگڑی کے جسم پر بال کھڑے ہو گئے اور وہ قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی تو میرے بدن میں کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بلونگڑی تالاب کے قریب جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس پر سب سے پہلے میری دس سالہ بیٹی کی نظر پڑی تھی اور جب تک میں اس کی شکل دیکھ پاتی اور میرے منہ سے نکلتا، ''تم ٹھیک کہتی ہو!'' وہ آگے بڑھ چکی تھی اور گلا پھاڑ پھاڑ کر بتا رہی تھی ''یہاں ایک اور ہے! ایک ادھر ہے!'' میرا پانچ سالہ بیٹا ابھی تک پہلی بلی کا سراغ ڈھونڈ رہا تھا جب اس کی بہن مزید بلیوں کا انکشاف کرنے لگی۔ وہ زور زور سے اپنے پاؤں زمین پر پٹخنے اور چلا چلا کر کہنے لگا ''کہاں؟ کہاں ہیں یہ؟'' اس کی بہن نے اسے نیچے جھکنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ فاتحانہ انداز سے اسے بتانے لگی کہ وہ پہلی کہاں دیکھ سکتا ہے۔ میری بیٹی کا شوروغل سن کر متعدد راہ گیر بھی تلاش میں جت گئے۔ یہ اتوار کی شام تھی اور بے شمار لوگ سیر وتفریح کے لیے پارک میں آئے ہوئے تھے۔ بلیاں ہر جگہ موجود تھیں اور وہ اپنے جھاڑیوں کے جھنڈوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں، تاہم ان کی نگاہیں بجری کی روشوں پر چلتے لوگوں کے پاؤں پر جمی ہوئی تھیں اور جونہی کوئی شخص ان کے خفیہ ٹھکانوں کی طرف ایک قدم بھی بڑھاتا، بلی سہم جاتی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کہیں اور بھاگ جاتی۔ بالغ اشخاص کا قد چونکہ اونچا ہوتا ہے، ان کے لیے ان بلیوں کو آسانی سے دیکھنا ممکن نہیں تھا، چہ جائیکہ وہ انہیں گن سکتے اور

یوں ان کے ذہنوں پر یہ تاثر بیٹھ جاتا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ جب میں دوسری جانب مڑی تھی، وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ جب میں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، میری بیٹی ہنس پڑی اور اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے بتایا ''دیکھیں، وہ کہاں گھسا ہوا ہے!'' وہ واقعی اس جگہ سمٹا سمٹایا بیٹھا رونکھا ہو رہا تھا جہاں پہلی بلی نظر آئی تھی۔ وہ اس کی طرف بھاگا تو بڑے جوش و جذبے سے تھا، لیکن وہ اسے پکڑتا تو کیا، صرف بھگانے میں ہی کامیاب ہو سکا اور خود جھاڑیوں میں پھنس گیا۔

''اپنے خیال میں تم کیا کر رہے ہو؟ وہ کبھی تمہارے قابو میں نہیں آئے گی۔'' میری بیٹی پنجوں کے بل بیٹھ کر جھاڑیوں میں سے اسے آوازیں دے رہی تھی۔ ''بے وقوف! باہر آ جاؤ!''

اس کی بہن جس پر تفنن لہجے سے اسے ڈانٹ رہی تھی، اس سے لڑکے کا کچھ بھلا نہ ہوا۔ خاصی نیچے جھکی ہوئی شاخوں کے اس پنجرے میں، جہاں مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے، روشنی کی ایک کرن بھی نہیں جا پا رہی تھی اور وہ اس میں ڈرا سہا بیٹھا تھا۔

''نصیحتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خود جاؤ اور اسے نکال لاؤ''۔ میں نے اسے کندھے سے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود ہی اندر گیا تھا، پھر خود ہی باہر کیوں نہیں آ سکتا؟'' وہ شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔ تاہم وہ اندر جانے کے لیے کوئی شگاف ڈھونڈنے لگی۔ میں جھک کر گھنی شاخوں اور پتوں کے بیچ میں سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور انتظار کر رہی تھی کہ وہ کب اس تک پہنچتی ہے۔

''وہ اندر گیا کیسے؟ وہ تو واقعی پھنس گیا ہے!'' وہ بے یقینی سے جھاڑیوں کے گرد چکر لگاتی بڑبڑا رہی تھی، تاہم کچھ ہی دیر میں وہ پتوں اور شاخوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتی اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

جب وہ دوبارہ میرے پاس پہنچے، سر سے پاؤں تک ان کے جسموں پر خشک پتے اور شاخیں چمٹی ہوئی تھیں۔

میری بیٹی خود بھی ایک آدھ بلی پر جھپٹنے کی کوشش کر چکی تھی، لیکن جب وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہی تو وہ سمجھ گئی کہ پارک کی زندگی نے ان ننھی منی بلونگڑیوں میں عام

آوارہ بلونگڑیوں کی نسبت کہیں زیادہ پھرتی اور چستی بھر دی ہے اور چونکہ انہیں یقین نہیں کہ لوگ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، وہ کسی کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتیں۔ جب وہ اپنے بھائی کو یہ باتیں سمجھا رہی تھی، اس نے تائید کے لیے میری جانب دیکھا۔ ''وہ یہیں پیدا ہوئی ہوں گی، ٹھیک؟ وہ یہیں کی ہیں، ٹھیک؟ پھر میرے خیال میں ان کی ماں بھی یہیں کہیں ہو گی۔''

بچے ایک بار پھر اردگرد کے درختوں میں غور سے دیکھنے لگے۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ یہیں کہیں ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل رہے گی، کیا خیال ہے؟ صرف بلونگڑیاں کھلی فضا میں گھومتی پھرتی ہیں۔ ان کی ماں میں زیادہ عقل ہے۔ میں شرطیہ کہوں گی کہ وہ یہیں اس درخت پر ہو گی۔ اگر اس پر نہیں، پھر بالکل قریب کہیں ایسی جگہ چھپی بیٹھی ہو گی جہاں سے وہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ شاید وہ اب بھی ہمیں آنکھیں گاڑے دیکھ رہی ہو۔''

جب میں یہ باتیں کر رہی تھی، میں نے اپنی نگاہیں درختوں کی چوٹیوں پر جمائی ہوئی تھیں............ نادیدہ ماں کے تصور سے مجھے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ آیا وہ گلیوں کی آوارہ بلیاں ہیں یا پالتو ہیں جنہیں ان کے مالکوں نے گھروں سے نکال دیا تھا۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھیں، بچے دینے لگی تھیں اور اب جنگل میں جو رات کو انسانوں سے خالی ہوتا ہے............ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور وہ یوں محسوس کرنے لگیں گی جیسے یہی ان کا گھر ہو جس میں انہیں سکون مل سکتا ہے۔

پورے پچیس سال قبل میری اماں اپنے تین بچوں کے ساتھ، جن میں سے میں دس سال کی سب سے چھوٹی تھی، رائی کوگیاں پارک کے قریب رہائش اختیار کرنے آئی تھی۔ اس نے ہمیں پارک کی تاریخ کے متعلق آگاہ کیا اور اپنی آمد کے چند ہی روز بعد ہم اسے دیکھنے اس کے اندر چلے آئے۔ تاہم باوجود اس بات کے کہ یہ ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا، ہماری اس میں دلچسپی بہت جلد ختم ہوگئی کیونکہ اس کے اردگرد جو چھ فٹ اونچی دیوار بنی ہوئی ہے، اس میں صرف ایک ہی دروازہ ہے اور وہ ہمارے گھر سے بہت دور دوسری طرف تھا۔ جاپانی باغات میں ویسے بھی بچوں کی دلچسپی کی کوئی خاص بات نہیں ہوتی،

چنانچہ خاندان کی حیثیت سے ہم دوبارہ کبھی یہاں نہیں آئے تھے۔ تاہم مجھے گھروں کی چھتوں اور درختوں کی چوٹیوں کے اوپر جو پرندے.......... نیل کنٹھ، مشرقی فاختائیں اور پھدکیاں.......... نظر آتے رہتے تھے، وہ مجھے یاد دلاتے رہتے تھے کہ ہم کسی پارک کے قریب رہتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں مجھے جھینگروں کی چہکار سنائی دیتی رہتی تھی۔ میری جیسی شہری لڑکی کے لیے جھینگر اور نیل کنٹھ بھی انوکھی چیزیں تھیں۔

جب ہم پرائمری سکول سے فارغ ہونا چاہتی تھیں تو میں متعدد بار اپنی ہم جماعتوں کے ساتھ رائی کوگیاں پارک آئی تھی۔ ایسے ہی ایک چکر کے دوران میں ہم میں سے کسی کو ٹائم کیپسول (3) کا خیال سوجھا۔ ہم نے اسے دس.......... یا شاید بیس.......... سال کے لیے دفنانا تھا۔ مجھے اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ ہم نے جس کاغذ کے پرزے کو ننھی منی شیشی میں ٹھونسا اور باغ میں چیڑ کے پیڑ کے نیچے دبایا تھا، اس پر لکھا کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اب بھی یہیں کہیں ہوگا کیونکہ میں نے اس کے متعلق کبھی کسی سے کچھ نہیں سنا اور اب میں جب کبھی رائی کوگیاں پارک آتی ہوں، میں ہمیشہ اس درخت کو تلاش کرتی رہتی ہوں لیکن میں صرف ٹیوے ہی لگا سکتی ہوں، یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ کہاں تھا۔ ہمیں پختہ اعتماد تھا کہ جب کئی سال گزرنے کے بعد یہاں آئیں گی، ہمیں پوری طرح یاد ہوگا کہ یہ کہاں تھا۔ اگر مجھے اتنا واضح طور پر یاد ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب مجھ سے یہ درخت پہچانا کیوں نہیں جاتا۔ تاہم میرا یہاں چھوٹی موٹی کھدائی کرنے کا اور وہ بھی بچوں کی موجودگی میں .... کوئی رااادہ نہیں۔ جن سہیلیوں نے یہ جذباتی یادداشت یہاں چھوڑی تھی، وہ بہت جلد ایک دوسری سے بچھڑ گئی تھیں کیونکہ انہوں نے اگلی جماعتوں کے لیے مختلف سکولوں میں داخلہ لیا تھا۔ چنانچہ تب سے ہم نے ایک دوسرے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں اور اب تو میں یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ کبھی شیشی دبانے کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔

اگلے سال فروری میں میرا بھائی (جو میرا تقریباً ہم عمر تھا) اچانک نمونیے سے انتقال کر گیا۔ پھر اپریل میں میری بہن کالج میں داخل ہوگئی۔ میں اس سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی، چنانچہ میں خود بھی نئی دلچسپیاں اپنانے لگی: میں جاز موسیقی سنتی، فلمیں دیکھنے سینما جاتی اور کالجوں اور ہائی سکولوں کے مخالف جنس کے طالب علموں کے ساتھ دوستیاں استوار

کرتی۔ ایک لڑکی نے میرا تعارف سکول کی سینئر جماعتوں کے ایک لڑکے سے کرا دیا۔ ہم نے چار کی ٹولی بنائی اور گھومنے پھرنے پارک چلے آئے۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور واحد موقع تھا جب میں خوب بن ٹھن کر رائی کوگیاں پارک آئی تھی۔ میں نہ تو ملکہ حسن تھی اور نہ ہر دل عزیز قسم کی لڑکی اور جب دوسرے ایک دوسرے کے ساتھ کلیلیں کر رہے اور خوب لطف اندوز ہو رہے تھے، میں ان کے ساتھ گھلنے ملنے سے گریز کرتی رہی اور الگ تھلگ پھرتی رہی، اور یوں میں بہت جلد بور ہوگئی۔ میں صدق دل سے چاہتی تھی کہ جس طرح لینڈ سکیپ گارڈن پہلی مرتبہ دکھ کر میرے ساتھی متاثر ہوئے ہیں، میں بھی ہوں، لیکن ہر روز اینٹوں کی دیوار کے اوپر سے درخت دیکھنے کے بعد میری ان میں دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت تک ہمیں اس محلے میں رہتے تین سال ہو چکے تھے اور ''رائی کوگیاں'' کے نام سے صاف ستھرے اور دھوپ میں نہائے ہوئے لانوں کا تصور ذہن میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صرف دیوار کے ساتھ تاریک اور الجھے ہوئے راستے دھیان میں آتے تھے۔

جنسِ مخالف کے افراد کے ساتھ میری دوستیاں کرنے کی خواہش بہت جلد دم توڑ گئی۔ جو میں چاہتی تھی وہ لڑکے فراہم نہیں کر سکتے تھے اور جو لڑکے چاہتے تھے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ابھی میں ہائی سکول کی طالبہ تھی کہ ہمارا جرمن کتا مر گیا۔ ہمارا گھر کچھ عرصہ کتے سے خالی رہا اور جب میری بہن نے گریجویشن کے بعد شادی کر لی اور ہم گھر میں اکیلی رہ گئی تو میری ماں کو خیال آیا کہ ہمیں نیا کتا خریدنا چاہیے۔ اس نے ایک شخص ڈھونڈ لیا اور وہ اسے شکاری نسل کے کتے کا، جسے ٹیریئر (Terrier) کہتے ہیں، پلا دینے پر آمادہ ہوگیا۔ وہ برش اور کنگھی خرید لائی اور اسے بڑے نازونعم سے پالنے لگی۔ وہ کہتی تھی کہ اس کا تعلق شکاری کتوں کی بڑی ہوشیار نسل سے ہے۔ تاہم اس کے ساتھ جس ذہانت کی توقعات وابستہ کی گئی تھیں، وہ اس کا اظہار کرنے میں ناکام رہا اور چھ مہینے گزرنے کے بعد نرا پلے کا پلا ہی رہا۔ اس کے علاوہ وہ قدرے ڈرپوک بھی تھا۔ البتہ اس میں توانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کیونکہ وہ سارا دن اپنی تیکھی آواز میں بھونکتا اور گھر میں ادھر ادھر اودھم مچاتا رہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ کام کا تھا نہ کاج کا، لیکن وہ وجہ تفریح ضرور تھا۔ گھر میں مجھے جو شدید قسم کی بوریت محسوس ہوتی رہتی تھی، اس کی موجودگی اسے دور کرنے میں بہت ممد ثابت

ہوتی تھی۔ میرے بھائی کے انتقال کے بعد میری اماں (جو ابھی میں بچی ہی تھی کہ بیوہ ہو گئی تھی) اپنے دن یوں گزارنے لگی تھی جیسے وہ ہمہ وقت سوگ میں ہو۔ ہماری ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات صرف کھانے کے اوقات میں ہوتی تھی اور اس دوران میں بھی ہماری آپس میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران میں مجھ پر جو بدترین الزام لگایا جا سکتا تھا، وہ یہ تھا کہ میں فلموں کی بہت شوقین ہوں۔ اماں کو اس قسم کی فضولیات سے چڑ تھی اور وہ وقتاً فوقتاً مجھ پر اپنے دل کا غبار نکالتی رہتی تھی۔ ''مجھے اٹھارہ سال کی ہو لینے دیں، پھر میں گھر چھوڑ جاؤں گی۔'' میں بھنا کر جواب دیتی۔ یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی، میں اس پر عمل کر کے دکھانا چاہتی تھی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے جب ہمیں یہ انتائی ملنسار کتا مل گیا۔ میرا خیال ہے یہ ابھی پلا ہے تھا جب میں نے اسے لاڈ پیار سے بگاڑ دیا کیونکہ اب وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ اسے اندر آنے دیا جائے اور جب میں اس کے لیے شیشے کا دروازہ کھولتی، وہ ربر کی گیند کی طرح پھدکتا سیدھا میری بانہوں میں آ گرتا اور وجد کی کیفیت میں دھڑا دھڑ میرے ہاتھ اور چہرہ چومنے لگتا۔

تاہم اماں مطمئن نہیں تھی۔ وہ اس کے بھونکنے سے عاجز آ چکی تھی اور اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ پھر ایک روز کتا غائب ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ صحن سے کہیں باہر نکل گیا ہو گا۔ دو تین دن گزر گئے لیکن وہ واپس نہ آیا۔ اس میں اتنی سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ اگر وہ ایک مرتبہ بھٹک جاتا تو گھر کا راستہ تلاش کر سکتا۔ میں سوچنے لگی مجھے کانجی ہاؤس والوں سے پتا کرنا چاہیے۔ میری تشویش اس حد تک بڑھ گئی کہ مجھے معمول کی خاموشی کو توڑنا اور اماں سے پوچھنا پڑا کہ ''کتا کہاں چلا گیا ہے؟'' ''کتا؟ تم کتے کا پوچھ رہی ہو؟'' اس نے جواب دیا۔ ''ارے! اسے تو میں نے پرسوں رائی کوگیاں کی دیوار کے پار پھینک دیا تھا۔''

اس کا جواب سن کر مجھے شدید صدمہ پہنچا.......... میں نے یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ کتے سے اس طرح بھی چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ تاہم مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ احتجاج کر سکتی۔ میں پارک کا کونا کونا تلاش کرنے کے لیے نہیں بھاگی۔ وہ چاہتی تو اسے مروا بھی سکتی تھی، اس کی بجائے وہ اسے اینٹوں کی دیوار کے قریب لے گئی، بازوؤں سے اٹھایا اور

دوسری طرف پھینک دیا۔ کیا سنگ دلی تھی! کتا کیم شیم تو تھا نہیں، اس کا قد صرف ایک فٹ تھا اور یوں وہ آسانی سے میری اماں کے ہاتھوں میں بھی آ سکتا تھا۔

جب کتے نے دیکھا ہو گا کہ اسے دیوار کے اوپر سے دوسری جانب پھینک دیا گیا ہے، وہ چپ چاپ رینگتا کہیں چھپ کر نہیں بیٹھ گیا ہو گا۔ وہ لازماً غضبناک انداز سے بھونکتا ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا ہو گا۔ پھر جونہی کسی چوکیدار کی نظر اس پر پڑی ہو گی، اس نے اسے دبوچ لیا ہو گا۔ کیا اس کا اگلا پڑاؤ کانجی ہاؤس بنا ہو گا؟ لیکن میرے ذہن میں سوچ آئی شاید حالات نے یہ رخ نہ اختیار کیا ہو۔ دن کی روشنی میں جنگل کیسا ہوتا ہے، میں اس کا کم و بیش تصور باندھ سکتی تھی: وہاں بے شمار پرندے اور حشرات الارض تو لازماً ہوں گے، ان کے علاوہ اور کوئی خاص چیز نہیں ہو گی۔ تالاب میں مچھلیاں، کچھوے اور ان کے بھائی بند تیرتے پھرتے ہوں گے۔ لیکن رات کو وہاں کون سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں؟ چونکہ ان تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے مجھ سے وہاں مقررہ اوقات کے بعد ٹھہرنے کا حوصلہ نہیں تھا، میں سوچنے لگی کیا کوئی ایسا شخص جو مجھے بتا سکے کہ صبح کو دروازہ کھلنے سے پیشتر اس پر رات کے دوران میں کیا بیتا تھا؟ وہاں لازماً ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے ہوں گے جن کا دن میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی ننھا منا ٹیریئر پلا اس دنیا میں داخل ہونے کے بعد پلا نہ رہا ہو بلکہ کچھ اور بن گیا ہو؟

مجھے شکر گزار ہونا پڑا کہ کتے پر جو کچھ بیتا ہو گا، اسے محض تخیل پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے پہلے سے بھی زیادہ پختہ ارادہ کر لیا کہ میں رائی کوگیاں پارک کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گی۔ مجھے اس گھنے جنگل سے خوف آتا تھا جس کی ماں شہر کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں بنتی تھی۔ یہ اس کتے کی مملکت تھا جسے میری اماں نے وہاں پھینک دیا تھا۔

جب مناسب وقت آیا میں نے گھر چھوڑ دیا، تاہم یہ واقعہ اس وقت سے ذرا بعد میں پیش آیا جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد میں ننھی منی بیٹی اور شیر خوار بیٹے کے ساتھ واپس اس محلے میں، جہاں میری اماں رہتی تھی، پارک کے بالکل قریب بس گئی۔ اپنی اماں کی طرح میں بھی اپنے بچوں کو باپ کے ساتھ رہنے کا تجربہ نہ دے سکی۔ یہ واحد چیز تھی جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہا۔

میرا اپارٹمنٹ بہت چھوٹا اور تنگ تھا۔ چنانچہ اب مجھے رائی کوگیاں پارک کی اس کے سبزے اور کھلی جگہوں کے سبب قدر محسوس ہونے لگی۔ میں گاہے بگاہے بچوں کو وہاں لے جانے لگی۔ بعض اوقات ہم اپنے پالتو کچھوے اور سنہری مچھلیاں وہاں چھوڑ آتے۔ ہمارے بہت سے دیگر پڑوسی بھی جگہ کی قلت کے سبب اپنے پالتو آبی جانور وہاں تالاب میں چھوڑ آتے تا کہ وہاں وہ آرام سے رہ سکیں۔

پانی میں یہاں وہاں چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان پر کچھوے بیٹھے دھوپ سینکتے رہتے تھے۔ ان کی جو یہ اتنی زیادہ تعداد دیکھنے میں آتی تھی، وہ سب کے سب وہیں پیدا نہیں ہوئے ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے کچھوے جو ادھر ادھر تیرتے نظر آتے تھے ان میں سے بیشتر لازماً وہی ہوں گے جنہیں میلوں ٹھیلوں کے سٹالوں اور پالتو آبی جانوروں کی دکانوں سے خریدا گیا ہو گا۔ وہ صرف پانی میں ہی نہیں موجود ہوتے تھے بلکہ بعض منچلے تو کنارے کے ساتھ ساتھ ٹہلتے اور لوگوں کے پاؤں سے ٹکراتے رہتے تھے۔ بے شک بعض دوسرے آبی جانوروں.......... مثلاً گولڈفش، کیٹ فش یا اس قسم کی دوسری مچھلیاں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جنگل کے ارد گرد کثیر المنازل عمارتیں یکے بعد دیگرے تیزی سے تعمیر ہوتی رہتی تھیں اور ہر سال ان کے تنگ کمروں سے زندہ مخلوق نیچے لائی جا رہی تھی۔ تاہم بلی واحد مخلوق تھی جس پر میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ اگر کچھوؤں کو نیچے چھوڑنے کا رواج عام ہو چلا تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ بلیوں کو بیکار اشیا سمجھ کر یہاں نہ پھینکا جاتا۔ بلیاں ہی کیا، کسی قسم کے بھی پالتو جانور کو اس زمرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انہیں بڑھانے کے لیے چوکیداروں کی نگاہوں سے بچنا اور دوسرے سخت جان جانوروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہو گا۔ چنانچہ ان میں سے جو بچ جاتے ہوں گے، ان کی تعداد ایک خاص حد سے نہیں بڑھتی ہو گی.......... میری مراد بلیوں اور رینگنے والے جانوروں سے ہے۔

جب ایک مرتبہ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہاں بلیوں نے بھی بسیرا کر رکھا ہے، مجھے وہ کتا یاد آ گیا جو میری اماں نے پھینکا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ مجھے اس جنگل سے کتنا خوف آیا کرتا تھا۔ میں یہ سوچے بنا بھی نہ رہ سکی کہ بلیاں یہاں اپنا گزارا کیسے کرتی ہوں گی۔

شاید ان کا انحصار اس خوراک پر ہوتا ہو گا جو یہاں سیر و تفریح کی غرض سے آنے

والے چھوڑ جاتے ہوں گے۔ لیکن الم غلم اشیا پھینکنے کے لیے یہاں جو ڈبے رکھے ہوئے تھے، ان کے اوپر جالیاں لگی ہوئی تھیں تا کہ کوے ان میں منہ نہ مار سکیں جن کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنی پھرتی اور چستی کے باوجود بلیوں کو بھورے اور بچے کھچے ٹکڑے چننے میں دشواری پیش آتی ہو گی۔ چھپکلیاں اور چوہے بھی کھائے جا سکتے تھے لیکن دیوار کی دوسری جانب شہر اور اس کا کوڑا کرکٹ تھا۔ ممکن ہے اندھیرے کے بعد بلیاں خوراک کی تلاش میں گلیوں میں نکل جاتی ہوں۔

پھر مین روڈ کے سامنے فلیٹوں والی فلک بوس عمارتوں کی قطار تھی۔ ان سب فلیٹوں کی بالکنیوں کا رخ پارک کی جانب تھا۔ بلی پلک جھپکنے میں ان پر چڑھ جاتی ہو گی اور اگر اس کی مرغوب غذا باہر رکھ دی جاتی ہو، تو وہ باقاعدگی سے وہاں آنے جانے لگی ہو گی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایسے لوگ لازماً ہوں گے جو کھانے کی اشیا باہر رکھ دیتے ہوں گے اور کوئی نہیں تو بزرگ کرائے دار اور ادھیڑ عمر خواتین کو اکیلی رہتی ہیں، بلکہ بچے بھی لازماً یہ کام کرتے ہوں گے۔ بچوں سے میری مراد وہ بچے ہیں جو بلیوں سے مسحور ہو جاتے اور ان سے پیار کرتے ہیں۔

مجھے اس قسم کے تعلق میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی .... اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں پری کہانیوں سے اکثر ملتی ہیں............ لیکن اسے قابل قدر بنانے کے لیے اپارٹمنٹوں کے بچوں کو بلی بلے سے لازماً کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے ورنہ وہ یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں گے۔ ہم پہاڑی آدمیوں اور دیہاتیوں کی ایسی کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں جن میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ پہاڑی لوگ پورے سال کے دوران میں لیموؤں کے جو چھلکے اتارتے تھے، انکا وہ دیہاتیوں سے ڈیڑھ گیلن چاول کے عوض تبادلہ کر لیتے تھے۔ کوئی دیہاتی کھلے عام کسی اکیلے دکیلے پہاڑی شخص سے سودا نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک دوسرے سے اتنے خائف ہوتے تھے کہ وہ آمنے سامنے آنے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم جب سودا طے پا جاتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کام میں جو مہارت برتی گئی ہے، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سب کچھ پلک جھپکنے میں پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تھا اور انہیں اتنا بھی موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی دیکھ سکیں یا ایک دوسرے کی آواز سن سکیں۔ میرا خیال ہے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ سودے اسی طرح ہوا کریں۔ ویسے

حملے یا اپنی برادری کی طرف سے پکڑے جانے کا اندیشہ ہمیشہ موجود رہے گا۔

فرض کریں یہ میرے اپنے بچے ہوں۔ انہیں معاوضے میں کیا ملتا ہوگا؟ سال بھر جمع کیا ہوئے لیموؤں کا چھلکا ان کے کس کام آئے گا؟ ہاں کھلونے یا کوئی مٹھائی مل جائے تو دوسری بات ہوگی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں ہر قسم کی چیزوں میں ہوگی اور اگر اس کی مرغوب غذا باہر رکھ دی جاتی ہو، تو وہ باقاعدگی سے وہاں آنے جانے لگی ہوگی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایسے لوگ لازماً ہوں گے جو کھانے کی اشیا باہر رکھ دیتے ہوں گے اور کوئی نہیں تو بزرگ کرائے دار اور ادھیڑ عمر خواتین جو اکیلی رہتی ہیں، بلکہ بچے بھی لازماً یہ کام کرتے ہوں گے۔ بچوں سے میری مراد وہ بچے ہیں بلیوں سے مسحور ہو جاتے اور ان سے پیار کرتے ہیں۔

مجھے اس قسم کے تعلق میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آتی ...... اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس قسم کی چیزیں پری کہانیوں میں اکثر ملتی ہیں لیکن اسے قابل قدر بنانے کے لیے اپارٹمنٹوں کے بچوں کو بلی سے لازماً کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے ورنہ وہ یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ہم پہاڑی آدمیوں اور دیہاتیوں کی ایسی کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں جن میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ پہاڑی لوگ پورے سال کے دوران میں لیموں کے جو چھلکے اتارتے تھے، ان کا وہ دیہاتیوں سے ڈیڑھ گیلن چاول کے عوض تبادلہ کر لیتے تھے۔ کوئی دیہاتی کھلے عام کسی اکیلے دکیلے پہاڑی شخص سے سودا نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک دوسرے سے اتنے خائف ہوتے تھے کہ وہ آمنے سامنے سے گریز کرتے تھے۔ تاہم جب سودا طے پا جاتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کام میں جو مہارت برتی گئی ہے، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سب کچھ پلک جھپکنے میں پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تھا اور انہیں اتنا بھی موقع نہیں ملتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی دیکھ سکیں یا ایک دوسرے کی آواز سن سکیں۔ میرا خیال ہے ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ سودا یا سی طرح ہوا کریں۔ ویسے حملے یا اپنی برادری کی طرف سے پکڑے جانے کا اندیشہ ہمیشہ موجود رہے گا۔

فرض کریں یہ میرے اپنے بچے ہوں۔ انہیں معاوضے میں کیا ملتا ہوگا؟ سال پھر جمع کیا ہوا لیموؤں کا چھلکا ان کے کس کام آئے گا؟ ہاں کھلونے یا کوئی مٹھائی مل جائے تو دوسری بات ہوگی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں ہر قسم کی چیزوں میں دلچسپی ہوتی

ہے۔ لیکن انہیں لیموؤں کے چھلکوں جیسی اشیا سے، جو معاش کا ذریعہ بنتی ہیں، بالکل کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ پھر انہیں کس چیز کی تمنا ہوتی ہو گی؟ کوئی ایسی چیز جو انہیں آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی: کوئی ایسی چیز جو بلے کے پاس وافر مقدار میں ہے اور وہ آسانی سے اسے دوسروں کو دے سکتا ہے۔

بچے بالکنی میں کھانے پینے کی اشیاء رکھ دیتے ہیں اور اس کے معاوضے میں بلا بلاپ کی کمی پوری کر دیتا ہے۔ کیسا رہا یہ سودا؟ بلے سال کے دوران میں ایک مرتبہ اولاد پیدا کرتے ہیں یعنی وہ باپ بن جاتے ہیں۔ وہ اتنی کثرت سے بار بار باپ بنتے رہتے ہیں کہ آدمی کو غصہ آنے لگتا ہے لیکن ان باپوں کو اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے کتنے بچے ہیں............ بلکہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ باپ ہیں۔ لیکن اولاد کی موجودگی انہیں یہ کچھ بنا دیتی ہے............ ایسے باپ جنہیں اپنے بچوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں یہ شعور موجود ہے کہ آدمی صرف تبھی باپ بنتا ہے جب وہ مان لیتا ہے کہ بچہ اس کا ہے۔ لیکن یہ بہت محدود نقطہ نظر ہے۔ ہم نر کو یہ اجازت دیتے ہی کیوں ہیں کہ وہ من مانے طریقے سے بچوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دے: ایک وہ جنہیں وہ تسلیم کرتا ہے اور دوسرے وہ جنہیں وہ تسلیم نہیں کرتا؟ کیا اتنا کافی نہیں کہ ضرورت پڑنے پر بچہ مناسب نروں میں سے جسے چاہے، اپنے باپ کے طور پر منتخب کر لے؟ اگر بچے یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ جو بلا دیواریں چڑھ کر ان کی بالکنی میں آتا ہے، ان کا باپ ہے، تو اس سے اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ایسا باپ ہر رات بالکنی میں سے اپنے بچوں میں سے دو کو دیکھ لیتا ہے۔ اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے دونوں انسانی بچے فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھانے پینے کی اشیاء باہر رکھ دیتے ہیں۔ رات گئے جب وہ سو چکے ہوتے ہیں، وہ آتا ہے۔ وہ نہ تو کبھی اسے دیکھ پاتے ہیں اور نہ اس کی آواز سن پاتے ہیں۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ صبح کو انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آیا تھا۔ اپنے خوابوں میں بچے اپنے گربہ باپ کے سینے سے چمٹے ہوتے ہیں۔

بچوں کے انسانی باپ سے ہماری کوئی چھ ماہ قبل ملاقات ہوئی تھی اور ہم سب

اکٹھے ٹرانسپورٹ میوزیم گئے تھے جسے بچوں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا یہ واقعہ میرے بار بار التجا کرنے کے بعد پیش آیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اگر وہ شخص، جو میرے بچوں کا باپ تھا، اس دھرتی پر زندہ اور صحیح سلامت ہے تو پھر بچوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے۔ میرے لیے یہ شخص ناقابل فراموش تھا۔ ایک وقت تھا جب میں پوری طرح اس میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ میرے حواس پر اس قدر سوار تھا کہ میرا ہر دم یہی جی چاہتا تھا کہ جہاں وہ ہو میں بھی وہیں ہوں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ کوشش کی کہ ہمارے ہاں کوئی بچہ ہو تو کچھ بھی تبدیل نہ ہوا۔ لیکن جب دوسرا بچہ پیدا ہوا، تو سب کچھ بدل گیا اور وہ مجھے برا بھلا کہنے لگا۔ تاہم جہاں تک بچوں، بالخصوص چھوٹے کا تعلق ہے، ان کے نزدیک وہ فوٹو میں محض سایہ تھا جو کبھی ہلتا تھا نہ بولتا تھا۔ جب چھوٹا بچہ پہلے تین، پھر چار سال کا ہوا، میں خود بھی اس حقیقت کو ماننے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ وہی کیفیت تھی جس سے میں خود گزر چکی تھی کیونکہ میرا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اگر ان کا باپ بھی مر چکا ہوتا تو صبر شکر کرنا ہی پڑتا لیکن وہ زندہ تھا اور میں چاہتی تھی کہ جب تک وہ زندہ ہے، میرے بچوں کے ذہنوں میں ایک ایسے باپ کی یاد محفوظ رہے جو زندہ تھا، سانس لیتا تھا، جس کی آنکھیں حرکت کرتی تھیں، جس کا منہ حرکت کرتا اور باتیں کرتا تھا۔

اس روز وہ وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ بعد آیا۔ کافی شاپ میں انتظار کرتے کرتے بچے تنگ پڑنے اور چڑچڑے ہونے لگے، مگر جب انہوں نے اپنے باپ کو دیکھا، ان پر شرمیلی خاموشی چھا گئی۔ ''تشریف آوری کا شکریہ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں مزید کیا کہوں۔ اس نے پوچھا ''کہاں چلنا ہے؟'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور چل پڑا۔ وہ اکیلا جا رہا تھا اور میں اور بچے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ہمارے ساتھ ہے یا نہیں۔ ہم ریل گاڑی میں سوار ہو گئے لیکن مجھے پھر بھی کوئی بات نہ سوجھ سکی جو میں اس سے کہہ سکتی۔ بچے اس سے دور ہی رہے اور لاپروائی سے کھڑکیوں کے باہر جھانکتے رہے۔ یونہی سفر کٹ گیا، ہم گاڑی سے اترے اور وہ دوبارہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

ٹرانسپورٹ میوزیم میں ایک اصلی بلٹ (Bullet) ٹرین، متعدد خالی انجن، ہوائی جہاز اور بہت بڑے بڑے نقشے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں خود سکول میں پڑھا کرتی تھی

تو میں ایک مرتبہ اپنی کلاس کے ساتھ یہاں آئی تھی اور خوب لطف اندوز ہوئی تھی۔ میرے بچے بھی نمائش کی اشیاء کے ارد گرد اتنے والہانہ انداز سے بھاگنے دوڑنے لگے کہ یوں معلوم ہونے لگا جیسے انہیں سانس لینے کی بھی فرصت نہ ہو۔ وہ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے: ''اب میں اس گاڑی پر بیٹھنا چاہتا/چاہتی ہوں'' ''اب میں اس ماڈل کو آزمانا چاہتا/چاہتی ہوں۔'' انہوں نے کوئی دو گھنٹے خوب جی بھر کر لطف ٹھایا۔ دریں اثنا وہ آدمی کہیں غائب ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا، لیکن جب ہم فارغ ہو گئے اور وہ واپس گیٹ پر پہنچ گئے، وہ پھر آ گیا۔ ''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''کہیں چل کر بیٹھنا اور بچوں کو کوئی مشروب پلانا چاہیے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور میوزیم کے آس پاس جگہ تلاش کرنے کے لیے ہمارے آگے آگے چل پڑا۔ پہلے کی طرح بچے اب بھی میرے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ وہ کسی کافی شاپ میں داخل ہو گیا جہاں کیک بھی دستیاب تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم بھی اندر چلے گئے۔ ہم تینوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کسی بھی بچے نے اس کے برابر بیٹھنے کی خواہش کا مطلق اظہار نہ کیا۔ دونوں بچوں کے لیے سنگترے کا جوس منگوایا گیا۔

میری کچھ نہ کچھ کہنے کی خواہش بے حد بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا وہ خود مجھ سے ایک دو باتیں پوچھنا نہیں چاہے گا؟ مثلاً یہی کہ بچوں کا ان دنوں کیا حال ہے؟ لیکن اگر وہ نہ پوچھے اور میں از خود ان کا ذکر لے بیٹھوں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں چاہتی ہوں کہ ان کی پرورش اور تعلیم میں وہ میرا ہاتھ بٹائے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے اس ملاقات کی درخواست کرنے کے لیے اپنے آپ کو محض اس لیے آمادہ کر سکی تھی کیونکہ میں نے اس قسم کی باتیں سوچنا بند کر دی تھیں۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہم غیر ضروری شبہات ابھارے بغیر اس قسم کا شریفانہ تبادلہ خیالات بھی نہیں کر سکتے، ''یہ بڑے ہو گئے ہیں'' یا ''مجھے خوشی ہے یہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ میں بچوں کے متعلق کوئی بات کہہ سکتی۔ میں بالکل پراگندہ خیال تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید ملاقات کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ وہ ان کا باپ ضرور تھا لیکن وہ ایسا باپ نہیں تھا جس نے ان کی نگرانی کرنا تھی۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا، اس کے اپنے صرف وہی دو تھے جو اسکی بیوی کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔ اگر اس نے میرے بچوں سے ملاقات کی ہامی بھری تھی تو یہ اس کا

احسان تھا اور میرا کام صرف یہ تھا کہ میں اس کے اس احسان کے آگے سرِتسلیم خم کر دوں۔

اگر ہم بچوں کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتے تھے، پھر کہنے کے لیے صحیح معنوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہماری اس قسم کی کوئی یادیں نہیں تھیں جن کا ہم دوبارہ تذکرہ کر سکتے اور لطف اندوز ہو سکتے۔ میں خواہش کرنے لگی کہ کاش میں وہ سب کچھ بھول پاتی جو ہم نے کیا تھا۔ جیسے وہ حقیقت نہ ہو، محض خواب ہو، کیونکہ اس کی یاد ہم دونوں کے لیے اذیت ناک تھی۔ اگر میں اس کے بال بچوں کی خیریت پوچھتی تو بھی بات نہ بنتی۔ لے دے کے صرف ایک ہی چیز رہ گئی تھی جس کے ذکر میں کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا کہ اس کا کام کیسے جا رہا ہے، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے اس شخص سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا، پھر اس بارے میں بھی بات کرنے سے پہلے مجھے دو مرتبہ سوچنا پڑے گا۔

بچے آپس میں چہلیں کر رہے تھے اور میں اور وہ شخص بے دھیانی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔

کافی ہاؤس سے نکلنے سے پہلے اس آدمی نے کیک خریدا اور بڑی بچی کو تھما دیا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی رخصت ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جانے پر بچوں نے اطمینان کی سانس لی ہے۔ پھر چونکہ انہیں کیک مل چکا تھا، وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی نہ تو اس آدمی کا ہاتھ پکڑا تھا اور نہ اس سے کوئی بات کی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے کہوں، ابھی موقع ہے، اس کے پیچھے بھاگ جاؤ اور اس کے جسم کے کسی حصے کو چھو آؤ، تاہم اگر میں ان سے یہ کہتی بھی، تو وہ یہ کام ہرگز نہ کرتے۔

مجھے معلوم نہیں کہ بچوں کو اس شخص سے دوبارہ ملنے کا موقع کب دستیاب ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی آپس میں کبھی ملاقات ہو ہی نہ سکے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اب سے دو تین سال بعد اس قسم کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ یہ شخص اور میں کبھی مکمل طور پر ایک دوسرے سے اغماض نہیں برت سکیں گے۔ وہ کسی مبہم انداز سے اب بھی میرے دل میں بسا ہوا ہے۔ تاہم اس جذبے کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ خاموشی ضروری ہے۔ جب تک ہم خاموش رہیں گے اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے سے گریز کرتے رہیں گے، سمجھوتے کے لیے باہمی گفتگو کا امکان باقی رہے گا۔

میرا خیال ہے کہ پہاڑی لوگوں اور دیہاتیوں کے مابین اشیا کے تبادلے کا جو نظام مروج تھا، اسے ''خاموش تجارت'' کہا جاتا تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ بقا کے لیے اس قسم کے خاموش سودے کرنا کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ میرے، میری اماں اور میرے بچوں جیسے لوگوں کی، جو بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں، اس امر سے کچھ تسکین ہو جانا چاہیے کہ وہ جنگل کے قریب رہتے ہیں۔ ہم مختلف چیزیں وہاں چھوڑتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو بتاتے رہتے ہیں کہ ہم نے انہیں وہاں پھینکا نہیں۔ بلکہ ہم نے تو انہیں کھلی فضا میں سانس لینے اور زندگی بسر کرنے کا موقع دیا ہے۔ پھر ہم اس انجانے جنگل کا تصور باندھنے لگتے ہیں اور خوف سے کپکپانے یا پیار کی آہیں بھرنے لگتے ہیں۔ دریں اثنا وہاں کی مخلوق، جس کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، باہر کی انسانی دنیا کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ کم از کم میں نے یہ نہیں سنا کہ اس نے کبھی کسی پر حملہ کیا ہو۔

دونوں فریقوں کے مابین ایک قسم کی خاموش تجارت ہو رہی ہے۔ شاید میرے بچوں نے واقعتاً کسی بلے کے ساتھ، جو جنگل میں رہتا ہے، لین دین شروع کر دیا ہے۔

حواشی

(1) لینڈ سکیپ گارڈن: عمارتوں میں گھرا ہوا باغ یا پارک جسے اس طرح بنایا گیا ہو کہ وہ دیکھنے میں خودرو اور پرکشش معلوم ہو۔

(2) ایدو عہد: جاپان کا صدر مقام ٹوکیو اگرچہ بے حد قدیم ہے لیکن اس کا یہ نام بہت بعد میں رکھا گیا۔ حال ہی میں بعض مقامات کی کھدائی کے دوران میں وہاں پتھر کے عہد کے آثار بھی دریافت ہوئے ہیں، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ بارہویں صدی تک یہ محض چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس وقت اس کا نام ایدو (Edo) تھا۔ متن میں جس ایدو عہد کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد وہی زمانہ ہے جب ٹوکیو ابھی ایدو کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

(3) ٹائم کیپسول (Time Capsule): بوتل یا ڈبا جس میں ایسی چیزیں بھر دی جائیں جنہیں موجودہ زمانے سے خاص نسبت ہو، تاکہ بعد میں جب کبھی کھدائی ہو تو مستقبل کے لوگوں کو اس زمانے کے حالات و کوائف سمجھنے میں آسانی رہے۔ یہ اس خدشے کے پیش نظر بھی کیا جا رہا ہے کیونکہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو پھر زمین پر موجودہ تہذیب کا نام و